امراؤ جان ادا
مرزا رسوا

ختم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم زندہ باد **عظمت صحابہ زندہ باد**

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ:

معزز ممبران: آپ کا وٹس ایپ گروپ ایڈمن "**اردو بکس**" آپ سے مخاطب ہے۔

آپ تمام ممبران سے گزارش ہے کہ:

- گروپ میں صرف PDF کتب پوسٹ کی جاتی ہیں لہذا کتب کے متعلق اپنے کمنٹس / ریویوز ضرور دیں۔ گروپ میں بغیر ایڈمن کی اجازت کے کسی بھی قسم کی (اسلامی و غیر اسلامی، اخلاقی، تحریری) پوسٹ کرنا سختی سے منع ہے۔
- گروپ میں معزز، پڑھے لکھے، سلجھے ہوئے ممبرز موجود ہیں اخلاقیات کی پابندی کریں اور گروپ رولز کو فالو کریں بصورت دیگر معزز ممبرز کی بہتری کی خاطر ریموو کر دیا جائے گا۔
- کوئی بھی ممبر کسی بھی ممبر کو انباکس میں میسیج، مس کال، کال نہیں کرے گا۔ رپورٹ پر فوری ریموو کر کے کاروائی عمل میں لائے جائے گی۔
- ہمارے کسی بھی گروپ میں سیاسی و فرقہ واریت کی بحث کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔
- اگر کسی کو بھی گروپ کے متعلق کسی قسم کی شکایت یا تجویز کی صورت میں ایڈمن سے رابطہ کیجئے۔
- سب سے اہم بات:

گروپ میں کسی بھی قادیانی، مرزائی، احمدی، گستاخِ رسول، گستاخِ امہات المؤمنین، گستاخِ صحابہ و خلفائے راشدین حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت حسنین کریمین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین، گستاخ اہلبیت یا ایسے غیر مسلم جو اسلام اور پاکستان کے خلاف پراپیگنڈا میں مصروف ہیں یا ان کے روحانی و ذہنی سپورٹرز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے لہذا ایسے اشخاص بالکل بھی گروپ جوائن کرنے کی زحمت نہ کریں۔ معلوم ہونے پر فوراً ریموو کر دیا جائے گا۔

- تمام کتب انٹرنیٹ سے تلاش / ڈاؤنلوڈ کر کے **فری آف کاسٹ** وٹس ایپ گروپ میں شیئر کی جاتی ہیں۔ جو کتاب نہیں ملتی اس کے لئے معذرت کر لی جاتی ہے۔ جس میں محنت بھی صَرف ہوتی ہے لیکن ہمیں آپ سے صرف دعاؤں کی درخواست ہے۔
- عمران سیریز کے شوقین کیلئے علیحدہ سے عمران سیریز گروپ موجود ہے۔
- **لیڈیز کے لئے الگ گروپ کی سہولت موجود ہے جس کے لئے ویریفکیشن ضروری ہے۔**
- اردو کتب / عمران سیریز یا سٹڈی گروپ میں ایڈ ہونے کے لئے ایڈمن سے وٹس ایپ پر بذریعہ میسیج رابطہ کریں اور جواب کا انتظار فرمائیں۔ برائے مہربانی اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے موبائل پر کال یا ایم ایس کرنے کی کوشش ہر گز نہ کریں۔ ورنہ گروپس سے تو ریموو کیا ہی جائے گا بلاک بھی کیا جائے گا۔

نوٹ: ہمارے کسی گروپ کی کوئی فیس نہیں ہے۔ سب فی سبیل اللہ ہے

0306-7163117	0343-7008883	0333-8033313
محمد سلمان سلیم	پاکستان زندہ باد	راؤ ایاز

پاکستان زندہ باد **پاکستان پائندہ باد**

اللہ تبارک تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو

امراؤ جان ادا

اُمراؤ جان ادا

مکتبہ شاہراہ۔ دہلی

تعداد ۱۰۰۰
جولائی ۱۹۵۸ء
قیمت .... چار روپے آٹھ آنے

(کوہ نور پریس ۔ دہلی)

اُمراؤ جان آدا اور مرزا رسوا

رسوا کی دوسری ناولوں کے بر خلاف اُمراؤ جان آدا ایک فنی چیز ہے اس میں ظاہرہ کوئی دلچسپ بات نہیں دکھائی دیتی نہ کوئی سنسنی خیز واقعہ ہے اور نہ کوئی جاسوسی تلاش ہے۔ ایک رنڈی کا سیدھا سادہ حال ہے جو اسی رنڈی نے خود بیان کیا ہے۔ وہ ایک غریب مگر شریف مسلمان کی لڑکی تھی جو فیض آباد میں بہو بیگم صاحب کے مقبرہ پر جمعدار تھے اور آدمی نہایت سچے اور سیدھے تھے۔ پڑوس میں ایک بد معاش دلاور خاں رہتا تھا۔ یہ ایک دفعہ گرفتار ہوا۔ جمعدار نے اس کے چال چلن کے بابت سچی بات کچہری میں کہہ دی تھی دلاور خاں قید ہو گیا تھا اور چھٹنے کے بعد جمعدار سے بدلا لینے پر تلا ہوا تھا۔ ایک دن اس نے جمعدار کی آٹھ برس کی لڑکی امیرن کو اپنے گھر میں بند کیا پھر رات میں گاڑی پر ڈال کر اس ارادے سے لے چلا کہ اس کو مار موڑ کر کہیں ڈال دے گا۔ گاڑی پر اس کے ساتھ اس کا دوست پیر بخش تھا جس نے صلاح دی کہ امیرن کو لکھنؤ میں کہیں بیچ ڈالا جائے۔ چنانچہ یہ لوگ لکھنؤ پہونچے اور پیر بخش کے بھائی کے گھر میں امیرن کو اتار دیا گیا وہاں ایک اور ہندو لڑکی رام دئی بھی تھی۔ جس کو بھی کہیں سے پکڑ کر لایا گیا تھا۔ امیرن کو لے جا کر ایک مشہور چکلے دار رنڈی خانم کے یہاں بیچ گیا اور رام دئی ایک بیگم صاحبہ کے یہاں بکی۔ خانم نے امیرن کا نام بدل کر اُمراؤ کر دیا تھا۔ اس کی موسیقی کی اور پڑھنے

لکھنے کی تعلیم ہوئی۔ اس کی طبیعت موسیقی سے بہت مناسب پائی گئی اور اس نے ادبی مذاق بھی پیدا کرلیا۔ دوران تعلیم میں ایک لڑکا گوہر مرزا اس کے ساتھ پڑھتا تھا۔ پہلے دونوں لڑتے جھگڑتے تھے مگر پھر محبت کرنے لگے اور ایک رات وہ گوہر مرزا۔ امراؤ کا گھیس اول ہوگیا۔ خانم کو خبر ہوئی تو انہوں نے امراؤ کو اپنی ایک ترکیب لگا کر اس کو پوری رنڈی بنا دیا اور رنڈیوں کی طرح اس کا بھی الگ عملہ ہوگیا۔ خانم کی لڑکی بسم اللہ بھی بڑھ گئی اور اس کا بھی اعلیٰ رنڈیوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ امراؤ جان کے مختلف لوگوں سے تعلقات ایک طرف اور بسم اللہ جان کے واقعات دوسری طرف بیان کئے گئے ہیں۔

خانم کے چکلے کی اور رنڈیوں کا حال بھی بتایا ہے۔ امراؤ کے آشناؤں میں سب سے زیادہ نمایاں پہلے نواب سلطان صاحب ہوئے جن کو امراؤ جان دل سے چاہتی تھی۔ پھر ایک فیضو نامی ڈاکو اسے خانم کے گھر سے بھگا لے گیا۔ فیضو اور اس کے ساتھی ڈاکو راستے میں گھیر لئے جاتے ہیں اور امراؤ بمشکل تمام کانپور پہونچی جہاں وہ اپنے لئے ایک کمرہ لے کر پیشہ کرنے لگی اور بہت جلد مشہور ہو جاتی ہے۔ کانپور میں ایک بیگم صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو وہی رام دیئی ہیں۔ جو امراؤ کے ساتھ بکنے کے لئے لائی گئی تھیں اس کے بعد خانم کے یہاں کے لوگ کانپور پہنچ گئے اور امراؤ کو منا کر لکھنؤ واپس لے آئے۔ جب غدر پڑا تو وہ لکھنؤ کے شاہی دربار سے متعلق تھی۔ اور جب انگریزوں نے اودھ کے باغیوں کو تتر بتر کر دیا تو وہ فیض آباد پہنچ گئی۔ یہاں بھی اس کا پیشہ خوب چلا اور ایک دن وہ اس گھر پر مجرے کے لئے گئی جہاں وہ پیدا ہوئی تھی۔ اس کی ماں نے اس کو پہچانا اور دونوں مل کر خوب روئیں۔ دوسرے دن اس کا بھائی اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کو آیا مگر آخر میں امراؤ کا پورا حال سن کر اسے چھوڑ دیا۔

امراؤ پھر لکھنؤ چلی آئی اور یہاں پھر چمکنے لگی۔ ایک نواب محمود علی خاں نے دعویٰ کیا کہ امراؤ میری منکوحہ ہے۔ اسی وقت ایک اکبر علی خاں امراؤ کے مددگار ہوئے

اور وہ ماں کے گھر پرتین برس رہی۔ امراؤ جان نے ایک نوچی بھی بٹھائی مگر وہ رذیل طبیعت نکل گئی۔ ایک دن درگاہ میں اس کی اسی بیگم سے ملاقات ہوئی جو رام دئی تھیں۔ انہوں نے امراؤ کو اپنے گھر بلایا اور ان کے نواب وہی سلطان صاحب نکلے جن پر امراؤ اپنے زمانہ میں فریفتہ ہوئی تھی۔ امراؤ کو ان کی حالت پر رشک ہوا اور اپنی قسمت پر افسوس۔ آخر میں ایک دن امراؤ جان بہت سی رنڈیوں کے ساتھ بخشی کے تال پر سیر کرنے گئی تھی اور سب سے الگ سڑک پر چلی جا رہی تھی کہ اس نے ایک آدمی کو گھانس کھودتے دیکھا وہ ڈر گئی یہ وہی دلاور خاں تھا جو اس کو گھر سے اٹھا لایا تھا۔ پولیس کو اطلاع دی گئی دلاور خاں پکڑا گیا اور اسے پھانسی ہو گئی۔ یہ ہے تمام زندگی بی امراؤ جان المتخلص بہ ادا کی۔ اس قصہ کی تمام دلچسپی نفسیاتی ہے اس لئے وہ ادبی چیز ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس ناول نگاری کا وہ کمال ہے کہ اس کو کوئی بھی اردو کا ناول نگار نہ پہنچ سکا

یہ ناول مرزا رسوا کا شاہکار ہی نہیں بلکہ اردو ادب کے تمام شاہکاروں میں سب سے بہتر ہے۔ اس کے قصے ہی کو جاننا کافی نہیں اسے ہر پہلو سے دیکھنا اور جانچنا ضروری ہے۔

(۳)

سب سے پہلے نظر اس کے پلاٹ پر پڑتی ہے جو نہایت درجہ سڈول اور خوبصورت ہے۔ یہ اردو کا پہلا ناول ہے جس میں پلاٹ کی تعمیر ہے اور رسوا کی جدت طبع داد کے قابل ہے کہ اس پلاٹ کو انہوں نے نہایت سلیقہ سے تعمیر کیا۔ اس ناول کا فارم پکارسک قسم کا ہے یعنی اس میں ایک مخصوص فرد امراؤ جان کو لے کر اس کی زندگی کے حالات گذرتے ہوئے زمانہ کے ساتھ ساتھ اور بدلتے ہوئے ماحول سے متعلق دکھائے گئے ہیں۔ اس میں اس قسم کی تعمیر کی امید کرنا جو ڈرامائی ناول میں ملتی ہے عبث ہے۔ پھر اس میں قصہ ہیروئن کی زبانی بیان ہوا ہے اور مرزا رسوا قصے

کو سننے والے کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہیں۔ مصنف یا اس کے نمائندہ کا اس طرح وجود اس ناول کی ہر تعمیری صفت میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ رسوا کا اپنے تئیں ناول میں اس طرح داخل کر دینا ہی ایک جدت فنکاری کا کمال ہے۔ زیادہ تر اس وجود ہی کی وجہ سے اس ناول میں ہر وہ تعمیری خوبی آگئی ہے جو اس فارم کی ناول میں ممکن ہے ان خوبیوں میں سے کچھ کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

تناسب۔ امراؤجان کے قصہ میں واقعات اس عمدہ تناسب کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں کہ پوری ناول ایک عمدہ عمارت کا تاثر پیدا کرتی ہے۔ سب میں پہلا باب ایک مختصر مشاعرہ ہے جس میں اُمراؤجان آتی ہے اور اپنے ادبی ذوق کا اثر قائم کرتی ہے اس سے متوازی آخری باب ہے جس میں اُمراؤجان نے اپنا تمام فلسفۂ حیات نچوڑ کر رکھ دیا ہے ان دونوں بابوں کے درمیان پورا قصہ ہے۔ قصہ دلاور خاں کی بدمعاشی سے شروع ہوتا ہے اور وہ امیرن کو چرا کر لے بھاگتا ہے۔ اس قصہ کا ختم دلاور خاں کی گرفتاری اور پھانسی ہے جو امراؤجان کی وجہ سے ہوتی ہے۔ ان دونوں واقعات میں نہایت لطیف تشبیہ اور تضاد دونوں موجود ہیں غور طلب امور یہ ہیں:-

۱۔ اُمراؤجان اداؔ میں فن قصہ گوئی

۲۔ اُمراؤجان اداؔ کی کردار نگاری

۳۔ اُمراؤجان اداؔ میں مرزا رسوؔا

۴۔ اُمراؤجان اداؔ کا طرزِ انشا

۵۔ اُمراؤجان اداؔ کی فنی حیثیت

خانم کے چکلے کے حالات اور آخر امراؤجان کے ایک لونچی بٹھانے کے حالات میں بھی تناسب ہے۔ ان دو طرفہ حد بندیوں کے درمیان میں اہم تبدیلیاں

ہیں جو تین محرابوں کی طرح نظر آتی ہیں۔ پہلی محراب امراؤ کے فیضو کے ساتھ بھاگنے سے شروع ہو کر اس کے کانپور میں قیام کر کے پھر لکھنؤ آنے تک کے واقعات سے بنا۔ دوسری لکھنؤ میں قیام شاہ اودھ کے دربار سے غدر تک کے واقعات اور تیسری فیض آباد میں قیام سے اس کی ماں اور بھائی سے اچانک ملاقات سے لکھنؤ آنے تک۔ یہ تناسب اسی ناول کے خاص پلاٹ میں ہے۔ ہر ناول کی طرح اس کا پلاٹ مرکب ہے اور اسی طرح دوسرے چھوٹے پلاٹ جیسے کہ بسم اللہ جان کے حالات، رام دئی کے حالات وغیرہ بھی بڑے تناسب سے ترتیب دئیے ہوئے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک ماہر انجینیر نے ایک ایسے کمال کی عمارت بنائی ہے کہ اسے دیکھا ہی کریں۔ اس قسم کا تناسب عام طور پر زندگی میں نہیں ملتا اور اگر امراؤ جان اپنا قصہ تاریخی ترتیب سے بیان کرتی تو یہ تناسب اس قصہ میں بھی نہ پیدا ہوتا۔ بات یہ ہے کہ رسوا کا ہر مقام پر وجدان اور ان کے معاملات نے ان کو قصہ پر ایک ایسا قدرتی قابو دیدیا ہے کہ وہ جو واقعہ چاہتے ہیں جہاں چاہے بٹھا دیتے ہیں۔ جس جگہ پر چاہے وہ واقعہ تاریخی حساب سے پہلے کا ہو یا بعد کا۔

ہم آہنگی۔ ناول کے ان سب متناسب حصوں کا قدرتی طور پر جوڑنا بھی رسوا کا کمال ہے۔ ہر جوڑ ایسی ہم آہنگی کے ساتھ بٹھایا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا ہے کہ یہ سب الگ الگ چیزیں ملائی گئی ہیں۔ ایک مسلسل قصہ واقعات کے تنوع کے ساتھ سامنے پھر جاتا ہے۔ رسوا نے اپنے فن کو اس کمال سے چھپایا ہے کہ عام پڑھنے والے کا تو ذکر کیا۔ اکثر نقاد بھی اس کو نہیں پا سکتے۔ پہلی نظر میں کبھی شبہ بھی نہیں ہوتا کہ مصنف نے کتنی گہری تحلیل کی ہو گی، کس طرح واقعات کو ادھر ادھر کیا ہو گا کس طرح ان کو تناسب کے ساتھ بٹھایا ہو گا۔ اس پر ان کی منطق ریاضی اور تعمیرات میں دلچسپی نے ان کی کہاں کہاں مدد کی ہو گی اور آخر میں ان کی تخیلی قوت نے

ان سب ٹکڑوں کو جوڑ کر کسی طرح ایک ایسی چیز بنا دی ہو گی کہ انسانی معمار کی بنائی ہوئی چیز صانع قدرت کی تعمیر سے ٹکر لے۔

امراؤ جان ادا کے پلاٹ کی ہم آہنگی محض اعجاز ہے اور کیوں نہ ہو ان میں ہر جگہ اس کا خالق خود موجود ہے۔ اپنی قدرت سے ہر چیز کو ہم آہنگ کرتا چلا جاتا ہے۔

اتحاد۔ پوری ناول ایک واحد اثر رکھتی ہے۔ اور یہ اثر شروع سے آخر تک نہایت خوبی سے بٹھایا گیا ہے۔ اپنا قصہ امراؤ جان نے خود بیان کیا ہے اور اس وقت جبکہ وہ دنیا کے پر تموج سمندر پر اپنا سفر ختم کرنے کے بعد آرام سے بیٹھ گئی ہے اور زندگی کو ایک پختہ کار اور تجربہ کار ذہنی انسان کی نظر سے دیکھ رہی ہے یہ نظر پورے قصہ پر غالب ہے اس نے پورے قصہ کو ایک عجیب رنگ میں رنگ دیا ہے اور تمام واقعات کو ایک بندھن میں جکڑ دیا ہے۔ الگ الگ واقعات اپنا الگ الگ تاثر پیدا کرتے ہیں مگر ہر تاثر کے ساتھ ساتھ ہر جگہ یہ تاثر بھی پنہاں ہے اس وقت امراؤ جان اس واقعہ کو ایک خاص نظر سے دیکھ رہی ہے اور یہ بھی کہ مرزا رسوا اس کے سامنے بیٹھے قصہ لکھ رہے ہیں، جہاں کہیں بھی واقعات کا زور اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس واحد اثر کا تاثر کم ہو جاوے تو مرزا رسوا کوئی نہ کوئی سوال اٹھا دیتے ہیں اور امراؤ جان کی نظر اور ان کی جھکی نظر ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ مثلاً جب امراؤ جان بسم اللہ جان سے ایک بزرگ کے عشق کا قصہ سناتی ہے کہ بسم اللہ نے ان عالم کو کس طرح پیڑ پر چڑھوا کر ہی چھوڑا تو اس پورے واقعہ کا مزاح ہم کو قصہ کے اتحاد سے بالکل ہی الگ لے جانے والا ہے کہ امراؤ اور رسوا کے درمیان یہ بحث ہوتی ہے کہ اس واقعہ پر ہنسنا چاہیے یا نہیں اور رسوا کہتے ہیں کہ انہیں بالکل ہنسی نہیں آتی۔ اسی طرح امراؤ کی کانپور میں پہونچکر

ایک ملّا سے ملاقات اور امراؤ کی ان کو بنانے کی کوشش بھی قصہ کی متانت سے الگ ایک چیز ہے اور اس لئے رسوا فوراً سوال کرتے ہیں کہ آخر امراؤ کو اس طرح مضحکہ خیزی کی کیا ضرورت تھی اور امراؤ جان جواب دیتی ہے کہ ملّا کا ڈھنگ ہی کچھ ایسا تھا کہ اس پر ہنسنے کو جی چاہتا تھا۔ غرضکہ پورے قصہ پر ایک پختہ اور تجربہ کار شخص کی متانت جاری اور ساری ہے اور یہی اس کا اتحاد واثر ہے۔

تنوع۔ اس ہم آہنگی کا اثر اور بھی گہرا ہو جاتا ہے جب ہم اس ناول میں واقعات کے تنوع پر نظر کرتے ہیں سیکڑوں واقعات ہیں ایک دوسرے سے مناسب بھی اور متضاد بھی مگر ہر ایک اپنی جگہ الگ اور اچھوتا ہے اور اپنا مخصوص اثر رکھتا ہے۔ امیرن کو بھگا دینے والا واقعہ دردناک ہے۔ خانم کے چکلے کے واقعات خوبصورت اور دلچسپ ہیں جگہ جگہ مزاحیہ واقعات ہیں۔ فیضو کے ساتھ بھاگنے والا واقعہ سنسنی خیز ہے۔ اکبر علی خاں کے گھر سے متعلق واقعات جنس ہی سے بھرے ہیں۔ آبادی کی لمبائی طنز میں ڈوبی ہوئی ہے پورے قصہ میں رنگ برنگی لہریں دوڑی ہوئی ہیں۔ پوری ناول ایک قومی قصہ کا اثر رکھتی ہے اور یہ سب رنگ اسی طرح قدرتی طور پر ہم آہنگ بھی ہیں جیسے کہ قومی قصے میں ہوتے ہیں۔

تراش۔ ہر واقعہ اور ہر باب بڑے غور و خوض سے تراشا گیا ہے۔ کوئی حصہ ایسا نہیں جو بلا ضرورت ہو یا ضرورت سے کم ہو۔ مگر یہ رسوا کی منطق میں دلچسپی نے ہر ہر باب کی نہایت منطقی ساخت پیدا کی ہے۔ پھر ان سب عمدگی سے تراشے ہوئے نگوں کی جڑائی پر نظر ڈالئے تو وہی تناسب، ہم آہنگی، اتحاد، اور تنوع نظر پڑیں گے جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ مگر ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ ان میں سے کوئی باب بھی بلا ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس ناول کا فارم پکار سک

ہے۔ اس لئے اس کے ابواب ڈرامائی ناول کی طرح ویسے ضروری نہ ہونا چاہیئے تھے کہ اگر ان میں سے کوئی اٹھا لیا جائے تو قصہ کی پوری محراب گر جائے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ کسی باب میں کوئی بات بلا ضرورت نہیں دہرائی گئی اور کوئی ایسا نہیں ہے جس کو قلم زد کرنے سے امراؤ جان کی زندگی کا کوئی اہم پہلو ختم نہ ہو جائے۔ جن واقعات کی جتنی اہمیت ہے اتنی ہی ان کو جگہ دی گئی۔ امراؤ کے دربار اودھ سے تعلق کو کچھ ہی الفاظ میں بیان کر کے ٹال دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ان تعلقات سے اس کے کردار کا کوئی خاص پہلو واضح نہ ہوتا۔ خانم جان کے چکلے والے حالات کو نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کیونکہ یہی واقعات اس کی زندگی میں اہم تھے۔ اس کی کانپور میں زندگی کو یا فیض آباد میں زندگی کو زیادہ طول نہیں دیا گیا بلکہ یہاں کے محض ایک آدھ ہی اہم واقعات بیان کر دیئے ہیں۔ ہر واقعہ کو اس کے مناسب طرز کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً امراؤ جان کا ایک نوچی بھگا لانا ایسا واقعہ تھا جس کے بابت رسوا جاننا چاہتے تھے اور امراؤ جان کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لہٰذا اس واقعہ کو سرسری طور پر مختصر اور یک طرفہ بیان کے انداز میں لکھ دیا گیا ہے۔ برخلاف اس کے اکبر علی خاں کے گھر میں بدتمیز بڑھیا کی رکیک حرکات والا معاملہ نہایت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس واقعہ کے ذریعہ امراؤ نے یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ رنڈی ہونے کی وجہ سے کس طرح کمینی سے کمینی بد معاش عورت ہے۔ جو ظاہرہ رنڈی نہ ہو اس سے زیادہ ذلیل تھی۔ اس قسم کی تمام کفایت ECONOMY کا مطالعہ کرتے چلے جائیے اور تعجب کرتے جائیے کہ رسوا جیسے لاپرواہ شخص کو ایسا اعجازی سلیقہ کہاں سے آ گیا تھا۔

توازن۔ اس ناول کی ساخت میں ایک خاص قسم کا اتار چڑھاؤ ہے جو موسیقی کے وزن کی مناسبت سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہاں ایک راگ ہے جو امراؤ کے قصہ کے ساتھ دھیمے سُروں میں شروع ہوتا ہے۔ اس راگ میں پختگی ہے اور پہلے پہلے ایک

درد ہے۔ خاتم کے چھلکے سے یہ راگ اپنے پورے زور پر آتا ہے اس کے درد پر ایک عجیب مستی کا عالم چھا جاتا ہے پھر سر بدلتے ہیں اور راگ زیادہ تیزی اور روانی سے جاری رہتا ہے۔ یہ اثر امراؤ کے فیضو کے ساتھ فرار ہو جانے سے لے کر فیض آباد پہونچنے تک چلتا ہے۔ یہاں راگ کا درد اس کی تیزی میں پنہاں ہے مگر فیض آباد کے قیام کے آخری حصہ میں یہ درد اُبل پڑتا ہے۔ اس کے بعد راگ کے ختم ہونے کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ ختم کرنے کی جلدی، مُغنی کی تھکن واقعات کی رفتار سے نمایاں ہوتی ہے اور آخری باب میں ٹوٹتے ہوئے راگ کا سکون ہے ہمیں محسوس یہ ہوتا ہے کہ ایک بہت ہی درد بھرا طویل گیت ابھی سنا ہے۔ اس خاص راگ کے ساتھ ساتھ جو امراؤجان کے گلے پر دوسرے ساز بھی بجتے رہے۔ ان کی اپنی اپنی آواز الگ رہی مگر سب گانے والے کی آواز پر ہی بج رہے ہیں۔

امراؤجان کی طبیعت موسیقی سے بہت مناسب پائی گئی اور اپنے فن میں اس نے بڑا نام پیدا کیا مگر یہ اس کا آخری راگ اس کی پوری زندگی کا راگ ہے اور اس کا اثر دائمی ہو گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایک ماہر فن موسیقی اس کے راگ کو تمام توجہ سے سن رہا ہے اس کا دل بڑھاتا جا رہا ہے اور اس سے فرمائش کرتا جا رہا ہے۔ پھر کیوں یہ راگ اپنے کمال پر دکھائی نہ دے۔

رسوا کا یہ بھی تعجب انگیز کارنامہ ہے کہ ایک ماہر موسیقی نے ایک ایسا راگ گوایا جو اردو زبان کی فضا میں ہمیشہ جاگتا رہے گا۔

حسن۔ پوری ناول ایک شعر کی طرح ہے جس میں واقعات اور کردار اسی ترکیب سے لائے گئے ہیں جیسے کہ کسی اچھے شعر میں الفاظ، اور یہ سب مل جل کر ایک مخصوص خیال ہمارے سامنے لاتے ہیں۔ آتش نے کہا تھا ؂

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں ۔۔۔ شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اُردو کے ادیب شعر کے اس فن سے تو واقف تھے مگر زیادہ تر کی اب بھی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ فسانہ بیان کرنا بھی ایک صورت ہے۔ زیادہ تر اب بھی لوگ محض طرز ادا کی درستی ہی کو ناول کا ادبی عنصر سمجھتے ہیں۔ یعنی یہ کہ جنہوں نے یہ سمجھ لیا کہ ناول کی صنعت اور حسن کس چیز میں ہے۔ انہوں نے اپنے ناول کا ہر باب ایک شعر سے شروع کیا ہر وہ باب اس شعر کا واقعہ اور کردار کے ذریعہ ترجمہ کرتا ہے۔ یہ تمام اشعار اس واحد شاعرانہ اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں جو پوری ناول کا تاثر ہے اور سب مل جل کر ویسا ہی اثر پیدا کرتے ہیں جیسے کہ کسی عمدہ شعر کے الفاظ، جس میں تمام مشاعبیتق موجود ہوں شاعری تو چاول پر قل ہو اللہ لکھنے کا فن ہے، ناول کا فن گز دو لمبے کر پیچ پر نقش بنانے کا فن ہے۔ دونوں کے ذرائع مختلف ہوں گے ..... اور حسن کا تاثر بھی مختلف طریقوں سے پیش ہوگا۔ اس فرق کو سمجھ لینا ہی رسوا کا کمال ہے اور اسی لئے وہ اردو میں ناول کے فن کے موجد کہے جا سکتے ہیں۔

مرزا رسوا کا ذہن جدید ذہن Modern Mind کی مثال کہا جا سکتا ہے۔ انسان کا ذہن ابتدا میں محض جزئیات کی طرف تھا اور اب بھی جاہل لوگ کسی بڑی چیز کے جزئیات ہی الگ الگ دیکھ سکتے ہیں مگر انسانی دماغ کی ترقی اس امر میں ہے کہ وہ کتنے بڑے سے بڑے مکمل تاثرات کو یکجا اور مربوط طریقہ پر دیکھ سکتا ہے رسوا کا ذہن اس درجہ پر پہنچ چکا ہے۔ یورپ کے علوم کو حاصل کرتے کرتے وہ کسی حد تک نہ پہونچ سکے۔ مگر یورپ کے فن کا گر جیسا انہوں نے سمجھا اب تک کوئی نہ سمجھ سکا۔ اس لئے امراؤ جان ادا اردو میں ناول کی فنکاری کا سب سے بڑا شاہکار ہے

سرشار کی اس فن کی طرف بڑی سطحی توجہ تھی۔ وہ چلے تھے داستان لکھنے مگر ناول کی راہ پر اپنے کو پا کر ناول نگار ہو گئے۔ ان میں ایسا پختہ فنکارانہ ضمیر نہیں تھا کہ وہ کوئی مربوط چیز پیش کر سکتے۔ شرر ہوئے تو ناول نگار ہی مگر نگاہ ان کی افسانوں ہی

کی طرف تھی اور ناول کے فن کو سمجھنے تک کی صلاحیت بھی ان میں نہ تھی۔ رسوا بھی پست ناولوں میں دلچسپی لیتے رہے مگر قدرت نے ان کو زیادہ اعلیٰ چیزیں پیدا کرنے کے لئے بنایا تھا۔ کم از کم ایک چیز تو وہ ایسی بنا گئے جس کی صنعت آپ اپنی مثال رہے گی۔ اصل میں وہ ہی اُردو ناول نگاری کے فن کے صحیح موجد ہیں اور اُردو میں جو کوئی بھی ناول نگاری کرے اس کے لئے سب میں پہلا فرض یہ ہے کہ "امراؤجان ادا" کو پڑھے اور بار بار پڑھتا ہی رہے۔ جو اُردو داں فن ناول نگاری کا صحیح مذاق حاصل کرنا چاہتا ہے اسکے لئے سب میں پہلے یہ ضروری ہے کہ اس ناول کا گہرا مطالعہ کرے اور اس کے فن کا اثر لینا سیکھے جیسے کہ ٹینی سن نے ملٹن کے کلام کو شاعرانہ ذوق کی کسوٹی بنایا تھا۔ ویسے ہی "امراؤجان ادا" کو ناول کے ذوق کی کسوٹی سمجھنا چاہیئے۔

یہی نہیں بلکہ فن قصہ گوئی کے اتنے کامل نمونے شاید یورپ کی ناول نگاری میں بھی کم ہی نکلیں۔ کیا امراؤجان ادا کو فیلڈنگ FIELDING کی TOM JONES ..... کے مقابلہ میں نہیں پیش کیا جا سکتا؟ دونوں میں تعمیر کی جو ہوشیاری ایک سی ہے اور دونوں مکمل طریقہ پر اپنے فن کا نمونہ ہیں۔ سطحی نظر سے دیکھتے ہوئے اور قومی جذبہ سے متاثر ہوتے ہوئے اس سوال کا جواب مثبت میں دیدینا آسان ہے مگر انصاف سے دیکھیئے تو معلوم ہو گا کہ دونوں مشینیں اپنی جگہ پر مکمل اور حسین ہیں مگر اُمراؤجان ایک زیادہ مختصر اور سیدھی سادی مشین ہے جبکہ "ٹام جونس" بہت ہی زیادہ بڑی عجیب عجیب ترکیبوں اور عجیب عجیب پرزوں سے بنائی ہوئی بہت زیادہ پیچیدہ مشین ہے۔ دوسرے الفاظ میں اُمراؤجان ادا میں وہ ڈرامائی پیچیدگی کی ہے جو اعلیٰ ترین ناول میں ہونا ضروری ہے۔ اس فرق کی خاص وجہ یہ ہے کہ فیلڈنگ کے پس پشت بڑی بڑی زبردست روایات ناول ہی کے قسم کے فن کی ہیں اور اسکی توجہ ان سب روایات کے ان پہلوؤں کی طرف ہے جن کے امتزاج سے وہ اپنانیا

فن بنا رہا ہے۔ ایپک شاعری اس کے ساتھ یک طرف ہے اور اس فن کی سب سے بہتر تعمیری چیز "پیراڈائز لاسٹ" PARADISELAST اس کے گھر ہی کی چیز ہے دوسری طرف اس کی نگاہوں میں تمام یورپین ڈرامے کی روایات ہیں اور ان روایات کی سب سے انوکھی صورت یعنی شیکسپیر کے ڈرامے اس کے لئے آسمانی چیز ہے پھر وہ بھی کافی عرصہ تک ڈرامہ نگاری کرنے کے بعد پختہ کار ہو کر ایک نیا فن ایجاد کر رہا ہے جس کو وہ "کامک ایپک" کا فن کہتا ہے۔ اس کے خلاف مرزا رسوا کی روایات میں یا داستانیں ہیں یا شرر، سرشار اودھ پنچ وغیرہ یا پھر ماری کوریلی کے درجہ کی ناولیں۔ پھر وہ ایسی نہایت عمیق اور پیچیدہ چیز بنانا کہاں سیکھ سکتے تھے۔ یہی ان کا کمال کافی ہے کہ وہ ایسی چیز تو بنا سکے جیسے "امراؤ جان ادا"۔

مرزا صاحب نے ایک دفعہ ایک نئی دوربین کے بابت کسی کتاب میں پڑھا تھا اور ایسی ہی دوربین اپنے گھر بنانے بیٹھ گئے۔ کھوکھلی بلیوں اور بالسوں کو رسیوں سے جوڑ جاڑ ان میں لنس لگا لگو دوربین بنا ہی ڈالی اور اس کے ذریعہ ستاروں کا مطالعہ کرنے لگے۔ ایک دن بندروں نے اس کو توڑ ڈالا تو ان کو کوئی غم نہ ہوا۔ وہ خود سمجھ گئے تھے کہ ان کی ایجاد کس قدر نامکمل تھی اور اس لئے کہ ان کے پاس ذرائع کی کمی تھی ورنہ ان میں صلاحیت پوری تھی۔ "امراؤ جان ادا" میں بھی صلاحیت کی کمی نہیں۔ ذرائع کی کمی محسوس ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ "ٹام جونس" کی سی اعلیٰ ایجاد نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی ایک ذرائع کی کمی کو دیکھتے ہوئے ان کی ایجاد ایک معجزہ ضرور ہے۔ اردو میں یورپین فنکاری کا سب سے اہم معجزہ ہے۔

(۴)

کردار نگاری کے سلسلہ میں بھی رسوا کی ہوشیاری کم نہیں۔ چاہے تخلیقی قوت کچھ کم معلوم ہو۔ "امراؤ جان ادا" کا ہر کردار نہایت صاف نمایاں اور سڈول ہے

اس معنی میں وہ سرشار کے بالکل ضد ہیں۔ سرشار کے کردار غیر مربوط بے ڈھنگے اور یک طرفہ ہی ہیں مگر سرشار کا ہر کردار زندہ ہے۔ چاہے وہ ایک ہی دفعہ سامنے کیوں نہ آیا ہو رسوا میں کردار کو زندہ کرنے کی قوت کم نظر آتی ہے ان کے زیادہ تر کردار عمدہ تراشے ہوئے بت ہی رہ جاتے ہیں۔ جو جی اٹھنے کے بجائے محض فنی تاثر ہی جاتے ہیں۔ کچھ کردار ضرور زندہ ہو جاتے ہیں اور کچھ تو دائمی زندگی حاصل کر لیتے ہیں۔

چھوٹے سے چھوٹے کردار بھی نہایت توجہ اور سلیقہ سے واضح کیئے گئے ہیں اور نہایت تناسب کے ساتھ پیش ہوئے ہیں۔ سب میں پہلے امراؤ کے باپ سیدھے سادے مقبرہ کے جمعدار ہیں۔ ان کے خلاف بدمعاش بے رحم جانور دلاور خاں ہے۔ جمعدار صفائی اور سچائی کی وجہ سے اس سے دشمنی مول لیتے ہیں اور وہ بھیا نہ بدلہ یوں نکالتا ہے کہ امیرن کو پکڑ کر لے جاتا ہے اس کے ساتھ اسی کے درجہ کا ایک انسان نما جانور پیر بخش بھی ہے۔ مگر دلاور خاں بڑا ہی خونخوار ہے اور امیرن کو مار مور کر کہیں پھینک دینا چاہتا ہے جبکہ پیر بخش تنگ دستی ہے اور فائدہ اٹھانے کی ترکیب نکال لیتا ہے۔ امیرن کی ماں معمولی کام دھندا کرنے والی گھریلو عورت ہے جو اپنے بچوں کو چاہتی ہے مارتی بھی رہتی ہے۔ خانم کی نوکرانی بوا بھی امیرن کی ماں سے مناسبت رکھتی ہے۔ اس کی مولوی صاحب سے محبت امیرن کی طرف شفقت اور خانم کی پرستش ہی عام زندگی ہے مولوی صاحب امیرن کے باپ سے مشابہ ہیں اور ان کی ذمہ داری، قابلیت اور نیک نیتی قابل قدر ہیں۔ مولوی صاحب ہی کے اثر سے امراؤ کو علم کا شوق ادب کا ذوق اور شاعری کی قابلیت حاصل کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔ خانم کے چکلے میں اور بھی رنڈیاں ہیں اور ان میں سے سب کے کردار صاف سامنے آجاتے ہیں۔ بدصورت بگا جان گانے میں فرد۔ امیر جان نزاکت میں یکتا، پری پیکر خورشید جان محبت کی پیاسی بہو بیٹی بننے کے لئے موزوں اور اسی طرح سب اپنی پوری سج دھج کے ساتھ آنکھوں کے

سامنے آجاتی ہیں۔۔ اس چکلے میں آنے والوں کے بھی نقوش پورے پورے جم جاتے ہیں۔

امراؤ جان شریف صاحب ذوقی باہمت باعزت نواب سلطان علی خاں معہ اپنے وفادار نوکر اور ان کے مزے میں خلل ڈالنے والا پاجی بدتمیز بزدل کمینہ خاں صاحب جو آکر امراؤ جان کا زانو دبا کر بیٹھ جاتا ہے۔ بسم اللہ جان کے نواب چھبن صاحب اور ان کا بے ایمان نوکر حسنو یا وہ عالم فاضل مولوی صاحب جو اس کے حکم سے بیڑہ چبانے سب اپنی فطرت پوری طرح نمایاں کرجاتے ہیں۔

ڈاکوؤں کا سردار فیض علی اور اس کی امراؤ جان سے گہری محبت۔ فیض علی کا بھائی فضل علی۔ دیہاتی رنڈی نفیسن۔ راجہ صاحب جنہوں نے خورشید کو گھر بٹھا ڈال لیا ہے اور مولوی صاحب جن سے امراؤ مسجد میں آکر ملتی ہے۔ یہ سب کردار خانم کے یہاں سے بھاگنے کے بعد امراؤ سے ملتے ہیں اور اپنی فطرت کے واضح نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ کانپور میں جن بیگم صاحب کے یہاں امراؤ جاتی ہے وہ وہی رام دئی ہے جو اس کے ساتھ چرا کر لائی گئی تھی۔ بیگم صاحب شریف گھر کی تہذیب یافتہ خوش وخرم محبت دار اور نیک طبیعت عورتوں کا نمونہ ہیں ان کی قسمت پر امراؤ کو رشک آتا ہے اور ان کی حالت امراؤ کی حالت کے متضاد ہے۔ بڑے نواب فیض آباد میں امراؤ کا بھائی جو اس کو مارنے آتا ہے اور آخر میں رونے لگتا ہے۔ اکبر علی خاں اور ان کے تمام یار دوست خاص طور سے وہ دیہاتی دوست جو کبھی کبھی گھر کے امراؤ سے پان مانگا کرتے تھے اور ان کے گھر کے لوگ جیسے بیوی، ماں، باپ اور خاص طور سے فیل مچانے والی بڑھیا فیضو کی ماں جس کو اکبر علی خاں کی بیوی کی پھٹکار ہیں۔ امراؤ جان کی نوچی اکبری مع اپنی کم ظرفی کے یہ سب چھوٹے چھوٹے کردار ایک ایسے فنکار کے قلم سے نکلے ہیں جو انسانی فطرت سے واقف بھی ہے اور اس کی ترجمانی کرنے پر

ماہر بھی ہے۔ جہاں تک ٹیکنیک کا تعلق ہے اس سے بہتر کردار نگاری کسی اور ادیب نے نہیں کی۔۔

علاوہ ان چھوٹے کرداروں کے کچھ بڑے کردار بھی ہیں جو زیادہ پھیلے ہوئے ہیں اور زیادہ واضح ہیں اور ان میں سے کچھ دائمی زندگی بھی رکھتے ہیں اور سب میں پہلے جو بڑا کردار اپنے نقوش قائم کرتا ہے وہ خانم ہے۔ یہ نہایت رعب داب کی عورت ہے۔ اس کی شان خاص ہے۔ کیونکہ شاید لکھنوی تہذیب کی پوری شان اس میں آگئی ہے اور اسے اپنے متعلقین پر پورا پورا قابو ہے۔ وہ لڑکیاں خرید کر نوچیاں بٹھاتی ہے مگر اس کے دل میں خوفِ خدا ہے اور وہ تمام عذاب و ثواب لوگوں کے سر پر ڈالتی ہے جو اس کے ہاتھ لڑکیاں بیچ ڈالتے ہیں۔ وہ اپنی نوچیوں کے آرام کا بڑا خیال رکھتی ہے اور اس کا گھر ایک پرستان ہے۔ اسے ایک خاص شخص سے محبت ہے اور اس شخص کی ہر بات کا وہ خیال رکھتی ہے۔ اپنے چاہنے والوں پر اسے قابو ہے اور وہ اپنی نوچیوں میں اس قابو کی کمی پر ترس کھاتی ہے۔ وہ ہوشیار ہے اور شریف گھروں کی بیگمیں اپنے لڑکوں کو ٹھیک راہ پر لگانے میں اس سے مدد چاہتی ہیں۔ وہ اعلیٰ تہذیب اور اعلیٰ تربیت کی مثال ہے۔ وہ اس طرح کی رنڈی ہے جس کے سپرد شریف لوگ اپنے لڑکوں کو تہذیب سکھانے کے لئے کر دیا کرتے تھے۔ اپنے فن میں وہ بڑی ہوشیار ہے گانے میں بڑے بڑے استادوں کو ٹوک دیا کرتی ہے۔ محفل پر رنگ جمانے کے پورے گر جانتی ہے۔ وہ اپنے مذہب کی بھی پکی ہے اور تعزیہ داری بہت شان سے کرتی ہے۔ بعد میں زمانہ کا رنگ دیکھ کر وہ ہر معاملے سے دست بردار ہو جاتی ہے اس کی اپنی نوچیوں سے محبت کم نہیں ہوتی اور اُمراؤ جان بھی زندگی بھر اس کا ادب ہی کرتی رہتی ہے۔ یہ کردار بہت ہی زوردار ہے مگر زندہ ہوتے ہوتے رہ جاتا ہے دوسرا نمایاں کردار گوہر مرزا کا ہے جو اُمراؤ جان کے ساتھ کھیلا ہوا ساتھ پڑھا ہوا

اور اس کا گلچیں اول ہے۔ وہ ایک ڈومنی کا بچہ کمینہ اور رکیک شخص ہے مگر وہ ایک خاص ٹائپ ہے جس کی رنڈیوں کو ہر وقت ایسی ہی ضرورت رہتی ہے جیسے کسی عورت کو شوہر کی اور کسی پیشہ ور کو ایجنٹ کی۔ وہ بدطینت اور بدذات سہی مگر وہ کام کی چیز ہے اور اُمراؤ جانؔ اس سے آخر تک نبھائے جاتی ہے اور ہر طرح اس کی مدد کرتی رہتی ہے۔ (وہ عام ذلیل رنڈیوں کا مناسب ساتھی ہے مگر اُمراؤ جان کے متضاد ہے) وہ اُمراؤ جان کو بڑے بڑے دھوکے دیتا ہے اور اس کا کافی مال کھسکا دیتا ہے۔

یہ کردار نہایت دلچسپ ہے مگر خانم سے کم زندہ اور کم اثر ہے۔ ناول کا سب سے زیادہ زندہ اور زندہ رہنے والا کردار بسم اللہ جان ہے۔ خانم کی یہ تیز، خود غرض اور خودرو لڑکی نہایت کمال کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اس میں ایک خاص قسم کی بے مروتی ایک خاص قسم کی معشوقانہ بے رحمی اور ایک خاص بدلہ لینے کی ادا ہے۔ جس سے اس کا مکمل رنڈی پن ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس میں خودی خانم سے ورثہ میں آئی ہے اور اس خودی کو وہ اس ناز کے ساتھ اپنے پرستاروں پر جتا دیتی ہے کہ وہ ہل نہیں سکتے مردوں کو جل دینا ان پر حکم چلانا اور ان کو پسپا کر دینا اس کا خاص کام ہے۔ اور اس کام کو انجام دینے کے لئے اس کے پاس جیتا جاگتا ذہنی فن ہے۔ ناول کے سب سے زیادہ زور دار حصے وہی ہیں جہاں بسم اللہ جان اپنی پوری فطرت کے ساتھ سامنے آجاتی ہے۔ بسم اللہ کے پہلے آشنا نواب چھبن صاحب کے خاص کارکن حسنو نے نواب کی تباہی کے بعد بسم اللہ کو اپنے ڈھب میں کرنے کی کوشش کی ہے اور بسم اللہ نے اس کو آڑے ہاتھوں لے کر اسے ذلیل کیا ہے۔ اسے دھوکا دیا ہے اس سے سخت بے مروتی دکھائی ہے اور آخر کار اسے قیمتی کڑے دل گی توڑی کر اس کو اپنے گھر سے بھگا دیا ہے۔ یہ سب حالات جن چار یا پانچ صفحوں میں بالکل زندہ ہو جاتی ہے وہ اس ناول کے بہترین صفحوں میں سے ہیں۔ اسی طرح وہ سبق بھی جس میں بسم اللہ ضعیف عالم فاضل چاہنے والے مولوی صاحب

ے اپنی بندریا کو ڈانٹنے کا یہ بدلہ لیتی ہے کہ ان کو قبا اتروا کر پیڑ پر چڑھنے کا حکم دیتی ہے وہ بھی بہت ہی گہرا اثر رکھتا ہے۔ پھر یہ سبق عجیب ہے جس پر ہنسی آتی ہے۔ مگر مولوی صاحب کا بسم اللہ سے عشق اس ناول کا عجیب ترین کرشمہ ہے۔ پھر ایک دفعہ مولوی صاحب بسم اللہ کے پاس آتے ہیں اس کا حال سنیئے۔

ایک دن رات کے آٹھ بجے بسم اللہ جان کے کمرے میں بسم اللہ گا رہی ہیں۔ اور طنبورہ چھیڑ رہی ہیں۔ خلیفہ جی طبلہ بجا رہے ہیں۔

استنے میں مولوی صاحب قبلہ تشریف لائے۔

بسم اللہ (دیکھتے ہی) آٹھ دن سے تم کہاں تھے؟

مولوی صاحب:۔ کیا کہوں مجھے تو اب کی ایسی تپ شدید لاحق ہو گئی تھی کہ بچنا محال تھا مگر تمہارا دیدار دیکھنا تھا اس لئے جانبر ہو گیا۔

بسم اللہ:۔ تو یہ کہیئے وصال ہو گیا ہوتا۔

اس فقرے نے مجھ کو اور خلیفہ جی کو پھڑکا دیا۔

مولوی صاحب:۔ جی ہاں آثار تو کچھ ایسے ہی تھے۔

بسم اللہ:۔ واللہ اچھا ہوتا۔

مولوی صاحب:۔ میرے مرنے سے آپ کو کیا نفع ہوتا۔

بسم اللہ:۔ جی آپ کے عرس میں ہر سال جایا کرتے گاتے ناچتے لوگوں کو رجھاتے اور آپ کا نام روشن کرتے۔

اس قسم کی باتوں سے بسم اللہ کی فطرت اس زور کے ساتھ روشن اور زندہ ہو جاتی ہے کہ امراؤ جان کی بھی نہیں ہوتی۔!

(۵)

مگر مرزا صاحب کی فنکاری کا بہترین نمونہ امراؤ جان ہی ہے ٹیکنک کے لحاظ

سے یہ اردو میں کردار نگاری کی بہترین مثال ہے۔ اس کی خلوت نشینی اس کی عالی دماغی اور اس کا سچا ادبی ذوق مشاعرہ ہی میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ہم اسے ایک غیر معمولی زندگی ضرور سمجھ لیتے ہیں اور اس کی سوانح حیات سننے کے لئے پورے طور پر تیار ہو جاتے ہیں اس کا یہ مطلع ؎ کس کو سنائیں حال دلِ زار اے ادا

آوارگی میں ہم نے زمانہ کی سیر کی!

اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی سرگذشت ضرور غیر معمولی اور دلچسپ ہوگی کیونکہ وہ خود غیر معمولی چیز ہے۔ مرزا صاحب خود اس کے غیر معمولی ہونے کی دلیل میں فرماتے ہیں۔

"اول تو خواندہ دوسرے اعلیٰ درجہ کی رنڈیوں میں پرورش پائی، شہزادوں اور نواب زادوں کی صحبت اٹھائی۔ محلات شاہی تک رسائی، جو کچھ انہوں نے آنکھوں سے دیکھا اور لوگوں نے کانوں سے نہ سنا ہوگا۔" غرض امراؤ جان اپنا قصہ شروع کرتی ہے مگر قصہ شروع کرنے سے پہلے کچھ الفاظ تمہید میں کہتی ہے جو اس وقت اس کے پورے کردار کو، اس کی اپنی زندگی پر نظر کو اور اس کے اپنے جذباتی عالم کو جس میں وہ آخر کار غرق ہو گئی ہے پورے طور پر نمایاں کرتے ہیں وہ کہتی ہے "مجھ کم نصیب کی سرگذشت میں ایسا کیا مزہ ہے جس کے آپ مشتاق ہیں۔ ایک ناشاد نامراد آوارہ وطن، خانماں برباد ننگ خاندان، عار دو جہاں کے حالات سن کر ہرگز امید نہیں کہ آپ خوش ہوں۔" وہ اپنی زندگی کو بد قسمتی اور ذلت کی زندگی سمجھ چکی ہے۔ اس کا کردار بڑے اعلیٰ اخلاقی اور فلسفیانہ معیار پر پہنچ چکا ہے۔

غرض سب میں پہلے امراؤ کے بچپن کا کردار آتا ہے۔ وہ معمولی گھر کی معمولی لڑکی ہے جو بچپن کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے درمیان زندگی گذار رہی ہے۔ اس کا اپنے بھائی کو کھلانا، اس کی ماں باپ سے محبت، باپ کی اس سے

محبت، باپ سے اس کی فرمائشیں اس کی شادی ٹھہر جانا، اس کا اپنے ہونے والے دولہا کا تصور یہ سب باتیں وہی ہیں جو عام معمولی گھروں کی لڑکیوں میں ہوتی ہیں۔ امیرن نہایت بھولی بھالی غریب شریف لڑکی ہے جو اپنے حال میں خوش ہے۔ اس کی خواہشیں سب جلد پوری ہوتی معلوم ہوتی ہیں۔ اس پر ہر طرف سے محبت کے دروازے کھلے ہیں اور وہ اپنے ماحول میں سب سے زیادہ عزت دار گھر کی لڑکی ہے۔ یہ سیدھی سادہ اور چھوٹی زندگی بڑی اہم یوں ہے کہ دنیا کا تمام تجربہ کرنے کے بعد امراؤ کی رائے یہ ہے کہ۔

"مرزا رسوا صاحب میں نے اپنے ماں باپ کے گھر اور بچپن کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے کھینچ دیا ہے۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اس عالم میں رہتی تو خوش رہتی یا ناخوش، اسے آپ خود قیاس کر سکتے ہیں۔ میری ناقص عقل میں تو یہ آتا ہے کہ میں اسی حالت میں اچھی رہتی" اس طرح پر امراؤ کے کردار کی ایک خاص صفت نمایاں ہوتی رہتی ہے۔ وہ یہ کہ وہ آوارگی میں زمانہ کی سیر کر چکی ہے اور اعلیٰ مراتب حاصل کر چکی ہے مگر معمولی گھریلو زندگی اس کے لئے زیادہ اہم اور خوشی کی زندگی ہے۔ یہ موضوع ہر جگہ سامنے آتا رہتا ہے۔

وہ ایک چھوٹی سی کیاری کی چھوٹی سی کلی تھی۔ مگر قسمت نے اسے اس کیاری سے توڑ کر خانم کے باغ میں لاکر لگایا اور یہاں وہ کھل کر پھول ہوئی۔ خانم کا گھر لکھنوی تہذیب کے بہترین مدرسوں میں سے ہے۔ یہاں تعلیم اور رہائش کا عمدہ انتظام ہے امراؤ کو ہر طرح کا آرام ہے اور وہ ہر طرح خوش ہے۔ اسے موسیقی کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس کی طبیعت قدرتی طور پر اس فن کے لئے موزوں ہے۔ اسے درسِ علوم ہوتا ہے اور اس کی ذہانت اور توجہ سے اس میں علمی مذاق اور ادبی ذوق پیدا ہو جاتا ہے۔ قدرت نے اس میں بڑی بڑی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں۔ اگر وہ

اپنے باپ کے گھر ہی میں رہتی تو یہ سب قابلیتیں دبی ہی رہ جاتیں اور وہ ویسی ہی بے کار اور معمولی چیز رہ جاتی جیسے کہ اس کی ماں تھی۔ خانم کا چکلہ ایک بڑی اچھی تعلیم گاہ ہے مگر ہر تعلیم گاہ کی طرح یہاں کی تعلیم کا بھی ایک مقصد ہے اور یہ مقصد ذلیل ..... جنس فروشی ہے۔ عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کے یہاں قانون تو ضرور ہیں مگر اس سلسلہ میں زیادہ روک ٹوک نہیں ہے۔ گوہر مرزا اور امراؤ ساتھ ساتھ پل بڑھ رہے ہیں یہ ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں مگر جوان ہو جاتے ہیں تو ان کو اس لڑائی میں مزا آنے لگتا ہے۔ ان دونوں میں جنسی تحرک کے ورود کو روکنے والی ان کے ماحول میں کوئی چیز نہیں ہے۔ امراؤ اپنے گھر سے اس معصومیت کے زمانے میں لے آئی گئی تھی۔ جبکہ کسی اخلاقی دور نے اپنا نقش اس کے دماغ پر نہیں جمایا تھا۔ یہاں آکر مرد و زن کا بالکل آزادانہ میل جول اسے دلچسپ چیز ضرور معلوم ہوئی اور گوہر مرزا کے عشق میں اسے مزا آنے لگا۔ اس ماحول میں جنس کی بابت ایک قانون ضرور تھا۔ وہ یہ کہ مسّی کی رسم ادا ہونے سے پہلے ہر لڑکی کو باکرہ ہی رہنا چاہئے تھا اور اس لئے امراؤ کو بوا حسینی حفاظت سے رکھتی تھیں۔ غرض ایک دن موقع پاکر گوہر مرزا اگلچیں اول بن ہی گئے اور اس امر کی خبر خانم کو بھی ہو گئی۔ اس منظم عورت نے اس معاملے کو سنبھالنے کے لئے ایک آنکھ کا اندھا اور گانٹھ کا پورا ڈھونڈ ہی لیا۔ اور مسّی کے بعد امراؤ کھل کر پورا پھول ہو گئی۔ اب تک امراؤ ایک سیدھا سادہ منفرد کردار تھی۔ مگر اب اس کی فطرت مرکب اور پیچیدہ ہوتی جاتی ہے اس کے سامنے پوری دنیا ہے۔ اس دنیا کے ہر دائرے کی طرف اسے ایک خاص نظر رکھنا ہے وہ پوری رنڈی بنا تو دی گئی ہے مگر وہ فطری طور پر رنڈی نہیں ہے۔ پیدائشی اور فطری رنڈی بسم اللہ ہے۔ اور نہ وہ پورے طور پر گھریلو عورت ہی ہونے کے قابل ہے۔ اس قسم کی عورت خورشید ہے۔ امراؤ کی فطرت میں متضاد رجحانات

ملے جلے کام کر رہے ہیں۔ خانم، بوا حسینی اور مولوی صاحب کو اب تک وہ شفیق والدین کی جگہ پر سمجھ رہی تھی۔ مگر اب اس پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان کی محبت ایک قسم کی خود غرضی ہے اور وہ خود ان کے ہاتھ میں ایک قیمتی سودے سے زیادہ نہیں۔

گوہر مرزا سے اسے جنسی درجہ کی محبت تھی ورنہ وہ ظرف اور ذہن کے لحاظ سے اس کے قابل نہ تھا، مگر اسے گوہر مرزا سے طرح نبھانا ضروری ہے جیسے کہ کوئی سمجھدار گھریلو عورت اپنے کم ظرف اور پست نظر میاں سے اس لئے نبھاتی ہے کہ اس کے ذریعے بہت سے کام نکلتے ہیں اور بڑے فائدے پہونچتے ہیں۔ وہ ادبی ذوق رکھتی ہے، وہ مبصر حیات انسانی ہے۔ وہ اپنی اس سلسلہ کی دلچسپی یوں بیان کرتی ہے۔

"مجھے تو اور کسی چیز سے کام نہیں۔ لوگوں کے چہرے دیکھنے کا شوق ہے، خصوصاً میلے تماشوں میں خوش ناخوش، مفلس، تونگر، بیوقوف، عقلمند، عالم، جاہل، شریف رذیل، سخی، بخیل سب کا حال چہرے سے کھل جاتا ہے۔" اسے اپنے ساتھیوں میں سے ہر ایک کے کردار اور واقعات میں گہری دلچسپی ہے۔ غرض کہ وہ بہت ہی اعلیٰ چیز ہے اور اس کے دل میں اپنا مدمقابل ساتھی مل جانے کی خواہش ہے۔ چنانچہ نواب سلطان علی خاں اسے اپنے حسب دلخواہ شریف باعزت، صاحب ذوق شخص ملتے ضرور ہیں مگر ایک ناشدنی خاں صاحب ان سے آشنائی کو ختم کرا دیتا ہے۔

امراؤ کے حالات کا اور جذبات کا الجھاؤ اس وقت اس حالت پر ہے کہ وہ اشارہ پاتے ہی اپنی موجودہ زندگی کو ترک کر کے ایک ثبت کرنے والے ڈاکو فیضو ہی کی ہو کر رہنا چاہتی ہے۔ امراؤ کا فیضو کے ساتھ بھاگنا ایک ایسا پیچیدہ نفسیاتی عمل ہے جس کے واقعی ہونے میں کوئی شک نہیں مگر جس کی تہہ تک نہ امراؤ پہنچ سکی اور نہ رسوا ہی۔ دونوں کچھ سطحی منطقی اور عام نفسیاتی اصولوں سے اس حرکت کو سمجھنے

کی کوشش کرتے ہیں مگر صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مرکب اور الجھی ہوئی نفسیاتی حالت سے مرزا صاحب واقف تو ہیں مگر ان کو اس اعلیٰ نفسیاتی اور تخئیلی عکس کشی کے ساتھ نہیں پیش کر سکتے جو ہم کو یورپ کے بہترین ناول نگاروں میں ملتی ہے۔ لاشعور کی تحلیل سے وہ بالکل ناواقف ہیں کیونکہ ان کو یا تو علوم منطق اور نفسیات کے سستے اصولوں کا علم ہے اور یا پھر اس قسم کی ناولوں کا جن کے انہوں نے ترجمے کئے۔

اگر وہ اعلیٰ ناول نگاروں سے واقف ہوتے تو یہ کمی ان کے ہاں نہ رہ جاتی۔ اسی طرح جب امراؤ کانپور پہنچ گئی ہے اور فیضو کو گرفتار ہو کر جاتے دیکھ چکی ہے اور ایک مسجد میں داخل ہوتی ہے۔ اس وقت اس کا مولانا کو بنانا اور ان پر ہنسنا بھی ایک عجیب نفسیاتی حرکت ہے۔ جس کی بابت رسوا سوال کرتے ہیں کہ ہنسنے کی کیا ضرورت تھی اور امراؤ محض یہ بتاتی ہے کہ مولانا کی شکل ہی ایسی تھی کہ جس پر ہنسی آئے۔ یہ کتنی کتنی سطحی منطق اور کتنی سطحی تحلیل نفسیات ہے۔

اس اہم موقع پر بھی رسوا کے ہاں ان اعلیٰ تخئیلی قوتوں کی کمی معلوم ہوتی ہے جن کی بنا پر دنیا کے بہترین ناول نگار اپنی تخلیقوں کو تعجب انگیز زندگی دے گئے۔ غرض امراؤ جان میں اب اپنے تئیں پھر سے قائم کر لینے اور کچھ ہی عرصہ میں کامیاب ہو جانے کی پوری قابلیت ہے۔ اس کا شعور پختہ ہو گیا ہے مگر اس کے اندر اپنی موجودہ حالت اور عینی تصورات کے درمیان کشمکش ختم نہیں ہوتی ہے۔ کانپور ہی میں ایک دن وہ ایک بیگم صاحب کے یہاں جاتی ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بیگم وہی لڑکی رام دئی ہے جو اس کے ساتھ بکی تھی۔ امراؤ کو اپنی اور بیگم کی زندگی میں مناسبت اور تضاد سے ایک خاص رشک پیدا ہوتا ہے۔ وہ پھر لکھنؤ واپس آجاتی ہے۔

اس کے بعد سے اس کی زندگی میں واقعات تو بہت پیش آتے ہیں اور اس کا تجربہ بڑھتا رہتا ہے مگر اس کا شعور پختہ ہو چکا ہے اسی لئے اس کا خالق اب واقعات کے تیزی

کے ساتھ بیانات کو نفسیاتی حالات کی تحلیل پر ترجیح دیتا ہوا آگے بڑھتا ہے۔ امراؤ دنیا کو صحیح نگاہ سے دیکھنے کی اب پوری اہل ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ کامیاب ہوتی جاتی ہے اور شاہی سرکار سے متعلق ہو گئی ہے۔ غدر کے بعد وہ اپنے وطن فیض آبادہی میں آ بستی ہے، اس شہر سے اسے محبت ہے اور اسے اپنے والد کی موت کا حال سن کر بڑا رنج ہے۔ ایک دن اسے اسی گھر پر مجرا کرنے جانا پڑتا ہے جس میں وہ پیدا ہوئی تھی۔ یہ اس کے قصہ میں ایک اور پیچیدہ نفسیاتی حالت ہے۔ اس حالت کو مع امراؤ کے اپنی ماں سے ملنے کو جس خوبی سے رسوا نے واضح کیا ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ مرکب حالات کو زور کے ساتھ پیش کرنے کے وہ بھی اہل ہو سکتے ہیں۔

یہی ایک مقام ہے جہاں امراؤ جان کی پوری فطرت مکمل طریقہ پر زندہ ہو گئی ہے یہاں سے اس کا تجربہ ایک اور پہلو بدلتا ہے۔ اسے اپنی ذلیل حالت اور اپنے اس ذلیل پیشے کا احساس گہرا ہونے لگتا ہے۔

اُمراؤ پھر لکھنؤ آ جاتی ہے۔ اکبر علی خاں مختار کے گھر میں بڑھیا ممّو کی ماں والا واقعہ اس کی ذلت کی حد ہے۔ امراؤ مالدار ہے عالی مرتبہ ہے مگر اس کمینی اور بدمعاش عورت سے بھی اس کا درجہ کم ہے۔ وہ اپنے تئیں اتنا ذلیل گنا جانا گوارہ نہیں کر سکتی مگر رسوا مشفق واعظ اس کو سمجھا دیتے ہیں کہ ذلیل ترین عورت بھی رنڈی سے بہتر ہوتی ہے اور وہ چپ ہو رہتی ہے۔ اب سے اس کی تمام زندگی اس کی نظر میں گرد ہے اور اپنی بدنصیبی کا احساس گہرا ہو گیا ہے۔ یہ احساس پورے طور پر جب نمایاں ہوتا ہے جب وہ کانپور والی بیگم سے پھر ملتی ہے اور ان کے میاں وہی سلطان علی خاں نکلتے ہیں۔ جن سے امراؤ کو دلی محبت تھی۔

اُمراؤ اپنی بدقسمتی کو رام دئی کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہوئے یوں ادا کرتی ہے "جب رام دئی یہ باتیں کر رہی تھی مجھے اپنی قسمت پر افسوس آتا تھا اور دل ہی دل

میں کہتی تھی تقدیر ہو تو ایسی ہو۔ ایک میری پھوٹی تقدیر تھی تو کہاں رنڈی کے گھر۔"

اس کے بعد آخر میں وہ حالت آتی ہے جب وہ بخشی کے تال پر دلاور خاں کو دیکھ کر ڈر جاتی ہے۔ یہ بھی ایک نفسیاتی موقع اور یہ بھی مرزا صاحب کی ناکامیابی کی مثال ہے امراؤ جان یہاں زندہ ہوتے ہوتے رہ جاتی ہے مگر اس کی ہستی کے تمام نقوش مکمل ہو جاتے ہیں اور کردار نگاری کے ٹکنیک کی کامیاب مثال ہمارے ذہن پر ہمیشہ کے لئے قائم ہو جاتی ہے۔

آخر میں امراؤ کا رسوا کے نام خط اس کی تمام سیرت کا خلاصہ ہے۔ اس کی عالی ظرفی کا سکہ تو اس کی نوچی آبادی کے واقعات ہی سے جم چکا ہے۔ اس خط سے اس کا تجربہ اس کی فلسفی بنا ہی۔ اس کا گہرا جذبہ مذہب اور اس کا صحیح احساس زندگی ظاہر ہوتا ہے وہ ایسی ہستی ہے جو اپنی خودی کو پورے طور پر پہچان گئی ہے، اجزمانہ کو پورے طریقہ پر سمجھتی ہے۔ اس نے اپنے لئے ایک باعزت راہ عمل تلاش کر لی ہے۔ اس کی ذہنی اخلاقی اور مذہبی عظمت کا سکہ پورے طور پر ہمارے ذہن پر جم جاتا ہے وہ بڑی قابل قدر چیز ہے مگر اس میں ایک بنیادی کمی ہے وہ رنڈی ہے اور اس سے نہ کوئی محبت کرنے والا ہے اور نہ وہ کسی سے محبت کر سکتی ہے۔ اس کا ایک سہارا شہید کربلا ہیں۔ جن کے روضہ پر دوبارہ جا کر مر جانے کی تمنا ہی اس کی ایک تمنا باقی رہ گئی ہے۔ آخر وہی اس کو بخشوائیں گے وہ خود بھی تو مظلوم ہی تھی۔ قسمت نے اسے رنڈی بنایا تھا اور وہ خود تو ہمیشہ ہر ایک کے ساتھ نیکی ہی کیا کی۔ اس کی مظلومی کا تاثر اس کی تمام داستان کا اس کے تمام نفسیات کا تاثر ہے۔

فنی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہوئے یہ اردو کا پہلا بڑا کردار ہے جس کی صفات واضح ہیں۔ جس کی سنجیدگی مسلّم ہے اور جس کی انفرادیت صاف ہے۔ جس خوبی سے اس کے مدارج ارتقا دکھائے گئے ہیں وہ بھی اپنی آپ مثال ہے۔ مگر یہ کردار اس قدر زندہ

نہیں ہے جتنا کہ سرشار کا خوجی۔ اس میں شک نہیں کہ رسوا فن کاری میں ہر طرح سرشار سے آگے ہیں مگر پھر بھی منطقی اور ماہر ریاضی ہی رہتے ہیں۔ ان کا کام سرشار سے زیادہ مشکل ہے اور اس میں ان کو کامیابی کے لئے اور زیادہ فطری صلاحیتوں کی ضرورت تھی جو ان میں نہ تھیں۔ وہ اُردو میں فن کے سب سے بڑے عامل ہیں مگر وہ اس فن کے نشے میں سرشار نہیں ہوتے۔ وہ منطقی، اخلاقی اور نفسیاتی فلسفہ کے ماہر ہیں مگر ان میں فطری شاعر کی وہ تخیلی قوت کا والہانہ پن اور وہ الہامی لطف نہیں ہے۔ جس سے اُمراؤ جان جیسے مکمل اور مرکب کردار میں ایک نئی روح پھونکی جا سکے۔

اُمراؤ جان ہمارے دل کو متاثر ضرور کرتی ہے مگر ہماری روح میں اسطرح اتر نہیں جاتی جیسے کہ جین آسٹن کی الزبتھ بینٹ ٹھیکرے کی بیکی شارپ ہارڈی کی ٹس، اور فلابیر کی مبدام بواری یا سب سے بالا تر ٹالسٹائے کی کیرینینا۔

رسوا کردار نگاری کی ٹکنیک کے مالک ہیں۔ مگر فنکاری کے اعلیٰ ترین درجے کو پہونچتے پہونچتے رہ جاتے ہیں۔ وہ سماج ہی کو غالب مان لیتے ہیں اور خود کو مغلوب۔ لکھنوی معاشرت میں یہ قسمت سے مظلوم ہو جانے کا تاثر بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس معاشرت کے دلدادہ لوگوں کے لئے اسی وجہ سے وہ سب سے زیادہ قابل قدر ہستی ٹھہرائی جا سکتی ہے مگر یہ تاثر آفاقی اور دائمی نہیں کیونکہ یہ انسان کو سماج کے مقابلہ میں زندگی کو وقتی قدروں کے مقابلہ میں کمزور دکھاتا ہے۔

امراؤ جان لکھنؤ کی قابل قدر عورتوں میں سے ہے مگر آفاقی عورتوں کے دائرے میں نہیں آتی اور انسانیت کو محض وقتی قدروں سے بالاتر نہیں ثابت کرتی اس لئے اسکا کردار دل میں وہ گرمی وہ جوش نہیں پیدا کرتا جو ہمیں کائنات کے آفاقی بھید کے ظاہر ہونے سے پیدا ہوتا ہے۔ اُردو میں کردار نگاری کا عالم دیکھتے ہوئے یہی سب سے بڑا کمال ہے۔

(۶)

امراؤ جان ادا کے سب سے زیادہ اہم کردار مرزا رسوا خود ہیں۔ اول تو یہ ناول فن کی حیثیت سے ان کی پوری ہستی کا مظاہرہ ہے مگر وہ اس میں کردار کی حیثیت سے بھی تو موجود ہیں۔ امراؤ اس ناول کی ہیروئن ہے اور رسوا ہیرو ہیں۔ اس کے قصہ کے ہر واقعہ میں یہ کسی نہ کسی طرح شامل ضرور ہیں۔ فنکاروں اور اعلیٰ ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے اس ناول کے وہ حصے کم اہم نہیں ہیں جن میں امراؤ جان اپنا قصہ بیان کرتے کرتے اپنا قصہ سننے والے سے باتوں میں مصروف ہو جاتی ہے اور پھر امراؤ کا روئے سخن ہمیشہ رسوا ہی کی طرف ہے اور وہ قصہ کو بالکل ان ہی کے لئے بیان کر رہی ہے۔ ان کی توجہ ان کی دلچسپیاں اور ان کی معلومات کے مطابق قصہ چل رہا ہے وہ اور امراؤ ایک روح اور دو قالب ہیں۔ دونوں کے مذاق ایک ہیں، رائیں ایک ہیں اور جہاں کہیں بھی فرق ہے تو ایسا کہ آخر دونوں ایک رائے ہو جاتے ہیں۔

اس کے بہت سے آشنا ہوئے اور ان میں سے اکثر نے اس کو چاہا مگر رسوا سے زیادہ اس کا چاہنے والا اور اس کی قدر کرنے والا کوئی بھی نہیں ہوا۔ وہ رسوا کو ایسے قدر دانوں میں گنتی ہے جن پر اسے پورا اعتماد ہے اور رسوا اس کی زندگی کی اسقدر قدر کرتے ہیں کہ اس کے حالات کو دائمی زندگی بخشتے ہیں۔ ممکن ہے کہ امراؤ جان محض ان کی تخلیق ہے۔ حالانکہ رسوا کے جاننے والے اس کو حقیقت بتاتے ہیں مگر اس سے ان کی گہری محبت دو خاص باتوں سے ظاہر ہے۔

اول یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اور سب ناول سرسری طور پر محض وقتی فائدے کے لئے لکھ ڈالے تھے۔ امراؤ جان ادا کو خاص توجہ سے لکھتے رہے اور اس کی نوک پلک اس درجہ درست کرتے رہے کہ وہ فنکاری کا کمال ہو گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ لکھنؤ کے ماحول میں ایک رنڈی کی سوانح حیات کی اشاعت ایک قسم کا جرم سمجھا جاتا تھا

رسوا کے زیادہ تر دوستوں نے منع کیا کہ وہ اس تصنیف کو نہ چھاپیں اور انہوں نے اسے چھپوا کر چھوڑا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اپنے تصور میں انہوں نے اپنی زندگی کی بہترین ساتھی عورت امراؤ جان ہی کی سی سوچ رکھی تھی۔ وہ ان ہی کی زندگی کا ایک زنانہ چربہ ہے اور ان ہی کی مرضی کے موافق تشکیل کی ہوئی ہے۔

مرزا محمد ہادی اس ناول سے پہلے مرزا تخلص کرتے تھے اور رسوا نہیں تھے۔ مگر اس ناول میں وہ رسوا ہیں اور جب تک اردو زبان زندہ ہے وہ رسوا ہی کہلائے جائیں گے۔ ان کی رسوائی اس امر میں ہے کہ وہ صاحب ذوق شاعر اور فلسفی ہیں جو اعلیٰ درجہ کی رنڈیوں کی صحبت کے دلدادہ رہے اور امراؤ جان ان کے لئے تمام رنڈیوں کی عینی حقیقت ہے۔ وہ لکھنوی ہیں اور لکھنوی تہذیب کے دلدادہ ہیں اور اس تہذیب کے جس پہلو کو انہوں نے ایک خاص فلسفیانہ اور اخلاقی نظر سے دیکھا ہے کہ وہ اس شہر کی عیاشی سے متعلق زندگی ہے۔ اس زندگی کی قابل ترین اور دقیع ترین ہستی یا وہ خود ہیں یا امراؤ جان۔

اس لئے اپنے اس زندگی کے بابت تمام تجربہ اور تمام فلسفہ کو وہ امراؤ جان کی داستان کے سلسلہ میں پیش کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ہر حصہ پر فلسفیانہ یا ادبی تنقید بھی کرتے جلتے ہیں۔ ناول کی تمام تنقیہ حیات ان کے وجود کے ساتھ ساتھ چلنے سے واضح ہو جاتی ہے۔ رسوا زندگی میں ہر جگہ امراؤ جان کے ساتھ نہیں ہے ورنہ انہیں اسکی سرگزشت سننے کی ضرورت ہی کیا پڑتی مگر اس کی سرگزشت کے ساتھ وہ ہر قدم پر ہیں۔ اس کے تجربے سے قریب قریب اسی کی طرح متاثر ضرور ہوتے ہیں۔ اس کی رایوں سے اپنی رائیں ضرور ملاتے چلتے ہیں اور آخر میں اس کی زبان سے وہی نکلتا ہے جو ان کے دل میں ہے اور ان کے فلسفہ حیات کا نچوڑ ہے۔

رسوا شاعر ہیں اور لکھنوی شاعری سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس سلسلہ میں

ان کا مرغوب ترین مشغلہ یہ ہے کہ چند اچھے صاحبِ ذوق ایک چھوٹی سی محفل مشاعرہ میں جمع ہو کر اپنا اپنا کلام سنائیں۔

اُمراؤجان کا بھی مرغوب ترین مشغلہ یہی معلوم ہوتا ہے جب ہی تو وہ ایسی محفل دیکھ کر بے قرار ہو جاتی ہے اور اسی محفل میں شامل ہو جاتی ہے۔ اُمراؤجان اپنے مذاق اور اپنی شاعرانہ قوت کا ایسا مظہر بن جاتی ہے کہ منشی صاحب جو افسانوں کے دلدادہ ہیں اس کا حال سننے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ مرزا رسوا بھی افسانوں سے ذوق رکھتے ہیں مگر افسانے ان کے لئے انسانوں کی زندگی اور ان کی بات چیت سے زیادہ اور کچھ نہیں ہیں۔ اس لئے فسانہ سے زیادہ دلچسپ مطالعہ زندگی ہے اور تمام زندگی سے زیادہ دلچسپ لکھنؤ کی زندگی ہے کیونکہ یہاں کے لوگوں کے طریقے اور بات چیت بے مثل ہے۔

رسوا خدایان لکھنؤ میں سے ہیں "ذات شریف" ہیں۔ انھوں نے لکھنؤ کی زندگی پر نہایت عمدہ تنقید کی ہے جس میں اس زندگی کے اہم پہلوؤں کو واضح کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ یہاں کے لوگوں کا بیجا زعم ان کی تباہی کا باعث ہوا۔ درحقیقت ہے کہ لکھنؤ میں "ہم چومن دیگرے نیست" کا جذبہ ہمیشہ رہا۔ رسوا اس زندگی کے مورخ ہیں اور اس کے دقیق پہلو کو واضح کرتے ہوئے اس کی وہ خامی بھی دکھا دیتے ہیں جو اس کی تباہی کا باعث ہوئی۔

یہاں ان کی توجہ اس لکھنؤ کی طرف ہے۔ جو بلدۂ عیش و طرب کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا مرکز چوک ہے اور وہاں کی ایک مثالی رنڈی اُمراؤجان ہے۔ جس کی سرگزشت سے اس زندگی پر پوری تنقید ہو جائے گی اور محاسن و عیوب پورے پورے نمایاں ہو جائیں گے۔ منشی صاحب کے برخلاف جن کی دلچسپی سطحی ہے۔ رسوا لکھنوی زندگی کے مورخ کی حیثیت سے اُمراؤجان کا قصہ سن رہے ہیں۔

امراؤ جان کا ماہرہ بڑی اہم چیز ہے مگر وہ کچھ بھی ہو وہ اپنی ایک بہت ہی بڑی بدقسمتی کی وجہ نے قصہ شروع ہونے سے پہلے ہی یہ بات بھی واضح کر دیتی ہے کہ پوری داستان کو ایک اخلاقی اور مذہبی نقطۂ نظر سے پیش کیا جا رہا ہے۔ امراؤ کو دنیا کی ہر کامیابی حاصل ہوئی مگر اس کا رنڈی ہونا بڑی بدنصیبی کی بات ہے کیونکہ رنڈی کی زندگی عصمت فروشی ہے اور اس سے زیادہ مخرب اخلاق کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی مگر مذہبی نقطۂ نظر سے وہ معافی کے قابل ہے کیونکہ وہ مظلوم ہے۔

گھریلو عورت کی غیر اہم مگر عصمت مآب زندگی بہت ہی زیادہ قدر کے قابل ہے۔ امراؤ اپنی ماں کی گھریلو زندگی کا حال بیان کر کے یہی کہتی ہے کہ اگر وہ بھی اسی طرح رہ جاتی تو بہت اچھا تھا۔ مگر اس امر کی طرف رسوا فی الحال توجہ نہیں دیتے۔ ان کی توجہ اس وقت اس ماحول کی طرف ہے جس میں امراؤ لائی گئی تھی یعنی خانم کا گھر۔ رسوا نے اس مقام میں ایک سچے مورخ کی حیثیت سے دلچسپی لی۔ وہ خود یہاں کے آنے جانے والوں میں تھے اور اس کی تنظیم، اس کی دلچسپیاں، اس کی شان اور اسکے اعلےٰ کلچر سے واقف تھے۔

امراؤ جان اس شاندار پرستان کو ان کی آنکھوں کے سامنے پھر سے زندہ کرتی ہے اور وہاں کی وہ باتیں بتاتی ہے جن سے رسوا نا واقف تھے۔ یہ عصمت فروشی کا بڑا اونچا کارخانہ ہے۔ عالیشان عمارت بڑے بڑے کمرے۔ ہر کمرے میں ایک بے نظیر چیز اور اس سے متعلق پورا عملہ الگ۔ سجاوٹ کامل، خوشی خرمی، ہنسی مذاق کا عالم پورے ماحول پر طاری ہے۔ یہ ایک درسگاہ بھی ہے۔ یہاں کی تجارت سے وابستہ فنون کا اعلیٰ ترین درس بھی یہاں دیا جاتا ہے۔ علم موسیقی کے ماہرین ملازم ہیں اور خود اس کارخانہ کی مالکہ بے مثل پرنسپل ہے۔ علوم کا درس بھی ضرور رکھا ہے تاکہ یہاں کی رنڈیاں اعلیٰ ظرف اعلیٰ مذاق رکھنے والوں کی صحبت میں رنگ جما سکیں گے

لائق ہوں۔ چنانچہ اگر اسے لکھنؤ کے تمام کلچر کی بہترین درسگاہ کہیں تو غلط نہ ہوگا۔ اور پھر یہاں قسم قسم کے لوگ آتے جاتے ہیں۔ چنانچہ تجربہ آموزی کا بھی یہ بڑا اہم مرکز ہے آجکل کے لوگ یہ سن کر ہنستے ہیں کہ لکھنؤ کے پرانے رئیس اپنے لڑکوں کو تہذیب سکھلانے کے لئے رنڈیوں کے گھروں میں چلمیں بھرنے کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔ اگر غور سے دیکھا جائے اور غیر جانبدارانہ رائے دی جائے تو واضح ہو جائے گا کہ آجکل کی کوئی درسگاہ صحیح تعلیم دلچسپ طریقہ پر بہم پہونچانے میں ان رنڈی خانوں سے لگا نہیں کھا سکتی۔ اس تعلیم گاہ میں ایک خاص اصول اور اخلاق برتا جاتا ہے اور مذہب کی طرف بھی اسی مخصوص قسم کی توجہ ہے جیسی کہ لکھنؤ میں ہوتی۔

خانم کے دل میں ترس بے حد ہے اور خوف خدا ہے اور اس کا اپنے مذہب میں بہت گہرا عقیدہ ہے وہ اسی جذبہ کے ساتھ تعزیہ داری کرتی اور اس کا امام حسین علیہ السلام سے ویسا ہی گہرا اور روحانی عقیدہ ہے جیسا کہ لکھنؤ کے کسی تہذیب یافتہ رئیس کو ہوگا۔ اور پھر یہاں ایک پوری کائنات ہے۔ جو ان بہشتی کا یہ مرکز ہے۔ ہر طبقہ ہر قوم و ہر پیشہ کے لوگ آتے رہتے ہیں۔ لکھنؤ کی زندگی کے مکمل مطالعہ کے لئے شاید اس سے بہترین جگہیں کم نکلیں گی۔

دنیا کا تجربہ سکھانے کا بہتر مدرسہ شاید ہی کوئی اور رہا ہو۔ مرزا محمد ہادی رسوا نے کہیں بھی تعلیم و تربیت پائی ہو مگر رسوا کو ناول نگاری کا مکمل درس دینے کے سلسلہ میں اور ان کا اچھی طرح کا کامل ناول نگار بنانے میں اس تعلیم گاہ کی بھی وہی اہمیت ہے جو ڈکنس کے لئے اس کو اس کا سا کامل ناول نگار بنانے میں لندن کی سڑکوں کی اہمیت تھی۔ وہ اس کی اہمیت کے قائل ہیں مگر اس کی عکس کشی سچے مورخ کی طرح کر رہے ہیں اور اس پر ایک مدرس اخلاق کی سی نظر ڈال رہے ہیں۔ اس تمام کارخانہ کی بنیاد پست ترین مقصد پر تھی۔ یعنی عصمت بیچ کر

پیسہ کمانا اور اس وجہ سے یہاں کی رہنے والیاں تمام آرام کے باوجود یہاں سے ہٹ ہی جانا چاہتی تھیں۔

یہاں کی ہر ایک رنڈی یہاں سے الگ ہی ہو جاتی ہے یہاں کا ہر ایک آنے والا یہاں سے نفرت ہی لے جاکر جاتا ہے۔ یہاں کا ہر ایک دست نگر اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہے جیسے کوئی شخص مٹی کے پیالے میں کھیر کھاکر پیالہ پھینک دے اس لئے یکبیتیا ہی کا مرکز ہے شیطان کا گھر ہے اور خدا کی بنائی ہوئی روح اس میں سے نکل بھاگنا ہی چاہتی ہے۔

امراؤجان اور رسوا دونوں اسی کی بہترین پیداوار ہیں مگر اس سے پورے طور پر نفرت کرتے ہیں۔ دونوں اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ رنڈی ہو جانا عورت کے لئے ذلیل ترین بات ہے اور رنڈی بازی مرد کے لئے سب سے بڑی بےغیرتی ہے اور اس کی سوسائٹی کی تباہی کا باعث ہے۔

چنانچہ تمام ناول میں دونوں کی جیت یہ ہے کہ گھریلو عورت کی زندگی کو رنڈی کی زندگی سے بہتر ثابت کریں اور عصمت کی اخلاقی اہمیت جتائیں۔ رسوا اہم مدرس اخلاق بھی ہیں اور بڑے فلسفی بھی۔ یوں تو امراؤ کا ہمیشہ لاشعوری رجحان بیوی گیری کی زندگی کی طرف ہے اور وہ ہر بیوی کو دیکھ کر رشک کرتی ہے مگر وہ اس تمام معاملے کو پوری طرح نہیں سمجھتی اور اکبر علی خاں کے گھر والے واقعہ کے بعد جب وہ اپنے ذلیل کئے جانے پر ناراضگی ظاہر کرتی ہے۔ تو رسوا مدلل طریقہ پر اس کو پورا فلسفہ سمجھا دیتے ہیں۔ وہ عورتوں کی مردوں کے تعلق کے لحاظ سے یہ تین قسمیں بتاتے ہیں۔ اوّل نیک بختیں، دوسری خرابیں، تیسری بازاریاں۔ ان سب کی وہ نہایت عمدہ منطقی اور فلسفیانی تحلیل پیش کرتے ہیں۔ ان سے متعلق مردوں کی بھی فطرت واضح کرتے ہیں۔ عیاشی کی طرف مردوں کے رجوع کو ان کی فطری جدت پسندی

بناتے ہیں اور جس سے معاشرت کے قانون کو اسے معیوب قرار دینے کی وجہ ظاہر کرتے ہیں۔ کسی جوان کو رنڈی کے گھر میں جاتے ہوئے جو عزت آتی ہے اس کا ذکر کرتے ہیں۔ امراؤ یہ کہتی ہے شہروں میں تو لوگ رنڈی کے گھر جانا معیوب نہیں سمجھتے تو رسوا کہتے ہیں۔ "خصوصاً دہلی اور لکھنؤ میں اور یہی ان شہروں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوا۔"

اب معلوم ہوتا ہے کہ لکھنوی معاشرت میں رنڈی خانوں اور رنڈی بازی کی کیا اہمیت ہے۔ اس عیاشی نے ہی عزت کھوئی اور جس معاشرت کھویا اور زندگی بکھر کر تباہ ہوگئی۔ رنڈی کا وجود لکھنؤ کی معاشرت میں بہت اہم تھا مگر یہ وجود زہر کی ایک پٹکی کی طرح تھا جس نے تمام معاشرت کو مار ہی ڈالا۔ اس اخلاقی فلسفہ کو پوری ناول میں جو اہمیت ہے اس کا پتہ امراؤ جان کے خط سے لگ جاتا ہے وہ لکھتی ہے

"تمام قصہ میں وہ تقریر آپ کی مجھے بہت ہی دلچسپ معلوم ہوئی جہاں آپ نے نیک بختوں اور خراب عورتوں کا مقابلہ کرکے ان کا فرق بتایا ہے۔ نیک بخت عورتوں کو جس قدر فخر ہو زیبا ہے اور ہم ایسی بازاریوں کو ان کے اس فخر پر بہت ہی رشک کرنا چاہیئے۔"

یہاں تک تو عام فلسفہ اخلاق ہے مگر امراؤ جان کا خیال کرتے ہوئے ایک خیال کر لینا اور ضروری ہے وہ لکھتی ہے "مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ اس باب میں بخت و اتفاق کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ میری خرابی کا سبب دہی دلاور خاں کی شرارت تھی۔ نہ وہ مجھے اٹھا لاتا اور نہ اتفاق سے خانم کے ہاتھ فروخت ہوتی نہ میرا یہ لکھا ہوتا۔"

اسے قسمت نے رنڈی بنایا مگر وہ اس پیشہ کو عیب سمجھتی ہے اور جو ہو گیا اسے بدل نہیں سکتی۔ مگر اس کا تجربہ اور اس کی مثال رنڈی بازی کے خلاف ایک سخت وعظ

ضرور ہے یہی اس کے قصہ کی اہمیت ہے۔ یہ اخلاقی نتیجہ رسوا اس قدرتی طریقہ پر پیش کرتے ہیں کہ فن کاری کا پورا حق ادا کر دیتے ہیں۔ قصوں میں خواہ مخواہ کے اخلاقی فلسفے اور سیاسی پروپیگنڈے کی ٹھونس ٹھانس کرنے والوں کو ان سے سبق لینا چاہیئے۔

رسوا کی خاص توجہ فلسفہ اخلاق و معاشرت کے اس پہلو کی طرف ہے مگر ان کا مکمل فلسفہ اخلاق و مذہب بھی ان کی امراؤ سے باتوں میں نمایاں ہو جاتا ہے۔ امراؤ اکبر علی خاں کی جعلسازی بیان کرنے کے بعد یہ بتاتی ہے کہ بُرے آدمی بھی بالکل بُرے نہیں ہوتے کسی نہ کسی سے بھلے ضرور ہو جاتے ہیں اور پھر اکبر علی خاں کے بابت یہ کہتی ہے کہ ان کو تعزیہ داری سے عشق تھا۔ رمضان اور محرم میں وہ اس قدر نیک کام کرتے تھے جس سے ان کے سال بھر کے گناہوں کی تلافی ہو جاتی تھی۔ تو رسوا نہایت زور کے ساتھ کہتے ہیں "یہ معاملہ ایمان کا ہے اس لئے مجھے اتنا کہہ لینے دیجیے کہ یہ اعتقاد صحیح نہیں ہے" امراؤ بھی ان کی تائید کرتی ہے تو وہ بتاتے ہیں۔

"عقلمندوں کے گناہوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا اثر اپنی ہی ذات تک رہتا ہے اور دوسرے وہ جن کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ میری رائے ناقص میں۔ پہلی قسم کے گناہ صغیرہ اور دوسری قسم کے کبیرہ ہیں۔ امراؤ جان یاد رکھو۔ مردم آزاری بہت ہی بری چیز ہے۔ اس کی بخشش کہیں نہیں ہے۔ اور اگر اس کی بخشش ہو تو معاذاللہ خدا کی خدائی بےکار ہے"

یہاں وہ لکھنؤ کے عام مذہبی اور اخلاقی عقیدہ پر زوردار ضرب لگا رہے ہیں۔ وہ معمولی آدمی نہیں وہ مذہب و اخلاق کو بھی سچے فلسفی کی نظر سے دیکھتے ہیں وہ پکے مسلمان اور پکے شیعہ ہیں۔ وہ مذہبی اصول کا دخل ہر بات میں ضروری سمجھتے ہیں کیونکہ اس میں کوئی فرد گذاشت نہیں کی گئی۔ وہ بڑے مذہبی آدمی تھے۔

امراؤجان ادا میں بھی جہاں مذہبی معاملات آ گئے ہیں وہاں کی بات میں ایک خاص زور پیدا ہو گیا ہے۔ وہ ان معاملات میں غور و خوض کے عادی تھے اور اپنے فلسفی اور منطقی رجحان کی بنا پر صحیح اور صاف نتائج پر پہنچتے تھے۔ تقدیر ہی کا مسئلہ لے لیجئے جس کی امراؤجان کے قصے میں بڑی اہمیت ہے۔ اس کی سرگزشت تقدیر کو ثابت کرتی ہے مگر تقدیر پر وہ جاہلانہ عقیدہ جو عام ہے اس کو امراؤ نے اپنے خط میں واضح کر دیا ہے۔ وہ ان لوگوں کا ذکر کرتی ہے جو بدکاریاں یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ جو تقدیر میں ہوگا ہو رہے گا اور اس کے بابت لکھتی ہے "یہ لغو گفتگو ان کے زمانے میں کسی قدر بامعنی بھی تھی کیونکہ اس زمانے میں اتفاق سے گھڑی بھر میں کچھ کا کچھ ہو جایا کرتا تھا" اور رسوا ہی کی ایک روایت بیان کر کے کہتی ہے "اس زمانہ میں تقدیر کا زور نہیں چلتا جو کچھ ہوتا ہے تدبیر سے ہوتا ہے" غرض رسوا اپنی پوری مفکرانہ سنجیدگی امراؤ سے باتوں میں ظاہر کر دیتے ہیں۔

مگر یہ واضح رہے کہ وہ زاہد خشک اور معلم اخلاق کہیں نہیں ہیں۔ وہ رسوا ہیں لکھنوی ہیں۔ خاتم کے اس کارخانہ کی پیداوار جو لکھنوی تہذیب کا اہم مرکز تھا۔ امراؤ رنڈی کے دائرے سے نہیں نکل سکتی تو وہ بھی رسوا کے دائرے سے باہر نہیں آ سکتے وہ بڑی دل لگیوں اور دلچسپیوں کے آدمی ہیں۔ عیاشی ان کی فطرت ثانوی ہے۔ امراؤ کی صحبت ان کی زندگی کی سب سے بڑی دلچسپی ہے۔ اس صحبت میں اب جسمانی عنصر بالکل غائب ہے اور امراؤ کے حسن ظاہری سے زیادہ اس کے ذہن اس کے تجربے اور اس کے ادبی ذوق سے انہیں دلچسپی ہے۔ دونوں میں بڑے اعلیٰ ذہنی سطح پر باتیں ہوتی ہیں۔ زیادہ تر تو شعر و شاعری ہی چلتی ہو مگر رسوا اسے اپنے چھپے ہوئے راز بھی بیباکانہ طور پر بیان کرنے کے لئے مجبور کر لیتے ہیں۔ یہ کہہ کر کہ "پڑھے لکھوں میں ایسی بے جا شرم نہیں چاہیے"

اس کے حسن کی تعریف بھی کر جاتے ہیں اس کے ساتھ ہنستے بھی ہیں۔ اس کے اہم مشاہدات کی ماہر نفسیات کی حیثیت سے نکتہ چینی بھی کرتے جاتے ہیں۔ کبھی اس پر چوٹ کر جاتے ہیں اور وہ ناز میں آجاتی ہے۔ بسم اللہ کے عاشق فاضل مولوی صاحب کی محبت میں حماقت پر ہنسنے سے انکار کرتے ہیں اور ان کی محبت کو پاک ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اُمراؤ کی مختلف نشتوں میں دلچسپی پر چہل چہل کر باتیں کرتے ہیں۔ لکھنؤ سے باہر والوں کی زبان دانی پر امراؤ کہتی ہے "جو صاحب لکھنوی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے کہئے پہلے اپنی زبان کی نوچ نکالیں" تو تعریف کرتے ہیں "کیا خوب بات کہی ہے۔ واقعی روزمرہ تو کسی قدر آبھی جاتا ہے مگر لہجہ نہیں آتا۔"

وہ غدر کا بیان کرتی ہے تو یہ تاریخ داں کی حیثیت سے واقعات کی صحیح تاریخیں بتاتے جاتے ہیں۔ کبھی اس کے بابت عام افواہوں کی تصدیق کرتے ہیں کبھی اس کے کسی تعجب انگیز تجربہ پر اظہار تعجب کرتے ہیں۔ کبھی اپنی حسن پرستی اور تماش بینی پر یہ کہتے ہیں "سنو اُمراؤجان میری ایک بات یاد رکھنا۔ جہاں کوئی حسین عورت نظر پڑے مجھے ضرور یاد کر لینا اگر ممکن ہو تو امیدواروں میں نام لکھوا دینا اور جو میں مر جاؤں تو میرے نام پر فاتحہ دیدینا" اور آگے چل کر اپنی عشق بازی کے بابت کہتے ہیں۔

"اُمراؤجان میری زندگی کا ایک اصول ہے۔ نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں بہن کے برابر سمجھتا ہوں۔ مگر فیاض عورتوں کے فیض سے مستفید ہونا میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں" غرض کہ دونوں کی عجیب دلچسپ صحبت ہے۔ ناولوں میں اکثر اعلیٰ ظرف اعلیٰ ذہن لوگوں کی لطیف محبتوں کے بیان ملتے ہیں۔ مگر اس قدر لطیف محبت شاید ہی کہیں دکھائی دے۔ اُمراؤجان اور رسوا سچ مچ ایک روح اور دو قالب ہیں۔ ان کی باتوں میں عجیب پیار محبت ہے اور ایک عجیب لطیف SUBTLE مزاح ہے۔ یہ

سرشار کی بذلہ سنجی نہیں ہے بلکہ وہ اعلیٰ درجہ کا مذاق ہے۔ جو لکھنؤ کے ہی نہیں بلکہ دنیا کے سب ہی اعلیٰ کلچر یافتہ لوگوں کے درمیان ہوتا ہے اور جس کا پورا لطف اٹھانے کے لئے اعلیٰ کلچر کی ضرورت ہے۔ یہ تمام مکالمے مل جل کر ایک عمدہ نفسیاتی سوشل ڈرامہ پیش کرتے ہیں۔ اور جس کا نہایت موزوں خاتمہ وہ خط ہے جو امراؤ جان اور رسوا کی ذہنی محبت کا سچا وصال ہے۔ اس میں لکھنؤ اور سارے ہندوستان کی زندگی کے بابت وہ اہم نفسیاتی نتائج ہیں جو لکھنؤ کی ایک جنسی عورت اور ایک مرد نے مل جل کر اپنے گہرے تجربے اخذ کئے ہیں۔ فلسفہ حیات کے پیش کرنے میں بھی "امراؤ جان ادا" ناول کی فنکاری کی اعلیٰ مثال ہے۔

(۷)

اس ناول میں فنکاری کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہوا ہے۔ یہ طرز ادا کی خوبیوں سے بھی مالا مال ہے۔ سرشار مکالمے اچھے لکھ لیتے ہیں۔ اور ان کے ذریعہ اپنے کردار کو زندہ کر لیتے ہیں۔ شرر بیانات میں اپنا زور طبع دکھاتے ہیں اور ان کے ذریعہ ماحول کو روشن کر لیتے ہیں مگر مرزا صاحب دونوں معاملوں میں دونوں سے زیادہ فنکارانہ توجہ کا ثبوت دیتے ہیں اور اسی لئے دونوں سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔

بیانات کی طرف مرزا صاحب کی ہمیشہ خاص توجہ رہی اور ہونا بھی چاہیئے تھی۔ کیونکہ انشا پردازی کا مذاق رکھنے والے کے لئے ناول میں ہی میدان ہے۔ اردو میں جو ناولیں لکھی جارہی تھیں ان میں بھی بیانات کی فراوانی تھی اور انگریزی کی اچھی بری جو بھی ناولیں یہاں بک رہی تھیں ان میں بھی بیانات ہی بیانات نظر پڑتے تھے چنانچہ رسوا نے اپنی اور تمام ناولوں میں طویل بیانات کی اسطرح بھرمار کی ہو کہ اکثر یہ بیانات قصہ پر چھا کر بے مزہ ہو جاتے ہیں اور اگر ان کی صاف سلیس اور شیریں زبان کا لطف نہ

ہو تو پڑھے بھی نہ جائیں۔ مگر "امراؤ جان ادا" میں بیانات اور مکالموں کے درمیان نہایت لطیف توازن ہے اور ہر بیان بذات خود دلآویزی اور اختصار کی مثال ہے۔ مثلاً خانم کے گھر کا بیان۔

"مرزا رسوا صاحب خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہوگا، کس قدر وسیع تھا کتنے کمرے تھے ان سب میں رنڈیاں رہتی تھیں۔ بسم اللہ خورشید میری ہمجنسیں تھیں۔ ان کی ابھی رنڈیوں میں گنتی نہ تھی۔ ان کے علاوہ دس گیارہ ایسی تھیں جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں۔ ہر ایک کا عملہ جدا تھا ہر ایک کا دربار علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوبصورت تھی۔ سب گہنے پاتے سے آراستہ ہر وقت بنی ٹھنی تلواں جوڑے پہنے سادے سادے کپڑے جو ہم لوگ روزمرہ پہنتے رہتے تھے وہ اور رنڈیوں کو عید بقرعید میں نہیں نصیب ہوتے۔ خانم کا مکان تھا یا ایک پرستان جس کمرے میں جا نکلو سوائے ہنسی مذاق گانے بجانے کے کوئی اور چرچا نہ تھا۔

یا گوہر مرزا کا بیان۔

"گوہر مرزا حد درجہ کا شریر بد ذات سب لڑکیوں کو چھیڑا کرتا تھا۔ کسی کو منہ چڑھا دیا۔ کسی کے چٹکی لے لی، اس کی چوٹی پکڑ کے کھینچ لی، اس کے کان دکھا دیئے دو لڑکیوں کی چوٹی ایک میں جکڑ دی۔ کہیں قلم کی نوک توڑ ڈالی۔ کہیں کتاب پر دوات الٹ دی غرض کہ اس کے مارے ناک میں دم تھا۔ لڑکیاں بھی خوب دھپیاتی تھیں اور مولوی صاحب بھی قرار واقعی سزا دیتے تھے مگر وہ اپنی آئی بانی سے نہ چوکتا تھا۔ سب سے زیادہ میری گت بناتا تھا کیونکہ میں سب سے انیلی اور گینگی سی تھی اور مولوی صاحب کے دباؤ میں بھی رہتی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے کہہ کہہ کے مار پٹوائی

مگر بے غیرت کسی طرح باز نہ آیا۔ آخر میں بھی چٹکیاں کھاتے کھاتے عاجز آ گئی۔ میری فریاد پر مولوی صاحب اس کو بہت ہی بیدردی سے سزا دیتے تھے کہ خود مجھے ترس آجاتا تھا۔"

یا منظر کشی اور اس میں ایک فرد کی نفسیاتی حالت۔

"برسات کے دن ہیں آسمان پر گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ پانی تل دھار اوپر دھار برس رہا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہا ہے۔ میں بوا حسینی کی کوٹھری میں اکیلی پڑی ہوں۔ بوا حسینی خانم کے ساتھ حیدری کے گھر گئی ہوئی ہیں چراغ گل ہو گیا ہے اور اندھیری وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔

اور کمروں میں جشن ہو رہے ہیں کہیں سے گگانے کی آواز آرہی ہے کہیں قہقہے اڑ رہے ہیں ایک میں ہوں کہ اس اندھیری کوٹھری میں اپنی تنہائی پر رو رہی ہوں کوئی آس پاس نہیں۔ دل پر جو گذر رہی ہے دل ہی جانتا ہے۔ جب بجلی چمکتی ہے مارے ڈر کے دُلائی سے منہ ڈھانپ لیتی ہوں۔ جب گرج کی آواز آتی ہے کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہوں۔ اسی عالم میں آنکھ لگ گئی۔ اتنے میں یہ معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میری گھگھی بندھ گئی منہ سے آواز تک نہ نکلی اور آخر کار میں بے ہوش ہو گئی۔"

یا کسی مجمع کا ایک خاص نقطۂ نظر سے بیان۔

"میلے میں وہ بھیڑ جمع تھی کہ تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے۔ جا بجا کھلونے والوں مٹھائی والوں کی دکانیں خوانچہ والے میوہ فروش۔ ہار والے، تنبولی اور سقے۔ غرض جو کچھ میلوں میں ہوتا ہے سب کچھ تھا۔ مجھے تو اور کسی چیز سے کچھ کام نہیں لوگوں کے چہرے دیکھنے کا ہمیشہ سے شوق ہے۔ خصوصاً میلے تماشوں میں خوش ناخوش، بے وقوف، عقلمند، عالم، جاہل، شریف، رذیل، سخی، بخیل یہ سب چہرے

سے کھل جاتا ہے۔ ایک صاحب ہیں کہ وہ اپنے نستزیب کے انگرکھے اور اودی صدری نکہ دار ٹوپی۔ چست گھٹنے اور مخملی جوتے پر اتراتے چلے جارہے ہیں کوئی صاحب صندلی رنگا ہوا دوپٹہ سر سے آڑا باندھے ہوئے رنڈیوں کو گھورتے پھرتے ہیں۔

یا اہم نفسیاتی مسائل کا دلکش بیان۔

"محبت کے باب میں مرزا معاف کیجئے گا۔ اکثر بے وقوف عورتیں بہت ہی چالاک ہوتی ہیں۔ اکثر مرد سچے دل سے اظہار عشق کرتے ہیں اور اکثر عورتیں جھوٹی محبت جتاتی ہیں۔ اس لئے کہ مرد جس حالت میں اظہار عشق کرتے ہیں وہ حالت ان کی اضطراری ہوتی ہے اور عورتیں بہت جلد متاثر نہیں ہوتیں کیونکہ مرد بہت ہی جلد عورتوں کے حسن ظاہری پر فریفتہ ہو کر ان پر شیدا ہو جاتا ہے اور عورتیں اس باب میں زیادہ احتیاط کرتی ہیں۔ اسی لئے مردوں کی محبت کسی قدر سریع زوال اور عورتوں کی محبت عسیر الزوال۔ مگر جانبین کے حسن معاشرت سے ان امور میں ایک خاص قسم کا اعتدال پیدا ہو سکتا ہے۔"

یہ چند مثالیں اس قسم کے طرز کی ہیں جسکا کمال "امراؤ جان ادا" میں ملتا ہے لکھنؤ کو جہاں یہ فخر حاصل ہے کہ میرؔ اور میر حسنؔ کے نظم کی طرز کو میر انیسؔ نے کمال پہ پہنچوایا وہاں یہ بھی فخر ہوتا ہے کہ سر سید اور نذیر احمد کے طرز نثر کو رسواؔ نے کامل کیا اگرچہ ان کی اس طرف توجہ ویسی ہی نہیں ہے جیسی کہ میر انیسؔ کی تھی۔ مگر پھر بھی جس کسی کو بھی ناول نگاری کے لئے اپنی طرز پختہ کرنا ہے وہ "امراؤ جان ادا" کو حفظ کرلے مرزا صاحب کے مکالموں میں بھی طرز کا کمال نظر آتا ہے عام طور پر ان کے

مکالموں میں وہ جان اور وہ شگفتگی نہیں ہے جو سرشار کے مکالموں میں ملتی ہے۔ حالانکہ طرز میں وہ ہر جگہ سرشار سے آگے ہیں مگر بعض جگہ تو مکالموں کے ذریعہ وہ گہرا نفسیاتی اثر قائم کیا ہے کہ سرشار ان کو چھو بھی نہیں سکتے ہیں۔ یہاں ہم ایک ایسا ٹکڑا پیش کرتے ہیں جو ایک کمال کے نفسیاتی بیان سے شروع ہوتا ہے اور پھر اس میں مکالمہ کا وہ کمال ہے جس میں رسوا اپنے عروج پر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ مثال بیان اور مکالمے کو توازن کے ساتھ برتنے کی بھی مثال ہے اور ان دونوں فنون کے ذریعہ انسانی نفسیات کی تحلیل کی بھی اردو میں بہترین مثال ہے۔

نواب صاحب کے گھر سے آنے کے بعد شب کو بسم اللہ کے کمرے میں جلسہ ہے۔ میاں حسنو نواب صاحب کے خاص کارکن، مصاحب اور دوست جاں نثار۔ جہاں نواب صاحب کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے والے تشریف رکھتے ہیں۔ آج ہی کچھ نہیں آئے ہیں پہلے بھی نواب کی چوری چھپے آیا کرتے تھے۔ مگر آج کھلے خزانے بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھے ہیں۔

اس وقت آپ بسم اللہ جان پر گویا بے شرکت واحدے و بے مزاحمت غیرے قابض ہیں نوکری کی گفتگو ہو رہی ہے۔

حسنو:۔ دیکھو بسم اللہ جان نواب سے تو اب کوئی امید نہ رکھو۔ میں جو کچھ کہو وہ دے دیا کروں۔ غریب آدمی ہوں زیادہ تو میری اوقات نہیں جو نواب صاحب دیتے تھے اس کا نصف بھی ممکن نہیں مگر ہاں کسی نہ کسی طرح آپ کو خوش رکھوں گا

بسم اللہ:۔ غریب آدمی ہو۔ یہ نہیں کہتے کہ نواب کی دولت کاٹ کے گھر میں بھرلی اور پھر ہم سے غریبی بیان ہوتی ہے ایسے غریبوں کو تاؤ تو نومن چربی سے کم نہ نکلے۔

حسنو :- ہیں ہیں - تم تو ایسا نہ کہو نواب کے پاس تھا ہی کیا جو گھر بھر لیتا - کیا میری والدہ کے پاس کچھ کم تھا -

بسم اللہ :- آپ کی والدہ صاحبہ بوا فرخندہ نواب سرفراز محل کی خاصہ والیوں میں تھیں نا"

حسنو :- (جھینپ کر) وہ کوئی ہوں جب مری ہیں تو کوئی چار ہزار کا زیور چھوڑ کے مری ہیں -

بسم اللہ :- وہ آپ کی بیوی لے یار کے ساتھ نکل گئیں - آپ کے پلے کیا پڑا - میرے آگے ذرا شیخی نہ بگھاریئے - مجھے رتی رتی آپ کا حال معلوم ہے -

حسنو :- تو والد کے پاس کچھ کم تھا -؟

بسم اللہ :- والد آپ کے نواب حسین علی خاں کے چڑی ماروں میں تھے -

حسنو :- چڑی ماروں میں -؟

بسم اللہ :- اچھا وہ مرغ بازوں میں سہی -

حسنو :- مرغ بازوں میں تھے ؟

بسم اللہ :- اچھا بٹیر باز سہی - تھا تو چڑی مار کا کام -

حسنو :- لیجئے آپ تو مذاق کرتی ہیں -

بسم اللہ :- میں کھری کہتی ہوں اس لئے مشہور ہوں اور کہتی بھی نہ تمہارے چھورے پن پر جی جل گیا - یوں تو تم آتے تھے میں نے کبھی منع نہیں کیا - آج ہی تو نواب پر یہ واردات گذری آج ہی تم نے میرے منہ در منہ نوکری کا پیغام دیا - ہوش کی دوا کرو تم کیا نوکر رکھو گے یہی ایک مہینہ دو مہینہ تین مہینے سہی -

حسنو :- چھ مہینہ کی تنخواہ جمع کر دوں -

بسم اللہ :- زبان سے -

حسنو:۔ یہ لو (سونے کے جڑاؤ کڑے کمر سے نکال کے) تمہارے نزدیک کتنے کا مال ہوگا۔

بسم اللہ:۔ میں دیکھوں (کڑے حسنو کے ہاتھ سے لے کے اپنے ہاتھوں میں پہن لئے) کل چھنا مل کے لڑکے کو دکھاؤں گی مگر بنے اچھے ہیں۔ اچھا آپ تشریف لے جائیے۔ اس وقت مجھے چھٹن جی نے بلا بھیجا ہے۔ ٹھہر نہیں سکتی کل اسی وقت آئیے گا۔

حسنو:۔ تو کڑے اتار دیجئے۔

بسم اللہ:۔ یا اللہ۔ کوئی چور دوں سے بھاگا رہے۔ تمہارے کڑے کچھ کھا نہ لوں گی! اس وقت میرے ہاتھ میں سادی چوڑیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اماں جان سے چھپ کے جاتی ہوں۔ ان سے کڑے مانگوں گی تو کہیں گی کیا کرو گی۔ اس لئے ذرا ہاتھ میں ڈال لئے۔ صبح کو لے جانا۔؟

حسنو:۔ کڑے دے دیجئے میرے نہیں ہیں۔ نہیں تو کیا بات تھی! تم پر سے صدقے کئے تھے۔

بسم اللہ:۔ تو کیا آپ کی اماں کے ہیں۔ انہوں نے انتقال کیا پھر بھی آپ کا مال نہیں۔

حسنو:۔ میں نے یوں ہی تمہیں دکھائے تھے، میرا مال نہیں ہے؟

بسم اللہ:۔ جیسے میں پہچانتی ہی نہیں! یہ وہی کڑے ہیں جو نواب نے اس روز میرے سامنے گرو ی رکھنے کو دیئے تھے۔

حسنو:۔ لو اور سنو! یہ کب؟

بسم اللہ:۔ یہ جب کہ جس دن بہن امراؤ کے مجرے کی فرمائش ہوئی تھی۔ بہن امراؤ نے ضد کی کہ نہیں پورے سو لوں گی۔

نواب کے پاس خرچ نہ تھا۔ میرے صندوقچہ سے کپڑے نکال کے پھینک دیئے (پھر میری طرف مخاطب ہو کے دیکھا) بہن امراؤ یہ وہی کپڑے ہیں نا۔

میں :۔ مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ کیا تم جھوٹ کہو گی۔

بسم اللہ :۔ لے خشکا کھائیے۔ اب یہ کپڑے آپ کو نہ دیئے جائیں گے! نواب کے کپڑے ہیں۔ ہم نے پہچانے اب ہم نہ دیں گے۔

حسنو :۔ لو اچھی کہی۔ اور وہ روپے جو ہم نے دیئے ہیں۔

بسم اللہ :۔ روپے تم کہاں سے لائے وہ بھی نواب کا مال تھا۔

حسنو :۔ جی ہاں ہیچ۔ مہاجن سے بیاز پر لا کے دیئے تھے۔

بسم اللہ :۔ اچھا تو مہاجن کو بھیج دیجئے، ہم اس کو روپے دے دیں گے آپ ہٹیئے۔

حسنو :۔ کپڑے تو میں لے جاؤں گا۔

بسم اللہ :۔ میں تو نہ دوں گی۔

حسنو :۔ تو کچھ زبردستی ہے۔

بسم اللہ :۔ جی ہاں زبردستی ہے۔ لے اب چپکے سے کھسک جایئے نہیں تو ....

حسنو :۔ اچھا تو رہنے دیجئے کل ہی دید یجئے گا۔

بسم اللہ :۔ کل دیکھا جائے گا۔

"دیکھا جائے گا" بسم اللہ نے اس تیور سے کہا کہ میاں حسنو کو چپکے سے اٹھ کے جانا ہی پڑا۔

یوں ایک نہایت عمدہ ڈرامائی سین پیش ہوتا ہے۔ رسوا کی ڈرامائی قوتیں بھی قابل توجہ ہیں اور امراؤجان ادا میں ایسی مثالیں کثرت سے ملیں گی جن میں

انہوں نے ان قوتوں کا ثبوت دیا ہے مگر شاید اس سے بہتر مثال کوئی نہ ملے اور شاید تمام اُردو ناولوں میں نہ ملے۔ جس کمال کے ساتھ رسوا اور بسم اللہ کے درمیان تصادم کے ذریعہ دونوں کی نفسیات کو روشن کیا گیا ہے وہ اُردو میں ڈرامائی فنکاری کا سب سے بڑا کرشمہ ہے۔

(۸)

"امراؤ جان ادا" کے سب ہی مداح نظر آتے ہیں مگر اس کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی کہ دینا چاہیئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُردو میں ابھی ناول کے فن کا مذاق نہیں پیدا ہوا ہے۔ نقاد کچھ ٹکے بندھے اصول لگا لینا چاہتے ہیں ورنہ ان کی بھی دلچسپی اس سے محض عام ہی لوگوں کی سی ہے۔ ناول ایک خاص صنف نثر ہے جس میں نفسیاتی دلچسپی، ڈرامائی تصادم اور پیچیدگی قرین قیاس کردار نگاری کو ایک مخصوص فارم یا سانچے میں ڈھال کر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ واقفیت کا اثر پیدا ہو۔

"امراؤ جان ادا" ہی اُردو کی ایک ناول ہے جو اس تعریف پر ہر طرح پوری اُترتی ہے۔ اس میں ڈرامائی پیچیدگی COMPLEXITY کی کچھ کمی ضرور محسوس ہوتی ہے مگر یہ کمی اتنی نہیں کہ یہ ناول کے دائرے میں نہ لائی جا سکے۔ رسوا کا اپنے کردار کے جذبات پر قابو کچھ ضرورت سے زیادہ سخت ضرور معلوم ہوتا ہے۔ وہ اہم واقعات کی گہری نفسیاتی تحلیل کرنے سے قاصر ضرور نظر آتے ہیں اور ان کی قوت تخیل اس قدر زیادہ زور دار نہیں ہے کہ وہ اعلیٰ ترین فنکاروں میں گنے جائیں۔ یا وہ زندگی کے اتنے گہرے نقاد نہیں ہیں کہ غالب کی طرح کہہ سکیں[1]۔ مگر پھر بھی ان کی یہ ایک تصنیف ناول نگاری کی مستقل بنیاد ضرور قائم کر دیتی ہے۔ رچارڈسن کی "پمیلیہ"

---

[1] غاریا از اثر گرمی رفتارم سوخت!

سے کسی طرح کم نہیں ٹھہرتی۔ اور جس طرح یہ ناولیں انگریزی ناول نگاری کی سنگ بنیاد دیکھنے کے لائق ہیں۔ اسی طرح "امراؤ جان ادا" کو بھی اُردو کی پہلی ناول سمجھنا ضروری ہے۔ اس کی واقعیت اس کی تشکیل اس کی کردار نگاری، اس میں اس کے لکھنے والے کی ہستی اور اس کے فلسفۂ حیات کا مظاہرہ، اس کے بیانات و مکالمے غرض اس کی ہر چیز اس درجہ پر پہونچی ہوئی ہے کہ ناول کے ہر ناظر کو اپنا مذاق پختہ کرنے کے لئے اسی سے شروع کرنا چاہیئے اور ناول کے ہر فنکار کو اس پر ہی حاوی ہو کر قدم آگے بڑھانا چاہیئے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رسوا کو اُردو ناول نگاری کا بانی کہنا چاہیئے۔ جس طرح رچرڈسن انگریزی ناول کا بانی کہا جاتا ہے۔ یہ کہتے ہوئے کچھ جھجک محسوس ہوتی ہے اس کی دو وجہیں ہیں۔ اول یہ کہ کسی فن کا بانی وہ ہوتا ہے جس کی تمام توجہ اپنے فن کی طرف ہو اور اس کے تمام کارنامے اس فن کی اگر اہم نہیں تو اچھی مثال ضرور ہوں۔

رسوا کی "امراؤ جان ادا" کے علاوہ ناولیں پست ہیں، خشک ہیں اور نہایت غیر دلچسپ ہیں۔ اس لئے اگر ہم ان کو اُردو ناول کا بانی یعنی اُردو کا پہلا مثالی ناول نگار سمجھیں گے تو ہم ان کی دوسری ناولوں کو بھی اہمیت دے جائیں گے اور اسطرح صحیح راہ سے بھٹک جائیں گے۔ دوسرے کسی بانی کے لئے اپنے فن سے گہرا عشق یعنی اپنے فن پر اعتماد اور اس کی اہمیت کا نفسیاتی ہونا ضروری ہے تاکہ وہ اپنے فن کی محض بنیاد ہی نہ رکھے بلکہ اس بنیاد کو مستحکم کر کے ایک ایسی تعمیر ضرور چھوڑ جائے جس کی صنعت کو اعلیٰ مذاق والے سمجھ کر لطف اندوز ہوں اور عوام محض دیکھ کر ہی خوش ہو جائیں۔

پورا فاتح وہی ہے جو کسی ملک کو فتح کرنے کے بعد اپنا اقتدار بھی قائم کرے

اور فتح شدہ ملک کی تمام رعایا اس کے حکم کو اٹل مان لے۔ مرزا رسوا کو ناول کے فن سے زیادہ اور علوم اور فنون سے عشق تھا۔ "امراؤ جان ادا" سے انہوں نے ایک اقلیم پہ فتح ضرور پائی مگر یہ فتح اتفاقی ہی کہی جائے گی۔ کیونکہ اس کے بعد انہوں نے کوئی ایسی چیز نہیں پیش کی جو رچرڈسن کی شاہکار "کلیرسا ہارلو" یا فیلڈنگ کی "ٹام جونس" کی طرح مکمل شاہکار ہوتی۔ اس لئے مرزا رسوا کو بھی اُردو ناول کا جدِ امجد نہیں کہا جا سکتا۔ ہاں "اُمراؤ جان ادا" اُردو ناول نگاری کی سنگِ بنیاد ضرور ہے اور ہمیشہ مانی جائے گی۔!!

اُمراؤجان ادا

(ناول)

ہم کو بھی کیا کیا مزے کی داستانیں یاد تھیں
لیکن اب تمہیدِ ذکرِ دردِ ماتم ہو گئیں

ناظرین! شانِ نزول اس قصہ کی یہ ہے کہ دس بارہ برس کا ذکر ہے کہ میرے ایک دوست منشی احمد حسین صاحب اطرافِ دہلی کے رہنے والے بطریقِ سیر و سیاحت لکھنؤ تشریف لائے تھے۔ انہوں نے چوک میں سید حسین کے پھاٹک کے پاس ایک کمرہ کرایہ پر لیا تھا۔ یہاں اکثر احباب سرِ شام آ بیٹھتے تھے۔ بہت ہی لطف کی صحبت ہوتی تھی۔ منشی صاحب کا مذاق شعر فہمی اعلیٰ درجہ کا تھا۔ خود بھی کبھی کبھی کچھ کہہ لیتے تھے اور اچھا کہتے تھے۔ لیکن زیادہ تر ان کو سننے کا شوق تھا۔ اس لیے اکثر شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا۔ اسی کمرہ کے برابر ایک اور کمرہ تھا اس میں ایک طوائف رہتی تھی۔ بود و باش کا طریقہ اور رنڈیوں سے بالکل علیحدہ تھا۔ نہ کبھی کسی نے کمرہ پر سرِ راہ بیٹھتے دیکھا۔ نہ وہاں کسی کی آمد و رفت تھی۔ دروازوں میں دن رات پردے پڑے رہتے تھے۔ چوک کی طرف نکاس کا راستہ بالکل بند رہتا تھا۔ گلی کی جانب ایک اور دروازہ تھا۔ اسی سے نوکر چاکر آتے جاتے تھے۔ اگر کبھی کبھی رات کو گانے کی آواز نہ آیا کرتی تو یہ بھی معلوم نہ ہوتا کہ اس کمرہ میں کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔ جس کمرہ ہم لوگوں کی نشست تھی اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی لگی تھی مگر اس میں کواڑ پڑا ہوا تھا۔

ایک دن حسبِ معمول احباب کا جلسہ تھا۔ کوئی غزل پڑھ رہا تھا۔ احباب داد دے رہے تھے۔ اتنے میں میں نے ایک شعر پڑھا۔ اس کھڑکی کی طرف سے واہ واہ کی آواز آئی۔ میں چپ ہو گیا اور احباب بھی اسی طرف متوجہ ہو گئے۔ منشی احمد حسین نے پکار کے کہا: غائبانہ تعریف ٹھیک نہیں۔ اگر شوقِ شعر و سخن ہے تو جلسہ میں

تشریف لائیے۔" اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ میں پھر غزل پڑھنے لگا۔ بات رفت گذشت ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک 'مہری' آئی۔ اس نے پہلے سب کو سلام کیا پھر یہ کہا "مرزا رسوا صاحب کون ہیں؟ احباب نے مجھے بتا دیا۔ مہری نے کہا: "بیوی نے ذرا آپ کو بلایا ہے۔" میں نے کہا "کون بیوی؟" مہری نے کہا: "بیوی نے کہہ دیا ہے نام نہ بتانا۔ آگے آپ کا جو حکم ہو۔" مجھے مہری کے ساتھ جانے میں تامل ہوا۔ احباب مجھ سے مذاق کرنے لگے: "ہاں صاحب کیوں نہیں، کبھی کی صاحب سلامت ہے۔ جب تو اس طرح بلا بھیجا۔" میں دل میں غور کر رہا تھا کہ کون صاحب ایسے بے تکلف ہیں۔ اتنے میں ادھر مہری نے کہا کہ "حضور! بیوی آپ کو اچھی طرح جانتی ہیں جب تو بلا بھیجا ہے۔" آخر جانا ہی پڑا۔ جا کر جو دیکھا معلوم ہوا۔ آہا امراؤ جان تشریف رکھتی ہیں۔

امراؤ جان (دیکھتے ہی) "اللہ! مرزا صاحب آپ تو ہمیں بھول ہی گئے۔"

میں:- "یہ معلوم کسے تھا کہ آپ کو نا خاں میں تشریف رکھتی ہیں۔"

امراؤ جان:- "یوں تو میں اکثر آپ کی آواز سنا کرتی تھی مگر کبھی بلانے کی جرأت نہ ہوئی۔ مگر آج آپ کی غزل نے بے چین کر دیا۔ بے ساختہ منہ سے واہ نکل گئی، ادھر کسی صاحب نے کہا "یہاں آئیے۔" میں اپنی جگہ پر آپ شرمندہ ہوئی۔ جی میں آیا چپ رہوں مگر دل نہ مانا۔ آخر اگلی خصوصیتوں کے لحاظ سے آپ کو تکلیف دی۔ معاف کیجئے گا ہاں ذرا وہ شعر پھر پڑھ دیجئے۔"

میں:- "معاف تو کچھ بھی نہ ہوگا اور نہ میں شعر سناؤں گا۔ اگر آپ کو شوق ہے تو وہیں تشریف لے چلیے۔"

امراؤ جان:- "مجھے چلنے میں کوئی عذر نہیں۔ مگر ہاں خیال ہے کہ صاحب خانہ یا اور کسی صاحب کو میرا جانا ناگوار نہ ہو۔"

میں :- آپ کے حواس درست ہیں ؟ بھلا ایسی جگہ میں آپ کو چلنے کے لیے کیوں کہتا۔ بے تکلف صحبت ہے آپ کے جانے سے اور لطف ہوگا۔"

امراؤ جان :- یہ تو سچ ہے۔ مگر کہیں زیادہ بے تکلفی نہ ہو۔"

میں :- جی نہیں ۔ وہاں میرے سوا کوئی آپ سے بے تکلف نہیں ہو سکتا۔"

امراؤ جان :- اچھا تو کل آؤں گی۔"

میں :- ابھی کیوں نہیں چلتیں ؟"

امراؤ جان :- اے ہے دیکھئے تو کس حیثیت سے بیٹھی ہوں!"

میں :- وہاں کوئی مجرا تو ہے نہیں، بے تکلف صحبت ہے چلی چلیئے۔"

امراؤ جان :- "اوئی مرزا! آپ کی تو باتیں لاجواب ہوتی ہیں۔ اچھا چلیئے میں آتی ہوں۔"

میں اٹھ کے چلا آیا۔ تھوڑی دیر کے بعد امراؤ جان صاحبہ ذرا کنگھی چوٹی کر کے کپڑے بدل کے آئیں۔"

میں نے احباب سے چند الفاظ میں ان کے مذاق شعر و سخن اور کمال موسیقی وغیرہ کی تعریف کر دی تھی۔ لوگ مشتاق ہو گئے تھے۔ جب وہ تشریف لائیں تو یہ ٹھہری کہ سب صاحب اپنا اپنا کلام پڑھیں اور وہ بھی پڑھیں۔ خلاصہ یہ کہ بڑے لطف کا جلسہ ہوا۔ اس دن سے امراؤ جان اکثر شام کو چلی آتی تھیں۔ گھنٹہ دو گھنٹے تک نشست رہتی تھی۔ کبھی شعر و شاعری کا جلسہ ہوا۔ کبھی انہوں نے کچھ گایا احباب محظوظ ہوتے۔ ایسے ہی ایک جلسے کی کیفیت ہم یہاں لکھے دیتے ہیں۔ ان مشاعروں میں نہ کوئی طرح مقرر کی جاتی تھی اور نہ بہت سے لوگوں سے زعلہ لیے جاتے تھے، صرف بے تکلف احباب جمع ہو جاتے تھے۔ اور اپنی اپنی تازہ تصنیف غزلیں پڑھتے تھے۔"

مشاعرہ

کس کو سنائیں حال دل زار کا اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

مرزا رسوا: "کیا کہنا۔ بی امراؤ جان صاحبہ! یہ مقطع تو آپ نے حسب حال کہا ہے۔ اور شعر کیوں نہ ہو؟"

امراؤ جان: "تسلیم مرزا صاحب! آپ کے سر کی قسم بس وہ مطلع یاد تھا اور یہ مطلع خدا جانے کس زمانے کی غزل کا ہے زبانی کہاں تک یاد رہے۔ بیاض نگوڑی گم ہو گئی۔"

منشی صاحب: "اور وہ مطلع کیا تھا۔ ہم نے نہیں سنا۔"

رسوا: "آپ تو اہتمام میں مصروف ہیں۔ سنے کون!"

اس میں شک نہیں کہ منشی صاحب نے آج کے جلسے کے لیے بڑے سلیقہ سے انتظام کیا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ مہتابی پر دو گھڑی دن رہے چھڑکاؤ ہوا تھا تاکہ شام تک زمین سرد ہو جائے۔ اس پر دری بچھا کے اجلی چاندنی کا فرش کر دیا تھا کوری کوری صراحیاں پانی بھر کے کیوڑا ڈال کے منڈیر پر چنوا دی گئی تھیں۔ ان پر بالو کے آبخورے ڈھکے ہوئے تھے۔ برف کا انتظام علیحدہ کیا گیا تھا۔ کاغذی ہنڈیوں میں سفید پانوں کی سات سات گلوریاں سرخ صافی میں لپیٹ کر کیوڑے میں بسا کر رکھ دی گئی تھیں۔ ڈھکنیوں پر تھوڑا تھوڑا کھانے کا خوشبودار تمباکو رکھ دیا تھا۔ ڈیڑھ نمبے حقوں کے نیچوں میں پانی چھڑک کر ہار لپیٹ دیئے تھے۔ چاندنی رات تھی اس لیے روشنی کا انتظام زیادہ نہیں کرنا پڑا صرف ایک سفید کنول دور سے کے لیے روشن کر دیا گیا تھا۔ آٹھ بجتے بجتے سب احباب میر صاحب، آغا صاحب،

خاں صاحب، شیخ صاحب، پنڈت صاحب وغیرہ وغیرہ تشریف لاتے۔ پہلے شیر مالودہ کے ایک ایک پیالے کا دور چلا پھر شعر و سخن کا چرچا ہونے لگا۔

منشی صاحب: "تو ہر اہتمام آپ کیجئے بندہ شعر سُنے گا۔"

رسوا: "معاف فرمایئے یہ دردِ سر مجھ سے نہ ہو گا۔"

منشی صاحب: "اچھا وہ مطلع کیا تھا"؟

امراؤ جان: "میں عرض کیے دیتی ہوں۔"

کعبہ میں جا کے بھول گیا راہ دیر کی!
ایمان بچ گیا مرے مولا نے خیر کی

منشی صاحب: "خوب کہا ہے۔"

خاں صاحب: "اچھا مطلع کہا ہے مگر یہ بھول گیا، کیوں؟"

امراؤ جان: "تو کیا خاں صاحب میں ریختی کہتی ہوں؟"

خاں صاحب۔ مزا تو جب ہی کا ہے "مرے مولا نے خیر کی"۔ آپ ہی کی زبان سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔"

رسوا۔ بس آپ کے حملے شروع ہو گئے۔ لے شعر سُننے دیجئے۔ خانصاحب! اگر سب آپ ہی کے سے محقق ہو جائیں تو شعر گوئی کا مزا تشریف لے جائے۔"

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

خاں صاحب۔ (کسی قدر بُرے تیوروں سے) "درست۔"

رسوا۔ امراؤ جان: "اچھا تو کوئی اور غزل پڑھو۔"

امراؤ جان: "دیکھئے کچھ یاد آئے تو عرض کروں۔ (تھوڑی دیر کے بعد)

شب فرقت بسر نہیں ہوتی

(حضار جلسہ: "واہ وا۔ سبحان اللہ! کیا کہنا!")

امراؤ جان۔ (تسلیمیں کر کے) "یہ شعر ملاحظہ ہو"۔

شورِ فریاد تا فلک پہنچا
مگر اُس کو خبر نہیں ہوتی!

رسوا۔ "کیا شعر کہا ہے"!

(حضار نے بھی تعریف کی)

امراؤ جان: "آپ کی عنایت۔ تسلیم۔ تسلیم"!

تیرے کوچے کے بے نواؤں کو
ہوسِ مال و زر نہیں ہوتی

(احباب: "تعریف")

امراؤ جان: "تسلیم"!

جان دینا کسی پر لازم تھا
زندگی یوں بسر نہیں ہوتی

رسوا: "واہ خاں صاحب! یہ شعر ملاحظہ ہو"!

خاں صاحب۔ "سبحان اللہ! حقیقت میں کیا شعر کہا ہے"!

امراؤ جان۔ آپ سب صاحب قدر افزائی فرماتے ہیں ع ورنہ میں کیا میری حقیقت کیا۔

ہے یقین وہ آئیں گے پھر بھی
کب نگہ سوئے در نہیں ہوتی

خاں صاحب: "یہ بھی خوب کہا"!

پنڈت صاحب: "کیا طرزِ کلام ہے"!

امراؤ جان: (تسلیم کر کے)

اب کس امید پر نظر میری
شکوہ سنج اثر نہیں ہوتی

خاں صاحب: "کیا اچھا کہا ہے۔ خارجیت ٹپک رہی ہے۔"
منشی صاحب: "جو کچھ ہو۔ مضمون اچھا ہے۔"
امراؤ جان: "تسلیم۔"

ہم اسیرانِ عشق کو صیاد
ہوسِ بال و پر نہیں ہوتی

(احباب: تعریف)

امراؤ جان: "تسلیم۔"

غلط انداز ہی سہی وہ نظر
کیوں مرے حال پر نہیں ہوتی

خاں صاحب: "ہاں ہونا چاہیئے۔ خوب کہا ہے۔"
امراؤ جان: "مقطع ملاحظہ ہو۔"

اے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے
دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی

خاں صاحب: "کیا مقطع کہا۔ یہ آپ اپنا تجربہ بیان کرتی ہیں اور لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہے۔"
امراؤ جان: "ذاتی تجربہ جو کچھ ہو میں نے ایک شاعرانہ مضمون کہا ہے۔"
رسوا: "اچھا ذرا پھر تو پڑھیئے۔"
امراؤ جان نے پھر پڑھا:

رسوا "مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مضمون کے دونوں پہلو اس شعر سے نکل سکتے ہیں۔"

خاں صاحب "واقعی مرزا صاحب کیا بات کہی۔"

احباب "غزل از مقطع تا مطلع ایک رنگ ہے۔"

آغا صاحب "نشست الفاظ ملاحظہ ہو۔"

پنڈت صاحب "کیا درفشانی کی ہے۔"

امراؤ جان "(کھڑی ہو کے) تسلیم۔"

منشی صاحب "اب آپ کچھ ارشاد کیجئے۔"

خاں صاحب "حضرت مجھے تو معاف کیجئے کچھ یاد ہی نہیں آتا۔"

رسوا "کچھ تو پڑھئے۔"

خاں صاحب نے ایک مطلع اور دو شعر پڑھے۔

حیف بنت العنب نہیں ملتی
ماہ میں ایک شب نہیں ملتی

رسوا "کیا اچھا کنایہ ہے یعنی شب چار دہم۔"

خاں صاحب "تسلیم۔"

یوں تو ملتی ہے داد صنعت شعر
داد حسن طلب نہیں ملتی

رسوا "کیا اچھا کنایہ ہے۔"

خاں صاحب "تسلیم۔"

شوخیوں سے کسی کی میری مراد
پہلے ملتی تھی اب نہیں ملتی!

رسوا: "لاجواب شعر ہے"

خاں صاحب: "تسلیم"

(اس کے بعد ایک صاحب تشریف لائے۔ آدمی کے ہاتھ میں لالٹین تھی)

خاں صاحب: "یہ کون صاحب آئے ہیں۔ شب ماہ میں لالٹین کی کیا ضرورت تھی"

نواب صاحب: "حضرت حماقت تو ہوئی معاف کیجیے گا"

خاں صاحب: "اخاہ نواب صاحب! بحضور مضائقہ ندارد"

(نواب صاحب تشریف لائے۔ سب نے تعظیم کی غزل پڑھنے کی فرمائش ہوئی)

نواب صاحب: "میں تو آپ صاحبوں کا مشتاق ہو کے آیا ہوں۔ مجھے تو کچھ یاد نہیں"

شیخ صاحب: "جناب غزل پڑھنا ہوگی"

نواب صاحب: "اچھا جو کچھ یاد آتا ہے عرض کیے دیتا ہوں"

دل میں کھب جائے گی قاتل کی ادا ایک نہ ایک

کارگر ہوگی کبھی تیر قضا ایک نہ ایک

(احباب: "واہ کیا شعر کہا ہے")

نواب صاحب: "تسلیم" (اس کے بعد چپ ہو رہے)

رسوا: "اور کچھ ارشاد ہو۔"

نواب صاحب: "واللہ اب کچھ یاد ہی نہیں آتا"

منشی صاحب: "اب آپ داد فصاحت دیجیے"

پنڈت جی: "امتثالاً للامر دو تین شعر عرض کیے دیتا ہوں"

جہل میں ذکر عدو بھی دم بدم ہوتا رہا
شربت دیدار میرے حق میں سم ہوتا رہا

(احباب۔ تعریف)

پنڈت صاحب:

زاہد و دن سے چرچا حق بوسنی کا ہوا
ورنہ کعبہ میں صدا ذکر صنم ہوتا رہا

نواب صاحب: "ہم نہیں کہہ سکتے۔ مگر خوب کہا۔"

پنڈت صاحب: "کہیے یا نہیں کہیئے مگر بات سچی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو:"

واعظا کیوں سر جھکائے وہ کسی کے روبرو
جس کا سر نقش قدم پر اس کے خم ہوتا رہا

(احباب۔ تعریف)

پنڈت صاحب۔

زلف کی تعریف میں دفتر کے دفتر لکھ دیئے
مو بمو حال پریشانی رقم ہوتا رہا

رسوا: "یہ خاص لکھنو کا مذاق ہے!"

پنڈت صاحب: "اور آپ دہلی کے کب ہیں؟"

رسوا: "اچھا شعر پڑھیے۔ میں نے تو ایک بات کہی!"

پنڈت جی:

دل جو تھا پہلے گل نورستہ باغ مراد
خار خار حسرت رنج و الم ہوتا رہا

نواب صاحب: "دیکھیے کیا شعر کہا ہے!"

نواب صاحب: " متانت الفاظ ملاحظہ ہو "

پنڈت جی: " منقطع ملاحظہ ہو "

شکریہ محمور اس کا کب تجھ سے ادا ہوا

ہر نفس تجھ پر خالق کا کرم ہوتا رہا

خاں صاحب: " سبحان اللہ - ہر نفسے کہ فرو میرود ممد حیات است وچوں بر می آید مفرح ذات "

رسوا: " خاں صاحب آپ کے مارے تو شعر ہی پڑھنا مشکل ہے "

احباب: " سبحان اللہ! کیا غزل فرمائی ہے "

پنڈت جی: " آپ کی عنایت، پرورش، بندہ نوازی - واللہ یہ آپ ہی لوگوں کا صدقہ ہے "

منشی صاحب: " شیخ صاحب آپ تو کچھ ارشاد کیجئے "

شیخ صاحب: " (مسکرا کر) جی مجھے تو کچھ یاد نہیں "

خاں صاحب: " یاد نہیں مگر ستر شعر کی غزل جیب میں ہوگی "

شیخ صاحب: " واللہ نہیں. صرف چار شعر ابھی موزوں کر لیے ہیں "

رسوا: " تو پھر پڑھئے کیوں نہیں "

شیخ صاحب: " عرض کیے دیتا ہوں "

عرض وہ عرض ہے جس میں کوئی اصرار نہ ہو

بات وہ بات کہ جس بات سے انکار نہ ہو

(احباب. تعریف)

شیخ صاحب: " تسلیم "

شکل یوسف سر بازار پڑے پھرتے ہو

کیا ہی شہرہ ہو اگر کوئی خریدار نہ ہو

رسوا: "کیا اچھا مذاق ہے۔"

شیخ صاحب: "تسلیم۔"

دل وہ اچھا جو حسینوں کی نظر میں نہ جمے
جنس وہ خوب کوئی جس کا خریدار نہ ہو

خاں صاحب: "بہت خوب۔"

شیخ صاحب: "تسلیم۔"

قتل عشاق کی بے کار قسم کھاتے ہو
ہم نہ مانیں گے اگر ہاتھ میں تلوار نہ ہو

اتنے میں ایک آدمی آیا اور اس نے ایک پرچہ منشی احمد حسین کو دیا۔

منشی صاحب: "(رقعہ پڑھ کے) مرزا صاحب تشریف نہیں لائیں گے غزل تازہ بھیج دی ہے۔"

میں نے آدمی سے پوچھا: "کیا کر رہے ہیں؟"

آدمی۔ (مسکرا کے) جی حضور سکندر باغ سے سر شام بہت سے انگریزی درختوں کے نانڈے لے کے آئے ہیں۔ ان کو گول حوض کے کنارے پتھروں کے اندر سجا رہے ہیں، ماں پانی دینا جاتا ہے۔"

رسوا: "جی ہاں۔ انہیں اپنے اعمال سے فرصت کہاں جو مشاعرہ میں تشریف لائیں۔"

منشی صاحب: "اچھا تو غزل پڑھ دیجئے۔ واللہ کیا صحبت کو بے لطف کیا۔ نہ آئے نہ آئے اچھا غزل ہی پڑھ دیجئے۔"

رسوا: "مجھ سے تو کچھ نہ پڑھا جائے گا۔"؟

منشی صاحب: "ہاں خوب یاد آیا۔ اچھا تو پہلے آپ پڑھ لیجئے۔"

رسوا۔

نہ پوچھو ہم سے کیونکر زندگی کے دن گزرتے ہیں
کسی بے درد کی فرقت میں جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
کوئی ان سے کہے دل لے کے بھی یوں ہی مکر جانا
عدو کے سامنے جو گالیاں دے کر مکرتے ہیں
ابھی تو ہنس رہے ہیں مدعی ذوقِ جراحت پر
نہ پوچھو اس مزے کو جب نمک زخموں میں بھرتے ہیں
تماشا ہو جو اُن کا بوسہ لے کر ہم مکر جائیں
بہت جو چاہنے والوں کا دل لیکر مکرتے ہیں
اُنہیں کا نام لے لیکر کوئی فرقت میں مرتا ہے
کبھی تو وہ بھی سن لیں گے جو بدنامی سے ڈرتے ہیں!
بگاڑا ہم کو قسمت نے تو پھر بننا نہیں ممکن!
وہ گیسو ہیں کسی کے جو بگڑ کے پھر سنورتے ہیں
کبھی شانے سے الجھے وہ کبھی آئینہ کو توڑا
سنورنے میں بگڑتے ہیں بگڑنے میں سنورتے ہیں
ہمیں زندہ نہ چھوڑیں گی ادائیں ان کے جوبن کی
دوپٹہ اوڑھ کے آڑا جو چلنے میں ابھرتے ہیں
ادا سے ناز کو رسوا ہے۔ دعویٰ پارسائی کا!!
کوئی پوچھے تو آخر مرنے والے کس پہ مرتے ہیں

احباب نے ہر شعر کی داد دی۔ رسوا نے سر تسلیم خم کرا کے بعد مرزا صاحب کی غزل پڑھنا شروع کی۔

کل رات کو انہیں جو کہیں دیر ہو گئی
دنیا ہماری آنکھوں میں اندھیر ہو گئی

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی

بیہودہ خواہشوں نے نہ جینے دیا ہمیں
ان موذیوں سے عقل اگر زیر ہو گئی

اے موت تجھ کو کیا ہوا تو ہی بلا سے آ
ان کو تو آتے آتے بڑی دیر ہو گئی

کیا پوچھتے ہو عمر یوں ہی انیر ہو گئی
آج ان سے ہم نے آنے کا وعدہ تو کیا تھا ہے
دم ہی نکل گیا جو کہیں دیر ہو گئی!

ٹلنا تھا میرے پاس سے اے کاہلی تجھے
کم بخت تو تو آکے یہیں ڈھیر ہو گئی

دبکی ہوئی تھی گر یہ صفت خواہش گناہ
چمکارنے سے پھول گئی شیر ہو گئی

مرزا مشاعرے میں نہ تشریف لائیں گے
تا چند انتظار؟ بڑی دیر ہو گئی

اس کے بعد منظہر الحق نامی ایک شاعر کہیں باہر کے رہنے والے جو اس وقت اتفاق سے وارد مشاعرہ تھے۔ انہوں نے یہ نظم پڑھی۔

ہے ہمارے مشاعروں کا یہ حال
جس کی اب نقل کرتے ہیں نقال
روش اہل فن پہ ہنستے ہیں
رنگِ بزم سخن پہ ہنستے ہیں
کیا زمانے میں غدر ہے توبہ
شاعری کی یہ قدر ہے توبہ
گو کہ پاسِ ادب نہیں کرتے
ہجو کچھ بے سبب نہیں کرتے
چلتے ہیں شاعران خوش تقریر
اپنے ہمراہ لے کے جم غفیر
کب اکیلے سخنور جاتے ہیں
قدر دانوں کو لے کے آتے ہیں
جاتے ہیں معرکوں میں فوج سمیت
ساتھ ہوتے ہیں بے شمار بہادر بیت
جن کے ہمراہ یہ ہجوم نہ ہو
کبھی اُن کی غزل کی دھوم نہ ہو
اک اُدھر واہ واہ کرتا ہے
اک ادھر آہ آہ کرتا ہے
واہ کیا طرز درفشانی ہے
واہ کیا وضع خوش بیانی ہے
کوئی کہتا ہے واہ کیا کہنا
فی الحقیقت ہے یہ نیا کہنا

اس سے بہتر کہے گا کیا کوئی
کب ہے اُستاد آپ سا کوئی
اس زمانے میں آپ یکتا ہیں
واقعی فخرِ میر و مرزا ہیں
کب میسّر تھا اُن کو حسنِ کلام
کچھ نہ تھے وہ، ہے فقط نام ہی نام
اُن کے دیوان میں کب یہ نشتر ہیں
بخدا آپ اُن سے بہتر ہیں
اُن سے واللہ آپ اچھے ہیں
قسم باللہ آپ اچھے ہیں
کہیں بڑھ کر ہے آپ کا انداز
نکتہ سنجی ہے یا کہ اعجاز
آپ قدرت نمائے معنیٰ ہیں
فی الحقیقت خدائے معنی ہیں
آپ کے آگے کون منہ کھولے
کس کا مقدور ہے جو کچھ بولے
ہے یہ انداز آپ کا حصّہ!!!
ہے یہ اعجاز آپ کا حصّہ
دل میں ہم خوب کر چکے ہیں غور
آپ ہی آپ ہیں نہیں کچھ اور
آپ ایسے ہیں آپ ویسے ہیں

ہم سمجھتے ہیں آپ جیسے ہیں
آپ کیا قدر اپنی پہچانیں
پوچھئے ہم سے آپ کیا جانیں
آپ کا کام ہے ہوا بندی
آپ پر ختم ہے ادا بندی
ایسے شاعر ہوئے تھے کب پیدا
نہ ہوتے تھے نہ ہوں گے اب پیدا
الغرض بے تکی اڑاتے ہیں
بچھے جاتے ہیں لوٹے جاتے ہیں
ان کی تعریف ہے نہ لا طائل
جس سے دکھتا ہے دوسروں کا دل
منہ سے وہ شعر ادھر نکالتے ہیں
یہ اُدھر ٹوپیاں اچھالتے ہیں
جن کی تعریف کا تھا یہ مذکور
اپنے دل میں بہت ہی ہیں مسرور
اگر اس میں کسی کو غصّہ آئے
کچھ تعجب نہیں کہ لٹھ چل جائے
نہیں یہ بات کچھ تعجب کی
بلکہ اکثر ہوا ہے ایسا بھی
پڑھتے ہیں لفظ لفظ رُک رُک کے
ہو رہے ہیں سلام جھک جھک کے

گو بظاہر ہے انکسار بہت
دل میں ہے جوشِ افتخار بہت
کس قدر تنتے ہیں بدرتے ہیں
خود بھی تعریف اپنی کرتے ہیں
ہوتی ہے لفظ لفظ کی تشریح
ہوتی ہے بات بات کی تصریح
کیوں نہ ہوں اپنی مدح کے شائق
جانتے ہیں کہ ہم ہیں اس لائق
کس قدر دور ہیں معاذاللہ
کیسے مغرور ہیں معاذاللہ
نکتہ فہم ایسے نکتہ داں ایسے
شاعر ایسے ہیں قدرداں ایسے
جھوٹی تعریف کی حقیقت کیا
جب حقیقت نہ ہو تو لذت کیا
اس میں کیا خط ہے یہ مزا کیا ہے
کوئی پوچھے انہیں ہوا کیا ہے
گو کہ میری مذمتیں ہوں گی
میں سمجھتا ہوں جو گتھیں ہوں گی
صاف گوئی کی داد پاؤں گا
میں بھی اپنی مراد پالوں گا
کیا غرض ہے جو میں کسی سے ڈروں

بات سچی ہے کیوں نہ کہہ گزریں
مجھ کو بھاتی نہیں لگی لپٹی
بلکہ آتی نہیں لگی لپٹی
طرزِ اہل سخن سے ناخوش ہوں
روشِ اہل فن سے ناخوش ہوں
شاعری ہے اگر اسی کا نام
دور سے ایسی شاعری کو سلام

اس نظم کی انصاف پسند احباب نے بڑی تعریف کی۔ ہر شعر پر اہل محفل تعریفیں کرتے جاتے تھے۔ منشی صاحب پر وجد کا عالم طاری تھا۔ امراؤ جان جھوم رہی تھیں اور میرا جو حال تھا وہ میرے دل سے کوئی پوچھے۔

منشی صاحب: "ہاں جناب آغا صاحب اب آپ کچھ فرمایئے"

آغا صاحب: "بہت خوب۔ مطلع اوّل ملاحظہ ہو"

کہیں سامان ایسے ہوں تو کچھ دل کو کے کل ہو
مڑا مڑے بلے ہوتے ہوں اور اک ٹھرے کی بوتل ہو

آغا صاحب: "کیا مطلع فرمایا ہے"

آغا صاحب: "اے حضرت ابھی آپ نے سنا ہی کیا ہے"

دوسرا مطلع سنیئے

وہ مضمون ڈھونڈھ کر لاؤں جو مشکل سے مشکل ہو
کہوں وہ مطلع ثانی کہ جو اول سے اول ہو

احباب: "بے شک اول سے اول ہے"

آغا صاحب: "اب شعر ملاحظہ ہوں"

اس شعر کا رخ نواب صاحب کی طرف تھا جو جالی کا کرتا ہلکا بادامی رنگا اور باریک ململ کا انگرکھا پہنے بند کھولے بیٹھے تھے اور ایک نہایت نفیس پنکھیا ہاتھ میں تھی۔ اسے جھلتے جاتے تھے "

اگر جاڑے میں تو مل جائے تو کیا غم ہے جاڑے کا
نبری زلفیں ہوں شانے پر دوشالہ ہو نہ کمبل ہو

(احباب۔ تعریف)

آغا صاحب "شعر ملاحظہ ہو"

کہو بے چارگی میں بھی طبیعت خوش رکھے مجنوں
کہ پھر لے ناقۂ لیلیٰ ہری جب دل کی کوپل ہو

پنڈت جی "سبحان اللہ! اور تو اور' یہ بے چارگی سے کیا چارہ نکالا ہے "

احباب " واللہ سمجھے بھی خوب۔ سمجھ ہو تو ایسی ہو نہیں تو نہ ہو "

آغا صاحب " نہ ہو۔ اچھا اب یہ شعر سنیئے "

کہو عشاق سے اپنے کہ ضبط گریہ فرمائیں
رکے گا راستہ گھر کا اگر کوچہ میں دلدل ہو

شیخ صاحب " اچھی کہی "

رسوا۔ (خاں صاحب سے) " آپ کیوں سکوت میں ہیں کوئی اعتراض نکالیے "

آغا صاحب " ہاں جناب سکوت قدر شناس ٹھیک نہیں ہے "

خاں صاحب " آپ میری تعریف کو تحسین ناشناس نہ سمجھئے اسلیئے چپ ہوں "

آغا صاحب۔ نہیں حضرت میری ایسی الٹی سمجھ نہیں ہے۔"

(احباب اس فقرہ پر لوٹ گئے)

آغا صاحب "شعر سنیئے:"

ہیں رشک آئے اپنے سے ہیں عیب پیدا ہو
ہم ایسے دو نظر آئیں اگر معشوق احول ہو

احباب:" صاحب سبحان اللہ! کیا نازک خیالی ہے۔"

آغا صاحب:"

ابھی کمسن ہیں ان کو شوق ہے لنگر لڑانے کا
نکلا ڈور کا ہو اک نہ کنکیا نہ نکل ہو

اس شعر کا رخ بھی نواب صاحب کی طرف تھا اس لیے کہ آپ ہی کی سرکار عالی جاہ سے کنکوے کی برات بڑی دھوم سے نکلی تھی۔

آغا صاحب:"

کوئی پوچھے ان سے جو کہے شعر معنی بند کہتے ہیں
کھلے کیا راز سر بستہ جو دروازہ مقفل ہو

نسوا:" آغا صاحب کیا کہنا۔ امراؤ جان ذرا سننا کیا شعر کہا ہے۔"

امراؤ جان:" سبحان اللہ! میں پہلے ہی سمجھ گئی۔ جو جاہیں کہیں مالک ہیں۔"

آغا صاحب:" تو صاف کیوں نہیں کہتیں کہ دوزخ کا دربان ہوں۔ اچھا سنیئے

کسی صورت سے بہلا لیں گے اس معشوق کمسن کو
ڈبل پیسہ نہ ہو یو ڑھی نہ ہو تو گول گپل ہو

(احباب۔ کیا کہنا)

آغا صاحب۔

کبھی گالی سنا بیٹھے کبھی جوتا لگا بیٹھے
حکومت کا مزا آئے اگر معشوق ارزل ہو

خاں صاحب: "درست مگر آپ کی شرافت سے بعید ہے۔"

آغا صاحب: "جناب اس زمانے میں شریف کون ہے!"

خدا کے فضل سے اترا تھا کیا ہی عرش سے جوڑا!
نہ مجھ سا کوئی گرگا ہو نہ تم سی کوئی تشقل ہو

نواب صاحب: "خوب، مگر روئے سخن کسکی طرف ہے۔"

آغا صاحب: "یہ تو آپ ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ آپ محرم راز ہیں۔ السر عند کرام الناس مکتوم۔"

خاں صاحب: "آپ جواب دیجیے۔"

آغا صاحب: "آپ کیا جواب دیں گے۔ یہ شعر سنیئے۔"

ہم اُس نازک ادا کی شوخیوں پر جان دیتے ہیں
شتر کے جسمیں غمزے ہوں فرس کی جسمیں چھابل ہو

(احباب۔ واہ ری ہمت)

آغا صاحب: "اچھا نہ سہی یہ سنیے۔"

میں دل کو چیر ڈالوں گا جو تم پہلو سے اٹھ جاؤ
میں آنکھیں پھوڑ ڈالوں گا جو تم آنکھوں سے اوجھل ہو

(احباب۔ خوب)

آغا صاحب:

تمہاری سادگی میں عجب کچھ عالم نکلتا ہے
نہ چوٹی ہو نہ کنگھی ہو نہ مسی ہو نہ کاجل ہو

امراؤ جان :" اوئی تو کیا دن رات سر جھاڑ منہ پہاڑ بیٹھا رہے .

آغا صاحب :" سادگی کا یہی مزا ہے اور دوسرے خرچ کی بھی کفایت ہے

اس مذاق میں لطف یہ ہے کہ امراؤ جان کسی قدر جبلین مشہور تھیں)

ٹکا ہم سے نہ جب مانگیں انہیں چپکے سے ہم دے دیں
نہ بک بک ہو نہ جھک جھک ہو نہ کچ کچ ہو نہ کل کل ہو

(احباب . کیا مصرع کہا ہے)

خاں صاحب :" اوپر کا مصرع بھی خوب لگایا . وہی ارزل کی رعایت چلی
آتی ہے ."

(امراؤ جان ہنستے ہنستے لوٹی جاتی تھیں)

آغا صاحب : اچھا تو اب ایسے شعر نہ پڑھیں ہمارا معشوق ذلیل ہوا جاتا
ہے . نازک خیالی سنیئے .

تیری نازک ادا کے باب میں چھلک بنا دیں گے
وہ کیا سمجھے یہ تاریکی طبیعت جس کی گھٹل ہو

خاں صاحب :" میں تسلیم کیے لیتا ہوں میری طبیعت ایسی ہی ہے جیسا آپ
ارشاد فرماتے ہیں . مگر برائے خدا اس چھلک کے معنی سمجھا دیجیے "

آغا صاحب :" خیر خاطر ہے . سن لیجیے . محاسب لوگ خانہ پوری کے بجائے
مدار و کے (×) نشان بنا دیا کرتے ہیں . اس لیے اس سے یہ مطلب نکلا کہ کمر معدوم
ہے دوسرے ایک خط نے بیچوں بیچ سے دوسرے کو کاٹ دیا ہے اس سے یہ
ظاہر ہوا کہ معشوق کی کمر کٹی ہوئی اور پھر جڑی ہوئی لگی ہے "

خاں صاحب :" یہ کیونکر ؟

آغا صاحب :" اب اس باریکی کو نہ پوچھیے . خیر حضرات واضح ہو کہ چھلک علم

ریاضی میں علامت جمع کی ہے۔ لطف یہ ہے کہ علامت کی کوئی مقدار نہیں ہوتی مطلب یہ نکلا کہ کمر باوجود معدوم ہونے کے جسم کے دونوں حصّوں کو جوڑے ہوئے ہے۔"

احباب :" حضرت! بس نازک خیالی کی حد ہو گئی۔ جو کوئی اتنے علوم جانتا ہو وہ آپ کے شعر سمجھے۔"

آغا صاحب۔ اسی لیے تو میں ایسے دلیسوں کے سامنے پڑھتا نہیں۔ افسوس استاد مرحوم زندہ نہ ہوتے نہیں تو ان شعروں کی کچھ داد ملتی۔ اب سمجھنے والوں میں کون رہ گیا ہے۔ خیر اب مقطع سن لیجیے۔ طبیعت کو کلفت ہو گئی کوئی قدردان نہیں ہے۔"

بس اے فراق بس! طبع قیامت خیز کو روکو
غضب ہو جائے فوج مضامیں میں جو ہلچل ہو

احباب :" مقطع پر عنایت ہو۔

(آغا صاحب نے دوبارہ پڑھا)

نواب صاحب :" کیا زبردست تخلص رکھا ہے۔"

آغا صاحب :" معاف فرمایئے گا۔ ہے تو کچھ ایسا ہی مگر کچھ ناز بیجا نہیں ہے ایک تو خاندانی اعتبار سے اس لیے کہ فدوی کے آباؤ اجداد دشت قفچاق میں لوٹ مار کیا کرتے تھے۔ دوسرے اس سبب سے کہ استاد مرحوم سارق تخلص فرماتے تھے اور یہ کچھ مناسب نہ تھا۔ اس لیے کہ (ان کی روح خود شرمندہ نہ ہو) عمر بھر اگلے شاعروں کے مضمون چرا چرا کے شعر موزوں فرمایا کیے سارا دیوان ملاحظہ کر لیجیے شاید ہی کوئی شعر نیا ہو۔"

جب اشہب خامہ کی لگام میرے دست اقتدار میں آئی تو میں نے سرقہ

اپنی شان کے منافی سمجھ کے قزاق تخلص رکھ لیا۔ کچھ نہ سہی اس میں ایک طرح کا بانکپن ہے۔ بندہ کا یہ دستور رہا ہے کہ شعرائے ماضی و حال کے مضامین زبردستی چھین کے اپنے قبضۂ تصرف میں کر لوں۔

نواب صاحب: "بہت مبارک۔"

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد فالسہ کی برف جمائی گئی۔ اس کی دو دو قفلیاں احباب نے نوش کیں۔ سب اپنے اپنے مکان تشریف لے گئے۔ اس کے بعد دستر خوان بچھا منشی صاحب نے اور میں نے اور امراؤ جان نے کھانا کھایا۔

منشی صاحب: "(امراؤ جان سے) ذرا اپنا مطلع تو وہ پڑھیئے جو آپ نے پہلے پڑھا تھا۔"

امراؤ جان۔

کس کو سنائیں حال دلِ زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

منشی صاحب: "اس میں شک نہیں کہ آپ کے حالات بہت ہی دلچسپ ہوں گے۔ جب سے آپ نے یہ مطلع پڑھا ہے۔ مجھے یہی خیال ہے۔ اگر آپ اپنی سرگذشت بیان کریں تو لطف سے خالی نہ ہوگا۔"

میں نے بھی منشی صاحب کے کلام کی تائید کی۔ مگر امراؤ جان پہلو بچاتی تھیں مارے منشی صاحب مہربان کو ابتدائے سن سے قصہ کہانیوں کا بڑا شوق تھا۔ الف لیلٰی امیر حمزہ کی داستان کے علاوہ بوستان خیال کی کل جلدیں نظر سے گذری ہوتی تھیں۔ کوئی ناول ایسا نہ تھا جو آپ نے نہ دیکھا ہو۔ مگر لکھنؤ میں چند روز رہنے کے بعد جب اہلِ زبان کی اصلی بول چال کی خوبی کھلی۔ اکثر ناول نویسوں کے بے تکے سے مصنوعی زبان اور تعصب آمیز بیہودہ جوش دلانے والی تقریریں آپ کے

دل سے اتر گئی نہیں۔ لکھنؤ کے با مذاق لوگوں کی گفتگو بہت ہی پسند آتی تھی۔ امراؤ جان کے اس مطلع میں آپ کے دل میں وہ خیال پیدا کیا جس کا اشارہ اوپر کیا گیا ہے۔ القصہ منشی صاحب کے شوق اور میری اشتحالک نے امراؤ جان کو مجبور کیا اور وہ اپنی سرگذشت کہنے پر مجبور ہو گئیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ امراؤ جان کی تقریر بہت شستہ تھی اور کیوں نہ ہو۔ اوّل نو خواندہ۔ دوسرے اعلیٰ درجہ کی رنڈیوں میں پرورش پائی۔ شہزادوں اور نواب زادوں کی صحبت اٹھائی۔ محلات شاہی تک رسائی جو کچھ انہوں نے آنکھوں سے دیکھا اور لوگوں نے کانوں سے نہ سنا ہو گا۔"

اپنی سرگذشت وہ جس قدر کہتی جاتی تھیں میں اُن سے چھپا کے لکھتا جاتا تھا۔ تمام ہونے کے بعد میں نے مسودہ دکھایا۔ امراؤ جان بہت بگڑیں مگر اب کیا ہو سکتا تھا آخر کچھ سمجھ بوجھ کے چپ ہو رہیں۔ خود پڑھا اور جابجا جو کچھ رہ گیا تھا اسے درست کر دیا۔

میں امراؤ جان کو اُس زمانے سے جانتا ہوں جب اُن کی نواب صاحب سے ملاقات تھی۔ انہی دنوں میری نشست بھی اکثر وہاں رہتی تھی۔ اس سرگذشت میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کے حرف بحرف صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے مگر یہ میری ذاتی رائے ہے ناظرین کو اختیار ہے جو چاہیں قیاس کریں۔

مرزا رسوا

(۱)

لطف ہے کون سی کہانی میں
آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی

"سنیئے مرزا رسوا صاحب۔ آپ مجھ سے کیا چھیڑ چھیڑ کے پوچھتے ہیں۔ مجھ کم نصیب کی سرگذشت میں ایسا کیا مزہ ہے جس کے آپ مشتاق ہیں۔ ایک ناشاد نامراد، آوارہ خاناں برباد، ننگ خاندان، عار دوجہاں کے حالات سن کے مجھے ہرگز امید نہیں کہ آپ خوش ہوں!"

اچھا سنیئے اور اچھی طرح سنیئے۔

باپ دادا کا نام لے کے اپنی سرخروئی جتانے سے فائدہ کیا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے یاد بھی نہیں۔ ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلہ میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچے مکان، کچھ کچے جھوپڑے کچھ کھپریلیں۔ رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے کچھ بھشتی، کچھ نائی۔ دھوبی، کہار۔ میرے مکان کے سوا ایک اونچا گھر اس محلہ میں اور تھا۔ اس مکان کے مالک کا نام دلاور خاں تھا۔

میرے ابا بہو بیگم صاحبہ کے مقبرے پر نوکر تھے معلوم نہیں کا ہے میں اسم تھا کیا تنخواہ تھی اتنا یاد ہے کہ لوگ اُن کو جمعدار کہتے تھے!

دن بھر میں اپنے بھائی کو کھلایا کرتی تھی اور وہ بھی مجھ سے اس قدر ہلا ہوا تھا کہ دم بھر کے لیے نہ چھوڑتا تھا۔

ابا جب شام کو نوکری سے آتے تھے اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھئے۔ میں کمر سے لپٹ گئی بھائی ابا ابا کہتا ہوا دوڑا، دامن سے چمٹ گیا۔ ابا کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں۔ مجھ کو چمکارا پیٹھ پر ہاتھ پھیرا بھیا کو گود میں اٹھا لیا۔ پیار کرنے لگے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ کبھی خالی ہاتھ گھر نہ آتے تھے۔ کبھی دو کنارے ہاتھ میں ہیں کبھی نیاسوں یا تل کے لڈوؤں کا دونا ہاتھ میں ہے اب اس کے حصے لگائے جا رہے ہیں۔ اس وقت بھائی بہنوں میں کس مزے کی لڑائیاں ہوتی تھیں۔ وہ کنارا چھینے لیے جاتا ہے۔ میں مٹھائی کا دونا ہتھیائے لیتی ہوں۔ اماں سامنے کھپریل میں بیٹھی کھانا پکا رہی ہیں۔ ابا ادھر آ کے بیٹھے نہیں اُدھر میرے تقاضے شروع ہو گئے" ابا اللہ گڑیاں نہیں لائے۔ دیکھو میرے پاؤں کی جوتی کیسی ٹوٹ گئی ہے۔ تم کو تو خیال ہی نہیں رہتا۔ ابھی تک میرا طوق بن کے سنار کے یہاں سے نہیں آیا۔ چھوٹی خالہ کی لڑکی دودھ بڑھائی ہے۔ بھئی میں کیا پہن کے جاؤں گی؟ چاہے کچھ ہو عید کے دن تو میں نیا جوڑا پہنوں گی۔ ہاں ہیں تو نیا پہنوں گی" جب اماں کھانا پکا چکیں مجھے آواز دی میں گئی روٹی کی ٹوکری اور سالن کی پتیلی اٹھا لائی دسترخوان بچھا۔ اماں نے کھانا نکالا۔ سب نے سر جوڑ کے کھانا کھایا خدا کا شکر کیا ابا نے عشا کی نماز پڑھی سو رہے۔ صبح کو تڑکے اٹھے نماز پڑھی اس وقت میں کھٹ سے اٹھ بیٹھی پھر فرمائشیں شروع ہوئیں:

"میرے ابا آج نہ بھولنا۔ گڑیا ضرور لیتے آنا۔ ابا شام کو بہت سارے امرود اور نارنگیاں لانا"

ابا صبح کی نماز پڑھ کے وظیفہ پڑھتے ہوئے کوٹھے پر چڑھ جاتے تھے۔ کبوتروں کو کھول کے دانہ دیتے تھے۔ ایک دو ہوائیں اڑاتے تھے

اتنے میں اماں جھاڑو بہارو سے فراغت کر کے کھانا تیار کر لیتی تھیں کیونکہ ابا پہر دن چڑھنے سے پہلے ہی نوکری پر چلے جاتے تھے۔ اماں سینا پرونا لیکر بیٹھ جاتی تھیں۔ میں بھیا کو لیکر کہیں محلے میں نکل گئی یا دروازہ پر املی کا درخت تھا وہاں چلی گئی ہمجولی لڑکیاں لڑکے جمع ہو گئے۔ بھیا کو بٹھا دیا خود کھیل میں مصروف ہو گئی۔ ہائے کیا دن تھے کسی بات کی فکر ہی نہ تھی اچھے سے اچھا کھاتی تھی بہتر سے بہتر پہنتی تھی کیونکہ ہمجولی لڑکے لڑکیوں میں کوئی مجھے پہنے سے بہتر نظر نہ آتا تھا۔ دل کھلا ہوا تھا کہیں پھٹی ہوئی نہ تھیں۔ جہاں میں رہتی تھی وہاں کوئی مکان میرے مکان سے اونچا نہ تھا اور سب ایک کٹھریا یا کھپریل میں رہتے تھے۔ میرے مکان میں آمنے سامنے دو دالان تھے۔ صدر کے دالان کے آگے کھپریل پڑی ہوئی دو کوٹھریاں تھیں۔ سامنے دالان کے ایک باورچی خانہ تھا دوسری طرف کوٹھے کا زینہ۔ کوٹھے پہ ایک کھپریل دو کوٹھریاں کھانے پکانے کے برتن ضرورت سے زیادہ تھے۔ دو چار دریاں چاندنیاں بھی تھیں۔ ایسی چیزیں محلے کے لوگ ہمارے گھر سے مانگنے آتے تھے۔ ہمارے گھر میں بھشتی پانی بھرتا تھا۔ محلے کی عورتیں خود ہی کنوئیں سے پانی بھر لاتی تھیں ہمارے ابا جب گھر سے وردی پہن کر نکلتے تھے تو لوگ انہیں جھک جھک کر سلامیں کرتے تھے میری اماں ڈولی سوار ہو کے مہمان جاتی تھیں ہمسائیاں پاؤں پیدل ماری ماری پھرتی تھیں۔

صورت شکل میں بھی میں اپنی ہمجولیوں سے اچھی تھی۔ اگرچہ درحقیقت خوب صورتوں میں میرا شمار نہیں ہو سکتا مگر ایسی بھی نہ تھی جیسی اب ہوں۔ کھلتی ہوئی رنگت تھی۔

ناک نقشہ بھی خیر کچھ ایسا برا نہ تھا۔ ماتھا کسی قدر اونچا تھا۔ آنکھیں

بڑی بڑی تھیں۔ بچپنے کے پھولے پھولے گال تھے۔ ناک اگرچہ ستواں نہ تھی مگر پچی اور پہیہ پھری بھی نہ تھی۔ ڈیل ڈول بھی سن کے موافق اچھا تھا۔ اگرچہ اب ویسی نہیں رہی۔ نازکوں میں میرا شمار نہ جب تھا نہ اب ہے۔ اس قطع پر پاؤں میں لال گلبدن کا پائجامہ چھوٹے چھوٹے پائنچوں کا ٹول کا نیفہ نینو کی کرتی تن زیب کی اوڑھنی، ہاتھوں میں چاندی کی تین تین چوڑیاں گلے میں طوق ناک میں سونے کی نتھنی۔ اور سب لڑکیوں کی نتھنیاں چاندی کی تھیں۔ کان ابھی تازے تازے چھدے تھے۔ ان میں صرف نیلے ڈورے پڑے تھے سونے کی بالیاں بننے کو گئیں تھیں۔

میری شادی میری پھوپی کے لڑکے کیساتھ ٹھہری ہوئی تھی منگنی نو برس کے سن میں ہوگئی تھی۔ اب ادھر سے شادی کا تقاضا تھا۔ میری پھوپھی نواب گنج میں بیاہی ہوئی تھیں۔ پھوپھا ہمارے زمیندار تھے۔ پھوپھی کا گھر ہمارے گھر سے زیادہ بھرا پرا تھا منگنی ہونے سے پہلے میں کئی مرتبہ اپنی ماں کے ساتھ وہاں جا چکی تھی۔ وہاں کے کارخانے ہی اور تھے۔ مکان تو کچا تھا مگر بہت وسیع، دروازہ پر چھپر پڑے تھے۔ گائے، بیل، بھینسیں بندھی تھیں۔ گھی دودھ کی افراط تھی۔ اناج کی کثرت۔ بھٹوں کی فصل میں ٹوکروں بھٹے چلے آتے ہیں کناروں کی پھاندیاں پڑی ہیں۔ اوکھ کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ کوئی کہاں تک کھائے۔

میں نے اپنے دولھا (یعنی جس کے ساتھ میری نسبت ٹھہری ہوئی تھی) کو بھی دیکھا تھا۔ بلکہ ساتھ کھیلی تھی۔ ابا پورا جہیز کر چکے تھے۔ کچھ روپے کی اور فکر تھی۔ رجب کے مہینے میں شادی کا تقرر ہو گیا تھا۔

رات کو جب اماں ابا میں میری شادی کی باتیں ہوتی تھیں، میں چپکے

چپکے سنا کرتی تھی اور دل ہی دل میں خوش ہوتی۔ واہ میرے دولھا کی صورت۔ کریمن (ایک دُھنیے کی لڑکی کا نام تھا جو میرے ہمسین تھی) کے دولھا سے اچھا ہے وہ تو کالا کالا ہے میرا دولھا گورا گورا ہے۔ کریمن کے دولھا کے منہ پر کیا بڑی سی داڑھی ہے۔ میرے دولھا کے ابھی مونچھیں بھی اچھی طرح نہیں نکلیں۔ کریمن کا دولھا ایک میلی سی دھوتی باندھے رہتا ہے ماشی رنگی ہوئی مرزئی پہنے رہتا ہے۔ میرا دولھا عید کے روز کس ٹھاٹھ سے آیا تھا۔ سبز چھینٹ کا دُگلا گلبدن کا پائجامہ مصالحہ کی ٹوپی مخملی جوتا۔ کریمن کا دولھا سر میں ایک پھنٹیا باندھے ہوئے ننگے پاؤں پھرتا ہے۔"

غرض کہ میں اپنی حالت میں خوش تھی۔ اور کیوں نہ خوش ہوتی۔ کیونکہ اس سے بہتر اور کوئی حالت میرے خیال میں نہ آسکتی تھی مجھے اپنی تمام آرزوئیں بہت ہی جلد پوری ہوتی معلوم ہوتی تھیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جب تک میں اپنے ماں باپ کے گھر میں رہی مجھے کوئی صدمہ پہنچا ہو۔ مگر ایک مرتبہ جب میری انگلی کا ایک چھلا چند اڈھبری کھیلنے میں جاتا رہا۔ موا چاندی کا تھا شاید ایک آنہ سے زیادہ کا نہ ہوگا۔ یہ اب کہتی ہوں اس وقت اتنی تیز کہاں تھی کہ قیمت کسی چیز کی مجھے معلوم ہی نہ تھی۔ اس چھلے کے پیچھے اتنا روئی کہ آنکھیں سوج گئیں۔ اماں سے دن بھر چھپایا۔ آخر جب رات کو انہوں نے انگلی خالی دیکھی مجھ سے حال پوچھا۔ اب کہنا پڑا۔ اماں نے ایک طمانچہ میرے منہ پر مارا۔ میں چیخیں مار مار کر رونے لگی ہچکیاں بندھ گئیں اتنے میں ابا آ گئے۔ انہوں نے مجھے چمکارا۔ اماں پر خفا ہوئے۔ اس وقت مجھے تسکین ہوئی۔

بے شک ابا مجھے اماں سے زیادہ چاہتے تھے۔ ابا نے کبھی بھول کر

چھڑی نہیں چھوائی ۔ اماں ذرا ذرا سی بات پر مار بیٹھتی تھیں ۔ اماں چھوٹے بھیا کو بہت چاہتی تھیں چھوٹے بھیا کے لیئے میں نے بہت مار کھائی مگر پھر بھی مجھے اس سے انتہا کی محبت تھی ۔ اماں کی ضد سے تو میں کبھی کبھی دو دو پہر میں نے گود میں نہیں لیا ۔ مگر جب ان کی آنکھ اوجھل ہوئی فوراً گلے سے لگا لیا گود میں اٹھا لیا پیار کر لیا ۔ جب دیکھا اماں آتی ہیں جلدی سے اتار دیا اب وہ رونے لگا اس پر اماں سمجھتی تھیں کہ میں نے رُلا دیا ۔ لگیں گھرکیاں دینے ۔

یہ سب کچھ تھا مگر جہاں میری انگلی دکھی اور اماں بے قرار ہو گئیں ۔ کھانے پینے کا ہوش نہیں ۔ راتوں کو نیند حرام ۔ کسی سے دوا پوچھتی ہیں کسی سے تعویذ منگاتی ہیں ۔

میرے جہیز کے لیے اپنے گلے کا گہنا اتار کے ابا کے حوالے کیا ۔ اس میں تھوڑی چاندی ملوا کے پھر سے بنوا دو ۔ دو ایک خورد جو نئے بنے ہوئے ہیں ان کو اجلوا دو ۔ گھر بھر کے برتنوں میں سے دو چار رکھ لیے باقی نکال کر الگ کر دیئے کہ ان پر قلعی کرا دو ۔ بلکہ ابا نے کہا بھی کہ اپنے آئندہ کا بھی خیال رکھو ۔ اماں نے کہا اور جیسے ہو گا ! تمہاری بہن زمیندار کی بیوی ہیں وہ بھی تو جانیں کہ بھائی نے لڑکی کو کچھ دیا ۔ لاکھ تمہاری بہن ہیں سسرال کا نام برا ہوتا ہے میری لڑکی ننگی بوچی جائے گی تو لوگ طعنے دیں گے ۔

" مرزا رسوا صاحب ! میں نے اپنے ماں باپ کے گھر اور بچپن کی حالت کا پورا نقشہ آپ کے سامنے رکھ دیا ہے ۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اگر میں اس عالم میں رہتی تو خوش رہتی یا ناخوش اسے آپ خود قیاس کر سکتے ہیں ۔ میری ناقص عقل میں تو یہ آتا ہے کہ میں اسی حالت میں اچھی رہتی

ابتلا آوارگی کی جوش وحشت کا سبب
ہم تو سمجھے ہیں مگر ناصح کو سمجھا ئیں کیا

میں نے اکثر لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ جو ذات کی رنڈیاں ہیں ان کا تو ذکر ہی کیا جو کچھ نہ کریں کم ہے کیونکہ وہ ایسے گھر اور ایسی حالت میں پرورش پاتی ہیں جہاں سوائے بدکاری کے اور کسی چیز کا مذکور ہی نہیں۔ ماں، بہن جس کو دیکھتی ہیں اسی حالت میں ہے مگر یہ ماں باپ کی بیٹیاں جو اپنے گھروں سے نکل کے خراب ہو جاتی ہیں ان کو وہاں مارے جہاں پانی نہ ملے۔

میرا حال جتنا میں بیان کر چکی ہوں اتنا ہی کہہ کے چھوڑ دوں اور یہ کہہ دوں کہ میں اس کے بعد میں آوارہ ہو گئی اس سے یہ خیال پیدا ہو گا کہ کمبخت ورماتی تھی۔ شادی ہونے میں دیر ہوئی، کسی سے آنکھ لگا کے نکل آئی۔ اس نے چھوڑ دیا۔ کسی اور سے آشنائی کی۔ اس سے بھی نہ بنی۔ آخر رفتہ رفتہ یہی پیشہ ہو گیا۔ واقعی اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت سی بہو بیٹیوں کو خراب ہوتے دیکھا اور سنا۔ اس کے سبب بھی کئی ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ جوان ہو گئیں ماں باپ شادی نہیں کرتے دوسرے یہ کہ شادی اپنی پسند سے نہیں ہوتی۔ ماں باپ نے جہاں چاہا جھونک دیا۔ نہ سن کا لحاظ کیا نہ صورت شکل دیکھی نہ مزاج کا حال دریافت کیا۔ میاں سے نہ بنی نکل کھڑی ہوئیں یا جوانی میں سر پر پہاڑ ٹوٹا رانڈ ہو گئیں۔ صبر نہ ہو سکا دوسرا کر لیا۔ یا بد صحبت ملی تو آوارہ ہو گئیں۔ مگر مجھ بدنصیب ناشدنی کو بخت و اتفاق نے مجبور کر کے ایسے جنگل میں چھوڑا جہاں سوائے گمراہی کے کوئی راستہ ہی ہی نہ تھا۔"

"دلاور خاں جس کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا۔ مگوا ڈکیتوں سے ملا ہوا تھا۔ لکھنؤ میں برسوں قید رہا۔ اسی زمانے میں نہیں معلوم کس کی سفارش سے چھوٹ آیا تھا۔ ابا سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ وجہ یہ

تھی کہ جب فیض آباد سے گرفتار ہوا تو محلہ سے اس کے چال چلن کی تحقیقات کیلئے لوگ طلب ہوتے ان میں ابا بھی تھے۔ آہ بے چارے یوں بھی دل کے سادے اور زبان کے سچے تھے اس پطرہ یہ کہ برائی: ایک صاحب نے ان کے ہاتھ میں قرآن دے کے پوچھا۔" دل جمعدار! تم سچ سچ کہئے یہ کیسا آدمی ہے؟" ابا نے صاف صاف جو اس کا حال تھا کہہ دیا۔ انہیں کی گواہی پر دلاور خاں قید ہو گیا۔ یہ حال میں نے اپنی ماں سے سُنا تھا۔ وہی کینہ اس کے دل میں چلا آتا تھا اب کی جب قید سے چھوٹ کر آیا تو اس نے ابا کی ضد پر کبوتر پالے۔ ایک دن اس نے ابا کا کبوتر مارا۔ لینے کو گئے نہ دیا۔ ابا چار آنے دیتے تھے وہ آٹھ آنے مانگتا تھا۔ ابا تو نوکری پر چلے گئے جھٹ پٹے دنت خدا جانے میں کہاں نکلی تھی۔ دیکھتی کیا ہوں املی کے پیچھے کھڑا ہوا ہے۔ کہنے لگا،" چلو بیٹا تمہارے ابا پیسے دے گئے تھے کبوتر لیے لو۔" میں اس کے دم آ گئی۔ ساتھ چلی گئی۔ جا کے جو دیکھتی ہوں گھر میں کالی چڑیا نہیں۔ ایک بڑا مکان پڑا ہے ادھر میں مکان میں داخل ہوئی ادھر اس نے اندر سے کنڈی بند کر لی۔ چاہتی ہوں کہ چیخوں، اس نے منہ میں گودڑ ٹھونس دیا میرے دونوں ہاتھ رومال سے کس دیئے اس مکان کا دروازہ ایک دوسری طرف تھا۔ مجھے زمین پہ بٹھا کے آپ گیا۔ وہ دروازہ کھولا اور پیر بخش کہہ کے آواز دی۔ پیر بخش اندر آیا۔ دونوں نے مل کر مجھے بیل گاڑی پر سوار کیا کہ گاڑی چل نکلی۔ میں دم بخود رہ گئی۔ تلے کی سانس تلے اوپر کی اوپر کر دن کیا کوئی بس نہیں۔ موذی کے چنگل میں ہوں دلاور خاں مجھے بہلی کے اندر گھٹنوں میں دبائے بیٹھا ہے ہاتھ میں چھری ہے موتے کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے پیر بخش گاڑی ہانک رہا ہے بیل ہیں کہ اُڑے چلے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ جاڑے کے

دن تھے سناٹے کی ہوا چل رہی تھی۔ سردی کے مارے میری بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ دم نکلا جاتا تھا آنکھوں سے باران جاری تھا یہ خیال آتا ہے ہائے کس آفت میں پھنسی ابا نوکری پر سے آتے ہوں گے مجھے ڈھونڈتے ہوں گے اماں رو پیٹ رہی ہوں گی چھوٹا بھائی کھیل رہا ہوگا۔ اُسے کیا معلوم بہن کس آفت میں ہے۔ ماں، باپ، بھائی، مکان کا دالان، انگنائی، باورچی خانہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے تھا یہ سب خیالات ایک طرف تھے اور جان کا خوف ایک۔ دلاور خاں گھڑی گھڑی چھری دکھاتا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا کہ اب کوئی دم میں یہ چھری میرے کلیجے کے پار ہوگی۔ گو ڈر اب میرے منہ میں نہ تھا مگر مارے ڈر کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ادھر میرا تو یہ حال تھا اُدھر دلاور خاں اور پیر بخش میں ہنس ہنس کے باتیں ہو رہی تھیں۔ میرے ماں باپ پر اور مجھ پر بات بات پر گالیاں پڑتی جاتی تھی۔

دلاور خاں:" دیکھا بھائی پیر بخش! سپاہی کا پوت بارہ برس کے بعد اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ اب کیسا تلملایا پھرتا ہوگا۔

پیر بخش:" بھئی تم نے بے شک اس مثل کو اصل کر دکھایا۔ بارہ برس تو ہوتے ہوں گے تمہیں قید ہوئے"

دلاور خاں:" پورے بارہ برس ہوئے، بھائی لکھنؤ میں کیا کیا مصیبتیں اٹھائی ہیں۔ خیر .... وہ بھی تو کوئی دن یاد کرے گا۔ یہ تو میرا پہلا وار تھا۔ میں تو اس کو جان سے ماروں گا"

پیر بخش:" کیا یہ بھی ارادہ ہے؟"

دلاور خاں:" تم سمجھتے کیا ہو۔ جان سے نہ مارا تو پٹھان کا تخم نہیں"

پیر بخش۔ بھئی تم قول کے سچے ہو جو کہو گے کر دکھاؤ گے"

دلاور خاں:" دیکھنا"

پیر بخش ۔" اور اسے کیا کرو گے ؟"

دلاور خاں "کریں گے کیا۔ یہیں کہیں مار کے نالے میں توپ دیں۔ راتوں رات گھر چلے چلو ۔"

یہ بات سن کر مجھے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو تھم گئے۔ دل میں ایک دھچکا سا لگا سنکا ڈھل گیا۔ ہاتھ پاؤں ڈال دیئے یہ حال دیکھ کے بھی موئے کٹڑ کو ترس نہ آیا اور ایک گھونسہ زور سے میرے کلیجے پر مارا کہ میں بلبلا گئی۔ قریب تھا کہ گر پڑوں ۔

پیر بخش "اسے تو مار ڈالو گے اور ہمارا روپیہ ؟"

دلاور خاں "گلے گلے پانی !"

پیر بخش "کہاں سے دو گے ہم تو کچھ اور ہم سمجھے تھے ۔"

دلاور خاں "گھر چلو۔ کہیں سے نہ ہو سکے گا تو کبوتر بیچ کے دیدوں گا ۔"

پیر بخش "تم بے عقل ہو۔ کبوتر کیوں بیچو، ہم نہ ایک بات بتائیں ۔"

دلاور خاں "کہو۔"

پیر بخش ۔ اماں لکھنؤ ہی چل کے اس چھوکری کے کوڑے کر لو۔

جب سے اپنے مرنے کا یقین ہو گیا تھا مجھے ان دونوں موذیوں کی باتیں کانوں سے اچھی طرح سنائی نہ دیتی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی خواب میں باتیں کر رہا ہے۔ پیر بخش کی باتیں سن کے میرے دل کو پھر اپنی زندگی کا کچھ آسرا بندھا۔ دل ہی دل میں پیر بخش کو دعائیں دینے لگی۔ مگر اب یہ انتظار ہے کہ دیکھوں یہ موذی کیا کہتا ہے ۔

دلاور خاں "اچھا دیکھا جائے گا۔ ابھی چلے چلو ۔"

پیر بخش "یہاں ذرا ٹھہر نہ جائیں۔ وہ سامنے درخت کے نیچے آگ جل رہی

ہے۔ تھوڑی آگ لے آئیں تو حقہ بھریں۔"

پیر بخش تو آگ لینے گیا، مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں پیر بخش کے آنے تک یہ میرا کام نہ تمام کر دے۔ جان کا خوف بڑا ہوتا ہے۔ اک بارگی زور سے چیخ ماری۔ یہ چیخ کا مارنا تھا کہ دلاور خاں نے دو تین طمانچے میرے منہ پر کس کس کے لگائے۔ "حرامزادی چپ نہیں رہتی ابھی چھری بھونک دوں گا ...... فیل کرتی ہے ....."

پیر بخش۔ (ابھی تھوڑی ہی دور گیا ہوگا) "نہیں بھئی نہیں ایسا کام نہ کرنا نہیں ہمارے سر کی قسم۔ ارمان ہے تو آ لینے دو۔"

دلاور خاں: "اچھا جاؤ۔ آگ تو لے آؤ۔"

پیر بخش گیا اور تھوڑی کے بعد آگ لے کے آیا۔ حقہ بھرا۔ دلاور خاں کو دیا۔

دلاور خاں۔ (ایک کش حقہ کا پی کے) تو یہ کتنے تک بک جائے گی؟ اور بیچے گا کون ایسا نہ ہو کہیں پکڑے جائیں تو اور مشکل ہو۔"

پیر بخش: اس کا ہمارا ذمہ۔ ہم تو بیچ دیں گے۔ ارے میاں تمہاری باتیں۔ پکڑے گا کون؟ لکھنؤ میں ایسے معاملے دن رات ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے سالے کو جانتے ہو؟"

دلاور خاں: "کریم؟"

پیر بخش: "ہاں۔ اس کی روزی اسی پر ہے۔ بیسیوں لڑکے لڑکیاں پکڑ لے گیا۔ لکھنؤ میں جا کے دام کھرے کر لیے۔"

دلاور خاں: "آج کل کہاں ہے وہ؟"

پیر بخش: "کہاں ہے؟ لکھنؤ گومتی کے اس پار اس کی سسرال ہے۔ وہیں ہوگا۔"

دلاور خاں: "بھلا لڑکا لڑکی کتنے کو بکتے ہیں؟"

پیر بخش: "جیسی صورت ہوتی۔"

دلاور خاں: "بھلا یہ کتنے کو بک جائے گی؟"

پیر بخش " سوڈیڑھ سو جیسی تمہاری تقدیر ہوئی "

دلاور خاں " بھائی کی باتیں۔ سوڈیڑھ سو۔ اس کی صورت ہی کیا ہے؟ سو بھی تو بہت ہے "

پیر بخش " اچھا اس سے کیا۔ لے تو چلو مارڈالنے سے فائدہ کیا "

اس کے بعد دلاور خاں نے پیر بخش کے کان میں کچھ جھک کے کہا جس کو میں نے نہیں سنا۔ پیر بخش نے جواب دیا " وہ تو ہم سمجھے ہی نہیں۔ تم کیا ایسے بیوقوف ہو "

رات بھر گاڑی چلا کی۔ میری جان سانسے میں تھی موت آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ طاقت سلب ہو گئی تھی۔ بدن سُن ہو گیا تھا۔ آپ نے سنا ہوگا کہ نیند سولی پر بھی آتی ہے۔ تھوڑی دیر میں آنکھ لگ گئی۔ ترس خدا کر کے پیر بخش نے بیلوں کا کمبل اڑھا دیا۔ رات کو کئی مرتبہ چونک پڑی۔ آنکھ کھل جاتی تھی مگر ڈر کے مارے چپکی پڑی تھی۔ آخر ایک مرتبہ ڈرتے ڈرتے منہ پر کمبل سرکا کے جو دیکھا میں گاڑی میں اکیلی ہوں۔ پردے سے جھانک کر دیکھا سامنے کچھ کچے مکان ہیں۔ ایک بنیئے کی دکان ہے۔ دلاور اور پیر بخش کچھ خر بدر رہے ہیں بیل سامنے برگد کے درخت کے نیچے بھوسہ کھا رہے ہیں۔ دو تین گنوار الاؤ کے پاس بیٹھے تاپ رہے ہیں۔ ایک چلم پی رہا ہے۔ اتنی دیر میں پیر بخش نے گاڑی کے پاس آکے تھوڑے سے بھنے ہوئے چنے دیئے۔ میں رات بھر کی بھوکی تھی کھانے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لوٹا پانی لا کے دیا۔ میں نے تھوڑا سا پیا چپکی ہو کے پڑ رہی۔

بڑی دیر تک گاڑی یہاں رُکی رہی۔ پھر پیر بخش نے بیل جوتے۔ دلاور خاں حقہ بھر کے میرے پاس آ بیٹھا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ آج دن کو میرے اوپر زیادہ سختی نہیں ہوئی۔ نہ دلاور خاں کی چھری نکلی نہ مجھ پر گھونسے پڑے۔ نہ گھرکیاں۔ دلاور خاں اور پیر بخش جگہ جگہ پر حقہ بھر بھر کے پیتے تھے۔ باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جب باتیں کرتے کرتے تھک گئے کچھ گانے لگے۔ ایک گاتا ہے دوسرا چپکا سن رہا ہے۔ سن کیا

رہا ہے سوچ رہا ہے کہ اب کیا بات نکالو۔ پھر کوئی بات نکل آئی۔ اس گفتگو میں اکثر ایسا بھی ہوا کہ آپس میں گالی گلوچ ہوگئی۔ آستینیں چڑھ گئیں کمریں کسی جانے لگیں۔ ایک ڑی پرے کو دوڑتا ہے دوسرا اپنا گلا گھونٹنے کو تیار ہے۔ پھر کسی بات پر دونوں ڈھیلے ڑ گئے۔ بات رفت گذشت ہوئی پھر ملاپ ہوا۔ دوستی کی باتیں ہونے لگیں۔ گویا کبھی لڑے ہی نہ تھے۔

ایک: "ہمارے تمہارے درمیان لڑائی ہی کی کیا بات تھی"

دوسرا: "بات ہی کیا تھی۔"

پہلا: "اچھا تو پھر اس بات کو جانے دو۔"

دوسرا: "جانے دو!"

(۱)

دے پھڑکنے کی اجازت صیاد
شبِ اوّل ہے گرفتاری کی!

•

گرفتاری کی شبِ اوّل کا حال تو آپ سن چکے۔ ہائے وہ بے بسی مرتے دم تک نہ بھولوں گی۔ مجھے خود حیرت ہے کہ میں کیونکر زندہ بچی۔ ہے ہے کیا سخت جان تھی کہ دم نہ نکلا۔ دلاور خاں بندے! دنیا میں تو خیر اپنی سزا کو پہنچا۔ مگر کیوں اس کے دل دل کو تسکین ہوئی۔ مونئے کی بوٹیاں کاٹ کاٹ کر کھلاتی تو بھی مجھے آہ نہ آتی۔ یقین ہے کہ قبر میں تجھ پر صبح و شام جہنم کے کندے پڑتے ہوں گے اور قیامت کے دن خدا چاہے تو اس سے بدتر درجہ ہوگا۔

ہائے میرے ماں باپ کا کیا حال ہوا ہوگا۔ کیسے میری جان کو کلپتے ہوں گے۔ بس مرزا صاحب! اتنی آج کہی باقی کل کہوں گی۔ اب میرا دل ہے کہ امڈا آتا ہے۔ جی چاہتا ہے خوب چیخیں مار مار کے روؤں ......

اب میری آوارگی کی سرگذشت سن کے کیا کیجیے گا۔ بہتر ہے کہ یہیں تک رہنے دیجیے۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ کاش دلاور خاں مجھ کو مار ہی ڈالتا تو اچھا تھا۔ مٹھی بھر خاک سے میری آبرو ڈھک جاتی۔ میرے ماں باپ کی عزت کو دھبہ نہ لگتا۔ یہ دن دنیا کی روسیاہی تو نہ ہوتی۔

ہاں میں نے ایک بار اپنی ماں کو پھر دیکھا تھا۔ کب اس کو دیکھا تھا، اس کو ایک زمانہ ہوا۔ اب خدا جانے جیتی ہیں یا مرگئیں۔ سنا ہے کہ چھوٹے بھائی کے ایک لڑکا ہے

ما شاء اللہ چودہ پندرہ برس کا ۔ دو لڑکیاں ہیں ۔ میرا بے اختیار جی چاہتا ہے کہ ان سب کو دیکھوں ۔ کچھ ایسا دور بھی نہیں ۔ موئے ایک روپیہ میں تو آدمی فیض آباد پہنچ سکتا ہے مگر کیا کروں مجبور ہوں ۔ اس زمانے میں جب ریل نہ تھی فیض آباد سے لکھنؤ چار دن کا راستہ تھا ۔ مگر دلاور خاں اس خوف سے کہ کہیں میرا باپ پیچھا نہ کرے ۔ نہ معلوم کن بھیڑ راستوں سے لایا ۔ کوئی آٹھ دن میں لکھنؤ پہنچی ۔ مجھ نگوڑی کو کیا خبر تھی کہ لکھنؤ کہاں ہے مگر دلاور خاں اور پیر بخش کی باتوں سے میں اتنا سمجھ گئی تھی کہ یہ لوگ مجھے وہیں لیئے جاتے ہیں ۔ لکھنؤ کا میں نام گھر میں سنا کرتی تھی ۔ کیوں کہ میرے نانا یہیں کسی محل کی ڈیوڑھی پر سپاہیوں میں نوکر تھے ۔ گھر میں ان کا ذکر ہوتا ہی رہتا تھا ۔ ایک مرتبہ وہ فیض آباد بھی گئے تھے ۔ میرے لیے بہت سی مٹھائی اور کھلونے لے گئے تھے ۔ میں انہیں اچھی طرح پہچانتی تھی ۔

لکھنؤ میں گومتی اس پار کریم کی سسرال میں مجھے لاکر اتارا ۔ چھوٹا سا کچا مکان کریم کی ساس موٹی مردے شو سی معلوم ہوتی تھی مجھے گھر میں لے گئی ۔ ایک کوٹھری میں بند کردیا ۔ صبح ہوتے لکھنؤ پہنچی تھی ۔ دوپہر تک بند رہی ۔ پھر کوٹھری کا دروازہ کھلا ۔ ایک جوان سی عورت (کریم کی جورو) تین چپاتیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں چمچہ بھر ماش کی دال اور ایک بدھنی پانی کی میرے آگے رکھ کے چلی گئی ۔ مجھے اس وقت وہ بھی نعمت ہوگئی ۔ آٹھ دن ہو گئے تھے گھر کا پکا کھانا نصیب نہ ہوا تھا ۔ راستے میں چنے اور ستوؤں کے سوا کچھ ملا ہی نہ تھا ۔ کوئی آدھی بدھنی بھر پانی پی گئی ۔ اس کے بعد زمین پر پاؤں پھیلا کے سو رہی ۔ خدا جانے کتنی دیر سوئی ۔ کیونکہ اس اندھیری کوٹھری میں دن رات کی تمیز نہ ہو سکتی تھی ۔ اس درمیان میں کئی مرتبہ آنکھ کھلی چاروں طرف اندھیرا نہ کوئی آس نہ پاس ۔ پھر اوڑھنی سے منہ ڈھانپ کے پڑ رہی ۔ پھر نیند آگئی تیسری چوتھی مرتبہ جو آنکھ کھولی تو پھر نیند نہ آئی پڑی جاگتی رہی ۔ اتنے میں کریم کی

ساس ڈائن کی شکل بکتی بڑبڑاتی اندر آئی۔ میں اٹھ بیٹھی۔

"لونڈیا کتنی سوتی ہے۔ رات کو چیختے چیختے گلا پڑ گیا۔ جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے اٹھایا سانس ہی نہ لی۔ میں تو سمجھی تھی کہ سانپ سونگھ گیا۔ اے لو وہ تو پھر اٹھ بیٹھی۔"

میں چپکے سنا کی۔ جب خوب بک چکی تو پوچھنے لگی......

"پیالہ کہاں ہے؟" میں نے اٹھا دیا۔ وہ باہر لے کر نکلی۔ دروازہ بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کریم کی جورو آئی۔ اسی کوٹھری میں ایک کھڑکی لگی تھی اسے کھول دیا مجھ کو باہر نکالا۔ ایک ٹوٹا سا کھنڈر پڑا تھا۔ یہاں آ کے آسمان دیکھنا نصیب ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر اسی کال کوٹھری میں بند کر دی گئی۔ آج ارہر کی دال اور جوار کا دلیہ کھانے کو ملا۔

اسی طرح دو دن گزرے۔ تیسرے دن ایک اور لڑکی مجھ سے سن میں دو ایک برس بڑی اسی کوٹھری میں لا کے بند کی گئی۔ کریم خدا جانے کہاں سے پھسلا کر لے آیا تھا۔ بے چاری کیسی چپکو پیکو روتی تھی مجھ کو اس کا آنا غنیمت ہو گیا۔ جب وہ رو دھو چکی تو چپکے باتیں ہوا کیں۔

کسی بنئے کی لڑکی تھی۔ رام دیئی نام تھا۔ سیتا پور کے پاس کوئی گاؤں تھا وہاں کی رہنے والی تھی۔ اندھیرے میں تو اس کی شکل دکھائی نہ دی۔ جب حسب معمول دوسرے دن کھڑکی کھولی گئی تو اس نے مجھ کو دیکھا میں نے اس کو دیکھا گوری تھی۔ بہت خوبصورت ناک نقشہ ڈیل ڈول ذرا بھرا تھا۔

چوتھے دن اس کال کوٹھری سے اس کی رہائی ہوئی۔ میں وہیں رہی پھر تنہائی نصیب ہوئی۔ دو پہر دن اکیلی وہیں رہی۔ تیسرے دن رات کے وقت دلاور خاں اور پیر بخش نے مجھے آ کے نکالا۔ اپنے ساتھ لے کے چلے۔ چاندنی رات تھی۔ پہلے ایک میدان پھر ایک بازار میں سے ہو کے گزری۔ پھر ایک پل پر آئے دریا لہریں مار رہا تھا۔

ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ میں کانپی جا رہی تھی۔ تھوڑی دور کے بعد ایک بازار بھر ملا اس سے نکل کے ایک تنگ گلی میں بہت دور تک جانا پڑا۔ پاؤں تھک گئے۔ اس کے بعد ایک اور بازار میں آئے یہاں بڑی بھیڑ تھی۔ راستہ مشکل سے ملتا تھا۔ اب ایک مکان کے دروازہ پر پہنچی۔

مرزا رسوا صاحب! آپ سمجھے یہ کون سا بازار تھا؟ یہ وہ بازار تھا جہاں میری عزت فروشی کی دکان تھی۔ یعنی چوک۔ اور یہ وہ بازار تھا جہاں سے ذلت عزت، بدنامی، نیک نامی، زرد روئی، سرخ روئی جو کچھ دنیا میں ملنا تھا ملا یعنی خانم جان کے مکان کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ تھوڑی دور پر زینہ تھا۔ زینہ سے چڑھ کے اوپر گئی۔

مکان کے صحن میں سے ہو کے صدر دالان کے داہنی طرف ایک دالان وسیع میں خانم جان کے پاس گئی۔

خانم صاحب کو آپ نے دیکھا ہوگا۔ اس زمانے میں ان کا سن قریب پچاس برس کے تھا۔ کیا شاندار بڑھیا تھی۔ رنگ تو سانولا تھا مگر ایسی بھاری بھرکم جامہ زیب عورت دیکھی نہ سنی۔ بالوں کے آگے کی لٹیں بالکل سفید تھیں۔ ان کے چہرے پر بھلی معلوم ہوتی تھیں ململ کا دوپٹہ سفید، کیسا باریک چنا ہوا کہ شاید و باید۔ اودے مشروع کا پائجامہ۔ بڑے بڑے پائنچے۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے سونے کے کڑے، کلائیوں میں پھنسے ہوئے۔ کانوں میں سادی دو انٹیاں لاکھ لاکھ بناؤ دیتی تھی۔ بسم اللہ کی رنگت، ناک نقشہ ہو بہو انہیں کا سا تھا۔ مگر وہ نمک کہاں۔ اس دن کی صورت خانم کی مجھے آج تک یاد ہے۔ پلنگڑی سے لگی ہوئی قالین پر بیٹھی ہیں۔

کنول روشن ہے۔ بڑا سا نقشی پان دان آگے کھلا رکھا ہے۔ پیچوان پی

رہی ہیں۔ سامنے ایک سانولی سی لڑکی (بسم اللہ جان) ناچ رہی ہے۔ ہمارے جانے کے بعد ناچ موقوف ہوا۔ سب لوگ کمرے سے چلے گئے۔ معاملہ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔

خانم جان: "یہ ہی وہ چھوکری ہے"

دلاور خاں: "جی ہاں"

مجھے پاس بلایا۔ چمکار کے بٹھایا۔ ماتھا اٹھا کے صورت دیکھی۔

خانم جان: "اچھا! پھر جو ہم نے کہہ دیا ہے وہ موجود ہے اور دوسری چھوکری کیا ہوئی؟"

پیر بخش: "اُس کا تو معاملہ ہو گیا"

خانم: "کتنے پر؟"

پیر بخش: "دو سو پر"

خانم: "اچھا، خیر۔ کہاں ہوا؟"

پیر بخش: "ایک بیگم صاحبہ نے اپنے صاحبزادہ کے واسطے مول لیا ہے"

خانم: "صورت شکل کی اچھی ہے۔ اس قدر ہم بھی دے نکلتے، مگر تم نے جلدی کی"

پیر بخش: "میں کیا کروں۔ میں نے تو بہت سمجھایا میرے سالے نے نہ مانا"

دلاور خاں: "صورت تو اس کی اچھی ہے۔ آگے آپ کی پسند"

خانم: "خیر آدمی کا بچہ ہے"

دلاور خاں: "اچھا جو کچھ ہے آپ کے سامنے حاضر ہے"

خانم: "اچھا تمہاری ہی ضد سہی"

یہ کہہ کے حسینی کو آواز دی۔ حسینی گدبدی سی سانولی ادھیڑ عورت

سامنے آ کھڑی ہوئی۔

خانم: "حسینی!"

حسینی: "خانم صاحب!"

خانم: "صندوقچہ لاؤ۔"

حسینی گئی۔ صندوقچہ لے آئی۔ خانم صاحبہ نے صندوقچہ کھولا۔ بہت سے روپے دلاور خاں کے سامنے رکھ دیے۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ سوا سو روپے دیے تھے۔"

ان میں سے کچھ روپے پیر بخش نے گن کے اپنے رومال میں باندھے (سنا ہے کہ پچاس روپے) باقی دلاور خاں مردے نے اپنے ڈبے میں رکھے۔ دونوں سلام کر کے رخصت ہوئے۔ اب کمرہ میں خانم صاحب ہیں اور بوا حسینی اور میں ہوں۔

خانم صاحب۔ (حسینی سے) حسینی! یہ چھوکری اتنے داموں میں کچھ مہنگی تو نہیں معلوم ہوتی؟

حسینی: "مہنگی! میں کہتی ہوں سستی!"

خانم: "سستی بھی نہیں ہے۔ خیر ہوگا صورت تو بھولی ہے۔ خدا جانے کس کی لڑکی ہے۔ ہائے ماں باپ کا کیا حال ہوگا۔ خدا جانے کہاں سے موئے پکڑ لاتے ہیں۔ ذرا بھی خوف خدا نہیں۔ بوا حسینی! ہم لوگ بالکل بے قصور ہیں۔ عذاب ثواب انہیں موؤں کی گردن پر ہوتا ہے۔ ہم سے کیا۔ آخر یہاں نہیں بکتی کہیں اور بکتی!"

حسینی: "خانم صاحب! یہاں پھر اچھی رہے گی۔ آپ نے سنا نہیں بیویوں میں لونڈیوں کی کیا گتیں ہوتی ہیں!"

خانم :" سنا کیوں نہیں ۔ اے ابھی اس دن کا ذکر ہے ۔ سنا تھا سلطان جہاں بیگم نے اپنی لونڈی کو کہیں میاں سے بات کرتے دیکھ لیا تھا۔ سیخچوں سے داغ کے مار ڈالا ۔

حسینی :" جو چاہیں کریں ۔ قیامت کے دن ایسی بیویوں کا منہ کالا ہوگا۔"

خانم :" منہ کالا ہوگا۔ جہنم کے کندے بڑیں گے ۔"

حسینی :" خوب ہوگا ۔ موئیوں کی یہی سزا ہے ۔"

اس کے بعد حسینی نے بڑی منت سے کہا ۔

" بیوی یہ چھوکری تو مجھے دے دیجیے۔ میں پالوں گی۔ ہاں آپ کہاں ہے خدمت میں کر دیا کروں گی ۔

خانم :" تمہیں پالو ۔"

اب تک بوا حسینی کھڑی ہوئی تھیں ۔ اس گفتگو کے بعد میرے پاس بیٹھ گئیں ۔ مجھ سے باتیں کرنے لگیں ۔

حسینی :" بچی تو کہاں سے آتی ہے ؟"

میں :" (رو کے) بنگلے سے ۔"

حسینی :" (خانم سے) بنگلہ کہاں ہے ؟"

خانم :" اے ہے نھی ہو ؟ فیض آباد کو بنگلہ بھی کہتے ہیں ۔"

حسینی :" (مجھ سے) تمہارے ابا کا کیا نام ہے ۔"

میں :" جمعدار ۔"

خانم :" تم بھی غضب کرتی ہو بھلا وہ نام کیا جانے ۔ ابھی بچہ ہے ۔"

حسینی :" اچھا تمہارا نام کیا ہے ؟"

میں :" امیرن ۔"

خانم: "بھئی یہ نام تو ہمیں پسند نہیں۔ ہم تو امراؤ کہکر پکاریں گے۔"
حسینی: "سنا بچی امراؤ کے نام پر تم بولنا۔ جب بیوی کہیں گی "امراؤ" تم کہنا جی۔"

اُس دن سے امراؤ میرا نام ہو گیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب میں رنڈیوں کے شمار میں آئی تو لوگ امراؤ جان کہنے لگے۔

خانم صاحبہ مرتے دم تک امراؤ کہا کیں۔ بوا حسینی امراؤ صاحب کہتی تھیں اس کے بعد بوا حسینی مجھے اپنی کوٹھری میں لے گئیں۔ اچھا اچھا کھانا کھلایا۔ مٹھائیاں کھلائیں۔ منہ ہاتھ دھلایا۔ اپنے پاس سلا رکھا۔

آج رات میں نے اپنے ماں باپ کو خواب میں دیکھا۔ جیسے ابا نوکری سے آئے ہیں۔ مٹھائی کا دونا ہاتھ میں ہے چھوٹا بھائی سامنے کھیل رہا ہے۔ اس کو مٹھائی کی ڈلیاں نکال کے دیں۔ مجھے پوچھ رہے ہیں جیسے میں دوسرے دالان میں ہوں۔ اماں باورچی خانے میں ہیں۔ اتنے میں ابا کو جو دیکھا دوڑ کے لپٹ گئی۔ رو رو کے اپنا حال کہہ رہی ہوں۔

خواب میں اتنا روئی کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔ بوا حسینی نے پیار کیا۔ آنکھ جو کھلی کیا دیکھتی ہوں۔ نہ وہ گھر ہے نہ دالان۔ نہ ابا ہیں نہ اماں۔ بوا حسینی کی گود میں پڑی رو رہی ہوں۔ بوا حسینی آنسو پوچھ رہی ہیں۔ چراغ روشن ہے میں نے دیکھا کہ بوا حسینی کے آنسو بھی برابر جاری ہیں۔

واقعی بوا حسینی بڑی نیک ذات عورت تھی۔ اس نے مجھ پر وہ شفقت کی کہ چند ہی روز میں، میں اپنے ماں باپ کو بھول گئی اور بھولتی نہ تو کرتی کیا۔ اول تو مجبوری دوسرے نئے ڈھنگ نئے رنگ۔ اچھے سے اچھا کھانے کو۔ کھانے وہ جن کے ذائقے سے بھی آگاہ نہ تھی، کپڑے وہ جو میں نے کبھی خواب

بس کبھی نہ دیکھے تھے۔ تین لڑکیاں، بسم اللہ جان، خورشید جان، امیر جان ساتھ کھیلنے کو۔ دن رات ناچ گانا، جلسے تماشے، میلے، باغوں کی سیر۔ وہ کون سا ایسا عیش کا سامان تھا جو مہیا نہ تھا۔

مرزا صاحب! آپ کہیں گے کہ میں بڑے کٹر دل کی تھی کہ بہت جلد اپنے ماں باپ کو بھول کر کھیل کود میں پڑ گئی۔ اگرچہ میرا سن بہت کم تھا مگر خانم کے مکان میں آنے کے ساتھ ہی میرے دل کو آگاہی سی ہو گئی کہ اب مجھے عمر بھر یہیں بسر کرنا ہے۔ جیسے ننھی دلہن اپنی سسرال جا کے سمجھ لیتی ہے کہ میں یہاں ایک، دو دن کے لیے نہیں بلکہ مرنے اور بھرنے کے لیے آئی ہوں۔ ٹھیک وہی میرا حال تھا۔ راستے میں موئے ڈاکوؤں کے ہاتھوں ایسے وہ ایذا اٹھائی تھی کہ خانم کا مکان میرے لیے بہشت تھا۔ ماں باپ کے ملنے کو میں بالکل ناممکن سمجھ چکی تھی اور جو چیز ناممکن سمجھ لی جاتی ہے اس کی آرزو باقی نہیں رہتی۔ اگرچہ فیض آباد لکھنؤ سے صرف بہ کوس ہے مگر اس زمانے میں مجھے بے انتہا دور معلوم ہوتا تھا۔ بچپن کی سمجھ میں اور اب میں بڑا فرق معلوم ہوتا ہے۔"

(۳)

اِک حال میں انسان کی بسر ہو نہیں سکتی
اب رنگ طبیعت کا بہل جائے تو اچھا

مرزا رسوا صاحب! خانم کا مکان تو آپ کو یاد ہوگا، کس قدر وسیع تھا۔ کتنے کمرہ تھے۔ ان سب میں رنڈیاں (خانم کی نوچیاں) رہتی تھیں۔ بسم اللہ (خانم کی لڑکی) اور خورشید میری ہمسنیں تھیں۔ ان کی اچھی رنڈیوں گنتی نہ تھی۔ ان کے علاوہ دس گیارہ ایسی تھیں۔ جو الگ الگ کمروں میں رہتی تھیں۔ ہر ایک کا عملہ جدا تھا۔ ہر ایک کا دربار علیحدہ ہوتا تھا۔ ایک سے ایک خوبصورت تھی۔ سب گہنے پاتے سے آراستہ۔ ہر وقت بنی ٹھنی۔ تولواں جوڑے پہنے۔ سادے کپڑے جو ہم لوگ پہنے رہتے تھے۔ وہ اور رنڈیوں کو عید بقرعید میں نہیں نصیب ہوتے خانم کا مکان تھا کہ ایک پرستان تھا جس کمرے میں جا نکلو سوائے ہنسی مذاق گانے بجانے کے اور کوئی چرچہ نہ تھا۔ اگرچہ میں کمسن تھی مگر پھر بھی عورت ذات بڑی ہوشیار ہوتی ہے۔ اپنے مطلب کی باتیں سمجھتی تھی۔ بسم اللہ خورشید کو گانے ناچنے دیکھ کے میرے دل میں خود بخود ایک امنگ سی پیدا ہوئی۔ بجائے خود گنگنانا اور تھرکنے لگی۔ اس عرصہ میں میری بھی تعلیم شروع ہوگئی۔ میری طبیعت فن موسیقی سے بہت ہی مناسب پائی گئی۔ آواز بھی پکے گانے کے لائق تھی۔ سرگم صاف ہونے کے بعد استاد نے آستائی شروع کرادی۔ استاد جی بہت اصول سے تعلیم دیتے تھے۔ ہر ایک راگ کا سر بیوہ زبانی یاد کرایا جاتا تھا۔ اور وہی گلے سے نکلواتے

تھے ۔ مجال نہ تھی کوئی سُر کومل سے ات کومل، سدھ سے اسدھ یا تیور سے تیور تر ہوجائے اور میری بھی جھنجھٹیں کرنے کی عادت تھی ۔ پہلے تو استاد جی (خدا کرے ان کی روح شرمندہ نہ ہو) ٹال دیا کرتے تھے ۔

ایک دن میں خانم صاحب کے سامنے رام کلی گا رہی تھی ۔ دھیوت سدھ لگ گئی ۔ استاد جی نے نہ ٹوکا ۔ خانم صاحب نے پھر اس کو کہوایا ۔ میں نے پھر اسی طرح کہا ۔ استاد جی پھر باخبر نہ ہوئے ۔ خانم صاحب نے گھور کے دیکھا ۔ میں استاد جی کا منہ دیکھنے لگی ۔ انہوں نے سر جھکا لیا ۔ پھر تو خانم نے ان کو آڑے ہاتھوں لیا ۔

خانم " استاد جی ! یہ کیا تھا ۔ رام کلی میں اوچار دھیوت سے ہے اور نہی سر ٹھیک نہیں ۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں دھیوت کومل ہے یا سدھ ؟

استاد " کومل "

خانم " او چھوکری ! تو نے کیا کہا تھا ؟"

استاد " سدھ "

خانم " پھر آپ نے ٹوکا کیوں نہیں ؟"

استاد " کچھ مجھے خیال نہیں رہا "

خانم " واہ ۔ خیال کیوں نہیں رہا ۔ اسی لیے میں نے دوبارہ کہوایا ۔ پھر بھی آپ منہ میں گھنگھنیاں بھرے بیٹھے رہے ۔ آپ اسی طرح چھوکریوں کو تعلیم دیتے ہیں ۔ ابھی کسی سمجھدار کے سامنے اسی طرح گاتی تو کیا وہ میرے جسم میں تھوکتا

اُستاد جی اس وقت تو بہت ہی خفیف ہوتے ۔ چپ ہو رہے ۔ مگر دل میں بات لیے رہے ۔ استاد جی اپنے کو نائک سمجھتے تھے ۔ اور تھے بھی ایسے ہی اُس دن خانم کا ٹوکنا اُن کو بہت ہی ناگوار ہوا ۔

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ میں سوہا گا رہی تھی۔ خانم بھی موجود تھیں۔ میں نے استاد جی سے پوچھا گندھار اس میں کومل ہے یا اَت کومل؟

استاد جی: "اَت کومل"

خانم: خاں صاحب! ماشاءاللہ۔ یہ میرے سامنے۔

استاد: "کیوں؟"

خانم: "اور پھر مجھی سے پوچھتے ہیں کیوں؟ سوہا میں گندھار کومل ہے؟ بھلا آپ تو کہیئے"

استاد: "(کہنے لگے) گندھار کومل لگا گیے"

خانم: "بس آپ ہی قائل ہو جیئے۔ خود آپ کومل کہیں اور چھوکری کو بہکاتے ہیں یا مجھے کیتے ہیں۔ خاں صاحب میں کچھ عطائی نہیں۔ ہماک چاٹ کے کہتی ہوں گلے سے ادا ہو مگر ان کانوں نے کیا نہیں سُنا، میں بھی ایسے ویسے گھرانے کی شاگرد نہیں ہوں۔ میاں غلام رسول کو آپ جانتے ہوں گے۔ ان باتوں سے کیا فائدہ۔ اگر بتانا ہو تو دل سے بتایئے۔ نہیں تو معاف کیجئے میں اور کوئی بندوبست کر لوں گی چھوکری کو غارت نہ کیجئے۔"

استاد جی: "بہت خوب"

یہ کہہ کے اٹھ گئے۔ کئی دن نہیں آتے۔ خانم خود تعلیم دینے لگیں۔ چند روز کے بعد خلیفہ بیچ میں پڑے۔ تسماقسمی ان کے ملاپ ہو گیا۔ اس دن سے استاد جی ٹھیک بتانے لگے۔ بتاتے نہ تو کرتے کیا، وہ خانم کو استاد سمجھتے تھے عمر بھر مجھے حیرت رہی کہ خانم زیادہ جانتی ہیں یا استاد جی۔ کیونکہ بہت سی باتیں جو خانم سے معلوم ہوتیں استاد جی اُن کو نہ بتا سکتے تھے۔ یا جان بوجھ کے بتاتے نہ تھے۔ لاکھ تسماقسمی ہو چکی تھی مگر پھر بھی یہ لوگ گُر کی باتیں نہیں بتاتے۔ مجھے کچھ ایسا شوق ہو گیا

تھا کہ جہاں کسی بات میں ٹھنک ہوا میں سمجھتی کہ استاد جی ٹالتے ہیں۔ استاد جی کے جانے کے بعد خانم صاحب سے پوچھ لیتی تھی۔ وہ بھی میرے اس شوق سے بہت خوش ہوتی تھیں۔ بسم اللہ کو لعنتیاں دیا کرتی تھیں۔ بسم اللہ پر بہت محنت ہوتی۔ مگر ٹپہ۔ ٹھمری کے سوا کچھ نہ آیا۔ اس پر بھی لے سے ہاؤن رہی۔ خورشید کی آواز اچھی نہ تھی۔ صورت پری کی گلا ایسے جیسے پھٹا بانس۔ ہاں ناچنے میں اچھی تھی اور یہی اس نے سیکھا بھی تھا۔ اُن کا مجرا صرف ناچ کا ہوتا تھا۔ یوں گانے کو ایک آدھ چیز سیدھی سادھی گا بھی دیتی تھیں کہ گانے کا نام ہو جاتے

خانم کی نوچیوں میں بیگا جان گانے میں فرد تھیں۔ مگر صورت وہ کہ رات کو دیکھو تو ڈر جاؤ۔ سیاہ جیسے الٹا توا۔ اس پر چیچک کے داغ۔ پاؤ بھر قیمہ بھر دو تو سما جاتے لال لال آنکھیں بھدی ناک بیچ میں سے دبی ہوئی موٹے موٹے ہونٹ۔ بڑے بڑے دانت فربہ انتہا سے زیادہ۔ اس پر ٹھنگنا ساقد! بونی ہتھنی کی لوگ پھبتی کستے تھے مگر خیامت کا گلا تھا معلومات بہت اچھی تھیں۔ مورچھنا انہیں کے گلے سے نکلتے سنا۔ میں جب اُن کے کمرہ میں جاتی مارے فرمائشوں کے دق کر دیتی تھی

میں:" ہاں! باجی ذرا سرگم تو کہنا۔"

بیگا:" سنو! سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی۔"

میں:" میں یہ نہیں مانتی۔ سرنیاں الگ الگ کر کے بتاؤ۔"

بیگا:" لڑکی! تو تو بہت ستاتی ہے۔ اپنے استاد جی سے نہیں پوچھتی۔"

میں:" اللہ باجی تمہیں بتا دو۔"

بیگا:" سا رے گا ما پا دھا نی۔ دیکھ بائیس ہوتیں۔

۴ ۳ ۲ ۲ ۲ ۲ ۲

میں۔ (شرارت سے)" اوئی! میں نے نہیں گنیں پھر کہو۔"

بیگا: "جا اب نہیں کہتی۔"

میں: "واہ، میں کہلوا کے چھوڑوں گی۔"

بیگا: "(پھر وہی کہدیا) چھوڑوں گی۔"

میں: "ہاں اب کی گنتیں۔ نکھاویں دو ہیں نا؟"

بیگا: "ہاں دو۔"

میں: "اچھا تو ٹھیک باتیس ہوئیں۔ اچھا اب تینوں گرام کہہ دو۔"

بیگا: "لے اب ٹہلیئے۔ کل آیئے گا۔"

میں: "اچھا طنبورہ اٹھا لاؤں کچھ گاؤ۔"

بیگا: "کیا گاؤں؟"

میں: "دھناسری۔"

بیگا: "کیا گاؤں۔ آستائی۔ دھرپد۔ ترانہ؟"

میں: "اللہ باجی دھرپد گاؤ۔"

بیگا: "لے سن۔"

"تن کی تپ تب ہی مٹے گی جب پیا کو درشٹ بھر دیکھونگی
جب درشن پاؤں گی ان کو تب ہی جی جنم اپنا لیکھوں گی
اشٹ جام دھیان موہے واکو رہت ہے نہ جانے کب درشن تھیکونگی
جو کو ہو پر بھو پیارے سے ملاوے واکے پائن میں سیس ٹیکوں گی"

خانم جان کی نوچیوں کو صرف ناچ گانے کی تعلیم نہیں دی جاتی تھی بلکہ لکھنے پڑھنے کے لیے مکتب بھی تھا مولوی صاحب نوکر تھے۔ جب دستور میں بھی مکتب بھیجی گئی۔ مولوی صاحب کا نورانی چہرہ، سفید گنجان داڑھی، صوفیانہ لباس ہاتھ میں عمدہ فیروزے اور عقیق کی انگوٹھیاں، خاک پاک کی تسبیح، اس میں سجدہ گاہ بندھی ہوئی۔ ہر وقت

کی جریب، چاندی کی شام بہت ہی نفیس۔ ڈیڑھ خمہ حقہ۔ افیوں کی ڈبیا پیالی۔
غرض کہ جملہ تبرکات آج تک نظر میں ہیں۔ کیا ستھرا مذاق تھا۔ وضعدار بھی ایسے کہ کسی
زمانے میں بوا حسینی سے حسب اتفاق کچھ رسم ہو گیا تھا۔ آج تک اُسے نباہے جاتے
تھے بوا حسینی بھی اُنہیں دین و دنیا کا شوہر سمجھتی تھیں۔ بڑھیا بڈھے میں اس مزے کی
باتیں ہوتی تھیں کہ جوانوں کو حوصلہ ہوتا تھا۔ مکان کہیں زید پور کی طرف تھا۔ گھر پر
خدا کے دیے گاؤں گراؤں۔ مکان، بیوی، جوان لڑکے، لڑکیاں سب کچھ
موجود تھا۔ مگر خود جب لکھنؤ میں تحصیل علم کے لیے تشریف لائے یہیں رہے
شاید دو چار مرتبہ گئے ہوں گے۔ اکثر عزیز ملنے کو یہیں چلے آتے تھے۔ گھر سے
کبھی کبھی کچھ آیا بھی کرتا تھا دس روپے خانم صاحب دیتی تھیں۔ یہ سب بوا حسینی
کو ملتا تھا۔ کھانے پینے حقہ افیوں کی ناک بوا حسینی لیتی تھیں کپڑا بوا حسینی بنوا دیتی تھیں۔
خانم صاحب بھی مولوی صاحب کو بہت مانتی تھیں بلکہ مولوی صاحب کی وجہ سے بوا حسینی
کی عزت کرتی تھیں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ میری پرورش بوا حسینی نے اپنے ذمہ لی تھی۔ اس لیے مجھ
پر مولوی صاحب کی توجہ خاص تھی۔ یہ تو میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی کہ مجھے کیا سمجھتے
تھے۔ پاس ادب مانع ہے۔ اور لڑکیوں سے زیادہ مجھ پر تاکید تھی۔ مجھ ایسی کندۂ ناتراش
کو انہوں نے آدمی بنا دیا۔ یہ انہیں کی جوتیوں کا صدقہ ہے کہ جس امیر و رئیس کی محفل
میں گئی، حیثیت سے زیادہ میری عزت ہوئی۔ انہیں کی بدولت آپ جیسے لائق فائق
صاحبوں کے جلسوں میں منہ کھولنے کی جرأت ہوئی۔ شاہی درباروں میں شرکت کا
فخر حاصل ہوا۔ اعلیٰ درجہ کی بیگمات کے محل میں گزر ہوا۔

مولوی صاحب نے بہت ہی شفقت سے مجھے پڑھایا تھا۔ الف بے ختم ہونے
کے بعد کریما، مامقیما، محمود نامہ، صرف رواں پڑھا کے آمد نامہ یاد کرا دیا۔ اس

کے بعد گلستاں شروع کرادی۔ دو سطریں پڑھانے تھے سبق حفظ کرایا جاتا تھا خصوصاً اشعار، لفظ لفظ کے معنی، فقرے کی ترکیب نوک زبان تھی۔ لکھنے پڑھنے پر بھی محنت لی۔ املا درست کرایا گیا۔ خط لکھوائے گئے۔ گلستاں کے بعد اور کتابیں فارسی کی پانی ہو گئی تھیں۔ سبق اس طرح ہوتا تھا جیسے آموختہ پڑھایا جاتا ہے۔ عربی کی صرف و نحو اور دو ایک رسالے منطق کے پڑھے۔ سات آٹھ برس مولوی صاحب کے پاس پڑھتی رہی شاعری کے شوق کی ابتدا اور انتہا سے آپ خود واقف ہیں۔ اس کے بیان کی کوئی ضرورت نہیں۔

(۴)

ہم نہیں ان میں جو پڑھ لیتے ہیں طوطے کیطرح
مکتبِ عشق دو دنا تجربہ آموز بھی تھا

مکتب میں مجھ سمیت تین لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا تھا گوہر مرزا، جلا کا شریر اور بد ذات سب لڑکیوں کو چھڑا کرتا تھا۔ کسی منہ چڑھا دیا کسی کے چٹکی لیلی۔ اسکی چوٹی کھینچ لی اس کے کان دکھا دیتے۔ دو لڑکیوں کی چوٹی ایک میں جکڑ دی۔ کہیں قلم کی نوک توڑ ڈالی کہیں کتاب پر دوات الٹ دی۔ غرض کے اس کے مارے ناک میں دم تھا۔ لڑکیاں بھی خوب دھیبیانی تھیں۔ اور مولوی صاحب بھی قرار واقعی سزا دیتے تھے۔ مگر اپنی آنی بانی سے نہ چوکتا تھا۔ سب سے بڑھ کے میری گت بنتا تھا۔ کیونکہ میں سب سے انیلی اور گینگلی سی تھی۔ اور مولوی صاحب کے دباؤ میں بھی رہتی تھی۔ میں نے مولوی صاحب سے کہہ کہہ کے مار پٹوائی۔ مگر بے غیرت کسی طرح باز نہ آیا۔ آخر میں بھی چٹکیاں کھاتے کھاتے عاجز آگئی۔ میری فریاد پر مولوی صاحب اس کو بہت ہی بے دردی سے سزا دیتے تھے کہ خود مجھے ترس آجاتا تھا۔"

گوہر مرزا کے اس مکتب میں آنے کا سبب بھی بوا حسینی تھیں۔

نواب سلطان علی خاں ایک بڑے عالی خاندان رئیس تھے۔ توپ دروازہ میں رہتے تھے۔ اُن سے اور بنو ڈومنی سے رسم تھا۔ اُن ہی سے یہ لڑکا پیدا ہوا۔ اگرچہ بنو سے اور نواب صاحب سے اب ترک ملاقات ہوتے مدت گذر گئی تھی۔ مگر دس روپے ماہ بماہ لڑکے کی پرورش کے لیے دیتے جاتے تھے اور بیگم صاحبہ سے چوری

چھپے کبھی بلا کے دیکھ بھی لیا کرتے تھے۔ منّو قاضی کے باغ کی رہنے والی تھیں۔ وہیں بوا حسینی
کے بھائی کا گھر تھا۔ کھڑکی درمیان میں تھی۔ گوہر مرزا بچپنے ہی سے فات شریف تھے۔ تمام
محلہ کا ناک میں دم تھا۔ کسی کے گھر میں ڈھیلا پھینک دیا۔ کسی لڑکے سے چڑکوؤں کا
پنجرہ دیکھنے کو مانگا۔ اس نے دے دیا۔ آپ نے کھڑکی کی تیلی کھول دی۔ سب چڑکوے
پھر سے اڑ گئے غرض کہ طرح طرح کے آزار دیتے تھے۔ آخر ماں نے عاجز آکر محلہ کی
مسجد میں ایک مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔ یہاں بھی آپ نے اپنے ہتھکنڈے
نہ چھوڑے۔ تمام ہم مکتب لڑکوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس کے کرتے میں مینڈک
چھوڑ دیا۔ اس کی ٹوپی پھاڑ ڈالی۔ ایک لڑکی کی جوتی اٹھا کے کنوئیں میں ڈال دی۔

ایک دن مولوی صاحب نماز پڑھ رہے تھے۔ حضرت نے اُن کا نیا چڑھوا ل
جوتا حوض میں ڈال دیا۔ خود بیٹھے ہوئے سیر دیکھ رہے ہیں۔ اتنے میں کہیں مولوی
صاحب سر پر پہنچ گئے۔ اب تو گوہر مرزا کی خوب مرمت ہوئی۔ مولوی صاحب نے
مارے طمانچوں کے منہ لال کر دیا اور کان پکڑے ہوئے منّو کے گھر پہ لے آئے۔ دروازہ
پہ سے پکار کے کہا "لو صاحب اپنا لڑکا لو ہم اسے نہ پڑھائیں گے۔" یہ کہہ کے
مولوی صاحب تو اُدھر گئے۔ گوہر مرزا مظلوم صورت بنائے روتا ہوا گھر میں آیا۔
اس وقت اتفاق سے بوا حسینی منّو سے بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ لڑکے کا جو یہ
حال دیکھا۔ آپ کو بہت ہی ترس آیا۔ لڑکے کے کرتوتوں سے تو آگاہ نہیں۔ مولوی
صاحب کو برا بھلا کہنے لگی۔

بوا حسینی: "اے ہے مولوی کاہے کو موا قصائی ہے۔ لڑکے کا منہ مارے طمانچوں
کے سُجا دیا۔ اے لو کان بھی لہولہان کر دیتے۔ بی بی ایسے مولوی سے کوئی نوج
پڑھواتے۔ آخر ہمارے مولوی صاحب بھی تو پڑھاتے ہیں۔ کیسا چمکار کے دلار
سے پڑھاتے ہیں۔

بنو نے چھیڑ ٹھنے ہی کہا: "پھر بوا حسینی اس کو بلا سے اپنے مولوی صاحب ہی کے پاس لے جاؤ۔"

بوا حسینی: "لے تو جاؤں مگر دور بہت ہے۔"

بنو: "تمہارے بھائی کے ساتھ صبح کو بھجوا دیا کروں گی شام کو بلوا لیا کروں گی۔"

بوا حسینی: "اچھا تو بھجوا دیا کرو۔"

مولوی صاحب سے کچھ پوچھنا نہ تھا۔ اس لیے بوا حسینی کو اپنی حسن خدمت پر پورا بھروسہ تھا۔ جانتی تھیں کہ مولوی صاحب انکار تو کریں گے نہیں۔

دوسرے دن علی بخش (بوا حسینی کے بھائی کا نام تھا) گوہر مرزا کو ساتھ لیے مٹھائی کا خوان سر پر رکھے بوا حسینی کے پاس پہنچے۔ بوا حسینی نے خوشی مٹھائی تقسیم کی۔ لڑکے کو مولوی صاحب کے پاس بٹھا دیا۔

گوہر مرزا سب سے زیادہ مجھ ہی کو ستاتا تھا۔ دن رات داد بیداد کا غل رہتا تھا۔ مولوی صاحب نے اس کو بہت بہت مارا۔ مگر اس نے مجھے ستانا نہ چھوڑا۔ اس طرح کتنی برس گزر گئے۔ آخر میرے اسکے درمیان صلح ہوگئی یا یوں کہیے کہ میں اس کے ستانے کی خوگر ہوگئی۔

گوہر مرزا کے اور میرے سن میں کچھ ہی فرق ہوگا۔ شاید وہ مجھ سے دو ایک سال بڑا ہو جس زمانے کا حال میں لکھ رہی ہوں میرا سن کوئی تیرہ برس کا ہوگا اور گوہر مرزا کو چودھواں پندرھواں سال تھا۔

گوہر مرزا کے ستانے سے اب مجھ کو مزا آنے لگا۔ اس کی آواز بہت اچھی تھی ڈومنی کا لڑکا تھا، تال، لے دار، بتانے میں مشاق، بوٹی بوٹی تھرکتی تھی، ادھر میں لے مرے آگاہ۔ جب مولوی صاحب مکتب میں نہ ہوتے تھے کبھی میں گانے لگی

وہ بنانے لگا۔ کبھی وہ گا رہا ہے میں تال دے رہی ہوں۔ گوہر مرزا کی آواز بہ اور رنڈیاں بھی فریفتہ تھیں۔ ہر ایک کمرہ میں بلایا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ میرا جانا بھی ضروری تھا کیونکہ بغیر میری اُس کی سنگت کے لطف نہ آتا تھا۔

سب سے زیادہ امیر جان اس کے گانے پر غش تھیں۔

مرزا صاحب! آپ کو تو امیر جان یاد نہ ہوں گی؟"

رسوا: "یاد ہیں۔ کہے جاؤ۔"

امراؤ: "امیر جان کا وہ زمانہ جب مفتخر الدولہ بہادر کی ملازم تھیں، اللہ رے جوبن کے ٹھاٹھ! وہ اٹھتی ہوئی جوانی۔

کھلتی کھلتی وہ چمپئی رنگت
بھولی بھولی وہ موہنی صورت
بانکی بانکی ادائیں ہوش ربا
ترچھی ترچھی نگاہیں قہرِ خدا

بوٹا سا قد، چھریرا بدن، نازک نازک ہاتھ پاؤں۔

رسوا: "اب تو جب میں نے اُن کو دیکھا ہے۔ انگنی پر ڈالنے کے لائق تھیں ایسی بُری صورت ہو گئی تھی کہ دیکھا نہیں جاتا تھا۔"

امراؤ: "کہاں دیکھا تھا؟"

رسوا: "انہیں کے گھر میں دیکھا تھا۔ جن کے کمرے کے سامنے شاہ صاحب، گیروے کپڑے پہنے ہزار دانے کی تسبیح ہاتھ میں لیے کھڑے رہتے تھے۔ ادھر سے جو نکلتا تھا اس کو سلام کر لیتے تھے کبھی کسی سے سوال نہیں کرتے تھے۔"

امراؤ: "سمجھ گئی۔ وہ شاہ صاحب اُن کے عاشقوں میں تھے۔"

رسوا: "جی ہاں۔ کیا میں نہیں جانتا؟"

امراؤ :" اچھا ! تو آپ وہیں رہتے ہیں "

رسوا ." اُن کی مصاحبت میں اُن کو "

امراؤ :" اور اُن کا کیا حال ہے ؟"

رسوا :" وہ ایک حکیم صاحب پر مرتی ہیں !"

امراؤ :" کون حکیم صاحب ؟"

رسوا :" آپ نہیں جانتیں ۔ نام بھی بتا دوں گا تب بھی آپ نہ سمجھیں گی پھر کیا فائدہ ۔"

امراؤ :" خیر کچھ بتا دیجیے ۔ میں سمجھ جاؤں گی ۔"

رسوا :" وہ نحاس ....

امراؤ :" خوب جانتی ہوں ۔ یہی امیر جان اس زمانہ میں ایسی تھیں کہ لوگ اُن کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو رکھتے تھے مزاج میں وہ تمکنت تھی کہ ایسے ویسوں کا تو ذکر ہی کیا ہے اچھے اچھوں کی دعا قبول نہ ہوتی تھی ۔ ٹھاٹھ بھی ایسے ہی تھے ۔ چار چار مہریاں ساتھ ۔ ایک گڑگڑی لیے ہے، ایک کے ہاتھ میں پنکھا ہے ۔ ایک لٹیا لیے ایک کے پاس خاصدان ہے ۔ خدمت گار وردیاں پہنے سواری کے ساتھ دوڑتے جاتے ہیں ۔

امیر جان گوہر مرزا کے گانے پر عش تھیں ۔ خود گانا وانا جانتی نہیں تھیں مگر گانا سننے کا بڑا شوق تھا ۔

گوہر مرزا بچپنے ہی سے رنڈیوں کا کھلونا تھا ۔ ہر ایک اس پر دم دیتی تھی صورت شکل بھی پیار کرنے کے قابل تھی ۔ رنگ تو کسی قدر سانولا تھا ۔ مگر ناک نقشہ قیامت کا پایا تھا ۔ اس پر نمک اور جامہ زیبی ، شوخی ، شرارت کوئی بات ....."

رسوا :" کیوں نہ ہو کس ماں کا بیٹا تھا ۔

امراؤ: "اہاہ! تو کیا آپ نے بنو کو دیکھا تھا؟"

رسوا: "(مسکراتے ہوئے) جی ہاں آپ بھی قیاس کر لیجیے۔"

امراؤ: "مرزا صاحب آپ کے مذاق بھی کیا در پردہ ہوتے ہیں۔"

رسوا: "خیر! آپ نے تو پردہ فاش کر دیا۔"

امراؤ: "تو اچھا اب تھوڑی دیر مذاق ہی رہے۔ میری سرگذشت کو آگ لگا دیجیے۔"

رسوا: "مذاق کے لیے شب بھر باقی ہے آپ اپنا قصہ کہیے۔"

امراؤ: "دیکھیے دوسری ہوئی۔ اچھا سنیے۔

صبح سے دس گیارہ بجے تک تو مولوی صاحب کے پاس سے کسی کی مجال تھی کہ دم بھر کے لیے کھسک جاتے اس کے بعد مولوی صاحب خاصہ کھانے جاتے تھے اس وقت ہم کو فرصت ملتی تھی۔ پھر ایک ایک کمرہ ہے اور ہم ہیں۔ آج امیر جان کے پاس کل جعفری کے کمرہ میں۔ پرسوں بمن کے یہاں۔ پھر جہاں جاؤ خاطر مدارت میوہ مٹھائیاں حقہ پان۔

رسوا: "آپ بچپن ہی سے حقہ پیتی ہیں؟"

امراؤ: "جی ہاں! گوہر مرزا کی دیکھا دیکھی مجھے بھی ہوس ہوئی تھی۔ تنوقیہ پیتی تھی۔ پھر تو نگوڑی لت ہو گئی۔

رسوا: "گوہر مرزا صاحب تو چنڈو بھی پیتے تھے۔ عجب نہیں آپ نے اس میں بھی اُن کی ہوس کی ہو؟"

امراؤ: "خدا نے اس سے تو آج تک بچایا۔ مگر ہاں افیون کی قسم نہیں کھاتی وہ بھی شروع کی ہے۔ کربلائے معلیٰ سے آنے کے بعد نزلے کی شدت ہوئی۔ آئے دن زکام رہتا تھا حکیم صاحب نے کہا افیون کھاؤ۔ کھانے لگی۔

رسوا :" اور وہ چیز تنزلے کی روکنے والی!"

امراؤ :" اب اس کا ذکر نہ کیجئے!"

رسوا :" کیا تائب ہو گئیں؟"

امراؤ :" مدت سے!"

رسوا :" واقعی۔ کمبخت کیا بُری چیز ہے۔ اپنا تو یہ حال ہے"

بعد توبہ کے بھی ہے دل میں یہ حسرت باقی
دے کے قسمیں کوئی اک جام پلا دے ہم کو

امراؤ :" ہائے کیا شعر کہا ہے مرزا صاحب۔ قسمیں دلانے کو تو میں موجود ہوں پینے نہ پینے کا آپ کو اختیار رہے!"

رسوا :" آپ بھی شغل کیجئے گا؟"

امراؤ :" توبہ!"

رسوا :" توبہ!"

ابر بھی ہے ہوا ہے سرد بھی ہے
پھر وہ یادش بخیر یاد بھی ہے

امراؤ :" لے بس اب طبیعت کو روکئے۔ جمائیاں آنے لگیں۔ للہ اس ذکر کو جانے دیجئے!"

رسوا :" جانے دیجئے!"

امراؤ :" مذاق سے بھی معاف رکھئے!"

اب نہ ہم منہ لگائیں گے اس کو
یاد آئی تو خیر یاد آئی

رسوا :" واللہ امراؤ جان کیا شعر کہا ہے!"

امراؤ: "تسلیم۔"

دیکھ کر مشہد ادا مُن کو
لالہ و گُل کی سیر یاد آئی

رسوا: "ماشاءاللہ! طبیعت زوروں پر ہے۔ کیوں نہ ہو عالم شباب کے ذکر کی یہ تاثیر ہے۔"

زاہدو! آج ہم کو پھر وہ شے
جس سے ہے تم کو بیر یاد آئی

رسوا: "آہاہاہا۔ کیا قافیہ نکالا ہے اور کہا بھی خوب۔"

کعبہ سے پھر کے ہم ہوئے گمراہ!
پھر وہی راہ دیر یاد آئی!

امراؤ: "اے کیا کہنا یہ "کعبہ سے پھر کے" کیا خوب کہا ہے مرزا صاحب اسے مطلع نہ کر دیجئے"

پھر کے کعبہ سے سیر یاد آئی
پھر وہی راہ دیر یاد آئی

رسوا: "خاصہ۔"

امراؤ:

روش وحشی دلیر یاد آئی!
دشت وحشت کی سیر یاد آئی

رسوا: "یہ بھی مطلع برا نہیں ہے۔"

امراؤ: "یہ شعر ملاحظہ ہو۔"

ہم کو جنت الغب سے شکوہ ہے کیوں ہمیں اُس بغیر یاد آئی

رسوا "میں تو کہتا ہوں کہ طبیعت آج جودت پر ہے۔ اچھا یہ شعر سن لیجئے اور اور پھر اپنا قصہ دہرانا شروع کیجئے۔"

ہو ابھی ابر بھی گلزار بھی شراب بھی ہو
یہ سب بھی ہو مگر اگلا سا وہ شباب بھی ہو

امراؤ "واہ مرزا صاحب! آپ نے تو دل کو مردہ کر دیا۔ خیر آمدم بر سر مطلب اس طرح سے کئی برس میری زندگی کے خانم کے مکان پر گذر گئے۔ اس درمیان میں کوئی ایسا واقعہ نہیں گذرا جس کا بیان ضروری ہو۔

ہاں خوب یاد آیا بسم اللہ کی مسی بڑی دھوم سے ہوئی۔ میری آنکھوں کے دیکھتے شاہی سے لے کر اب تک پھر ویسی مسی نہیں ہوئی۔ دلاور خاں کی بارہ دری اس جلسے کے لیے سجی گئی تھی۔ اندر سے باہر تک روشنی تھی۔ شہر کی رنڈیاں، ڈوم ڈھاڑی، کشمیری بھانڈ سب تو تھے ہی۔ دور دور سے ڈیرہ دار طوائفیں بلائی گئی تھیں۔ بڑے بڑے نامی گویے دلی تک سے آئے تھے سات دن رات گانے بجانے کی صحبت رہی۔ خانم نے جیسے دل کھول کے حصے تقسیم کیے ہیں اس کا آج تک شہرہ ہے۔ بسم اللہ خانم کی اکلوتی لڑکی تھی جو کچھ نہ ہوتا کم تھا۔ نواب چھبن صاحب نے اپنی دادی نواب عمدۃ الخاتون بیگم کا ورثہ پایا تھا۔ بہت ہی کمسن نواب زادہ تھا۔ خانم نے خدا جانے کن ترکیبوں سے کیا مارا۔ بے چارے پھنس ہی تو گئے۔ پچیس تیس ہزار روپے نواب صاحب کے اس جلسہ میں خرچ ہوتے اس کے بعد بسم اللہ نواب صاحب کی ملازم ہو گئیں۔ دم ہوش چاہتے تھے۔

مرزا رسوا صاحب! جو باتیں آپ مجھ سے پوچھتے ہیں ان کا میری زبان سے نکلنا سخت مشکل ہے۔ یہ سچ ہے کہ رنڈیاں بہت بیباک ہوتی ہیں۔ مگر زمانہ خاص ہوتا ہے۔

سن کا تقاضا بھی کوئی چیز ہے۔ جوش جوانی کی وجہ سے جو باتیں اپنی حد سے گذر جاتی ہیں۔ سن اُنکر ان میں ضرور کمی ہونا چاہیئے۔ تاکہ اعتدال قایم رہے آخر رنڈیاں عورت ذات ہیں۔ ان باتوں کے پوچھنے سے آپ کو کیا فایدہ ہے؟"

رسوا: "کچھ تو فائدہ ہے جو میں اصرار کر کے پوچھتا ہوں۔ اگر آپ خواندہ نہ ہوتیں تو آپ کے یہ سب عذر قابلِ سماعت ہوتے۔ پڑھے لکھوں کو ایسی بے جا شرم نہیں چاہیئے۔"

امراؤ: "اوئی! تو کیا پڑھنے سے آنکھوں کا پانی ڈھل جاتا ہے؟ یہ آپ نے خوب کہی۔"

رسوا: "اچھا۔ اچھا تو آپ کہیئے۔ فضول باتوں سے میرا وقت ضائع نہ کیجئے۔"

امراؤ: "کہیں کسی اخبار میں نہ چھپوا دیجئے گا۔"

رسوا: "اور آپ کیا سمجھی ہیں؟"

امراؤ: "ہائے فضیحت! توبہ کیجئے۔ مجھے بھی آپ اپنی طرح رسوا کریں گے۔"

رسوا: "خیر، اگر میرے ساتھ آپ رسوا ہوں گی تو کوئی قباحت نہیں۔"

رسوا سے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم
چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر

امراؤ: "نوج آپ سے کوئی محبت کرے۔"

زاہد سے گفتگو ہو کہ ناصح سے بحث ہو
بنتی نہیں ہے ذکر کسی کا کیے بغیر

رسوا: "کس کا شعر ہے؟"

امراؤ: "یہ آپ مجھ سے کیوں پوچھا کرتے ہیں؟"

رسوا: "ہاں سمجھا۔ تو یہ کہیئے آپ نے بھی یہ غزل کہی ہے؟"

امراؤ۔

جانتے ہیں جان بیچ کے بازار عشق میں
ہم آئیں گے نہ حسن کا سودا کیے بغیر

رسوا۔" اور وہ شعر یاد ہے "تقاضا کیئے بغیر"۔

امراؤ۔

وعدہ ہو یا کہ قول نہ ایسے ہیں نا دھند
ملنا نہیں کچھ اُن سے تقاضا کیے بغیر

رسوا۔" اور کوئی شعر یاد ہے؟"

امراؤ۔" اور تو کوئی یاد نہیں آتا۔"

رسوا۔" یہ تو بہت بڑی غزل تھی۔ دیکھنا نقل کہیں پڑی ہو تو مجھے دکھانا۔"

امراؤ۔" اُنہیں سے نہ منگالو۔"

رسوا۔" خود جا کے لکھ لاؤں تو بہتر ہے۔ وہ ہرگز نہ لکھیں گے۔"

امراؤ۔" یہ بھی کوئی بات ہے؟

رسوا۔" جی ہاں۔ آپ کو نہیں معلوم۔ مسودے کے سوا غزل تک صاف کرنے کی قسم ہے۔"

امراؤ۔" اچھا ایک دن ہم اور آپ دونوں چلیں۔ ہاں ایک شعر اور یاد آیا۔

ہر چند اس میں آپ ہی بدنام کیوں نہ ہوں
باز آئیں گے نہ وہ میرا چرچا کیے بغیر

اور سنیئے۔

غیروں کو ہے ستم کے تقاضے کا حوصلہ
چھوڑیں گے یہ نہ عشق کو رسوا کیے بغیر

رسوا: "میری بھی غزل اسی طرح میں تھی۔ مگر خدا جانے کیا ہوئی۔ صرف مقطع یاد رہ گیا ہے۔"

امراؤ: "مقطع پھر سنایئے۔ کیا خوب کہا ہے۔"

رسوا۔

رسوا ہے کیوں ملے ہو محبت جتا کے تم
چھوڑوں گا اب نہ میں تمہیں رسوا کیے بغیر

امراؤ: "واقعی خوب کہا ہے۔ مگر اس میں آپ کے تخلص نے خاص لطف پیدا کیا ہے۔

رسوا: "تخلص کا ذکر نہ کیجئے۔ ایک عنایت فرما کی عنایت سے شہر میں اب کئی رسوا موجود ہیں۔ لوگ خواہ مخواہ اپنے اچھے خاصے تخلص چھوڑ کے رسوا ہوئے جاتے ہیں۔ وہ تو کہیے میرا نام نہیں جانتے۔ نہیں تو کیا عجب ہے لوگ نام بھی بدل ڈالیں۔ مگر میں تو خوش ہوں اس لیے کہ انگریزی رسم کے موافق باپ بیٹوں کا نام ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ سب میرے روحانی فرزند ہیں جس قدر نسل ترقی کرے گی میرا نام روشن ہوگا۔

"لے اب ٹالیے نہ۔ جو کچھ میں نے پوچھا ہے۔ وہ کہنا ہی پڑے گا۔"

امراؤ: "کیا زبردستی ہے۔ کیا بے شرمی کی باتیں آپ پوچھتے ہیں۔"

رسوا: "بیاہ براتوں میں گالیاں گانے سے زیادہ بے شرمی نہ ہوگی۔"

امراؤ: "آپ کے لکھنؤ میں تو رنڈیاں گالیاں نہیں گاتیں۔ ڈومنیاں البتہ گاتی ہیں۔ وہ بھی عورتوں میں۔ دیہات کی رنڈیوں کو گانا پڑتی ہیں مردوں میں۔

دانتی مرزا صاحب شہر یا دیہات یہ رسم تو اچھی نہیں۔"

رسوا۔" آپ کے کہنے سے اچھا نہیں ہے ہم نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے اور سے سنا ہے۔ اچھے اچھے شریف مرد آدمی عورتوں میں گھس کے شوقیہ گالیاں سنتے ہیں۔ ماں بہنیں پنی جا رہی ہیں اور یہ خوش ہیں۔ باچھیں کھلی جاتی ہیں۔ آج خدا نے یہ دن دکھایا۔ کاش خدا یہ دن نہ دکھاتا۔ اس کے علاوہ برات کی رات بھر اور صبح کی جو بیہودگیاں باعصمت بہو بیٹیوں میں ہوتی ہیں۔ اس کا ذکر بھی کیا خیران باتوں کو رہنے دیجئے۔ اپنی بیتی کہیئے۔ ہم کوئی مصلح قوم نہیں جو ان باتوں پر نکتہ چینی کریں۔"

امراؤ۔" آپ نہ مانیئے گا۔ لے سنیئے۔"

جب سے بسم اللہ کی مسی ہوئی خورشید جان اور امیر جان کے کارخانے دیکھے۔ میرے دل میں ایک خاص قسم کی امنگ پیدا ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک خاص رسم (جس سے بالکل ناواقف تھی) کے ادا ہونے کے بعد بسم اللہ سے بسم اللہ جان اور خورشید سے خورشید جان ہوگئیں۔ بے باکی سنا حاصل ہوگئی آزادی کا خلعت مل گیا۔ اب یہ لوگ مجھ سے علیحدہ ہوگئے۔ میں ان کی نگاہوں میں حقیر سی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مردوں کے ساتھ بے تکلف ہنسی مذاق کرنے لگی تھیں۔ ان کے کمرے جدا جدا سج دیے گئے تھے۔ نواڑ کے پلنگ ڈوریوں سے کسے ہوئے تھے۔ فرش پر ستھری چاندنی بچھی ہوئی۔ بڑے بڑے نقشئی پان دان حسن دان، خاصدان، اگال دان اپنے اپنے قرینوں سے رکھے ہوئے۔ دیواروں پر جلی آئینے۔ عمدہ عمدہ تصویریں، چھت میں چھت گیریاں لگی ہوئی جس کے درمیان ایک مختصر سا جھاڑ۔ ادھر ادھر عمدہ عمدہ ہانڈیاں۔ سر شام سے دو کنول روشن ہو جاتے ہیں۔ دو دو مہریاں دو دو خدمت گار ہاتھ باندھے کھڑے ہیں خوبصورت نوجوان رئیس زادے ہر وقت دل بہلانے کو حاضر۔ چاندی کی

گڈگڑی منہ سے لگی ہوئی ہے۔ سامنے پاندان کھلا ہوا ہے۔ ایک ایک کو پان لگا کے دیتی جاتی ہیں چہلیں ہوتی ہیں۔ اٹھتی ہیں تو لوگ بسم اللہ کہتے ہیں، چلتی ہیں تو لوگ آنکھیں بچھائے دیتے ہیں۔ یہ ہیں کہ کسی کی پرواہ نہیں کرتیں۔ جو ہے انہیں کے حکم کا تابع ہے حکومت بھی ہے کہ زمین و آسمان ٹل جائے۔ مگر ان کا کہنا نہ ٹلے۔ فرمائشوں کا تو ذکر ہی کیا۔ بن مانگے لوگ کلیجہ نکال کے دیئے دیتے ہیں۔ کوئی دل ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہے کوئی جان قربان کرتا ہے۔ یہاں کسی کی نذر ہی قبول نہیں ہوتی۔ کوئی بات نظر میں نہیں سماتی۔ بے پروائی یہ کہ کوئی جان بھی دیدے تو ان کے نزدیک کوئی مال نہیں غرور ایسا کہ ہفت اقلیم کی سلطنت ان کی ٹھوکر پر ہے۔ ناز وہ جو کسی سے اٹھایا نہ جائے۔ مگر اٹھانے والے اٹھاتے ہیں۔ انداز وہ جو مار ہی ڈالے مگر مرنے والے مر ہی جاتے ہیں، ادھر اس کو رلا دیا ادھر اسے ہنسا دیا۔ کسی کے کلیجہ میں چٹکی لے لی، کسی کا دل تلوؤں سے مسل ڈالا۔ بات بات میں روٹھی جاتی ہیں لوگ منا رہے ہیں۔ کوئی ہاتھ جوڑ رہا ہے کوئی منت کر رہا ہے۔ قول کیا اور مکر گئیں، قسم کھائی اور بھول گئیں۔ محفل بھر میں سب کی نگاہ ان کی طرف ہے۔ یہ آنکھ اٹھا کے بھی نہیں دیکھتیں۔ پھر جدھر دیکھ لیا ادھر سب دیکھنے لگے۔ جس پر ان کی نگاہ پڑتی ہے۔ اس پر ہزاروں نگاہیں پڑتی ہیں۔ رشک کے مارے لوگ جلے جاتے ہیں اور یہ جان جان کے جلا رہی ہیں۔ اور لطف یہ کہ دل میں کچھ نہیں، وہ بھی ہیچ یہ بھی ہیچ، ہے فقط بناوٹ۔ اگر وہ بے چارہ اس فریب میں آگیا پھر کیا تھا پہلے بظاہر خود مرنے لگیں۔

آج کل مومن کو بہت ہے میری خاطر منظور

یا مری یا مرے دشمن کی قضا آئی ہے

مریں مومن کے دشمن، آخر اسی کو مار ڈالا۔ اب جا کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑی اس غریب کے گھر میں رونا پیٹنا پڑا ہے۔ یہ بیٹھی یاروں کے ساتھ قہقہے لگا رہی

ہیں۔

مرزا صاحب! ان سب باتوں کو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں اور بیان کر سکتے ہیں۔ مگر یہ کرشمہ دیکھ کے جو کچھ میرے دل میں گذرتی تھی اس کو میں خوب جانتی ہوں۔ عورت کو عورت سے جو رشک ہوتا ہے اس کی کچھ انتہا نہیں ہوتی۔ سچ تو یہ ہے اگرچہ مجھے کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ سب کے چاہنے والے مجھی کو چاہیں اور سب کے مرنے والے مجھی پر مریں۔ نہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھیں نہ کسی پر جان دیں۔ مگر میری طرف کوئی آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھتا تھا۔ بوا حسینی کی کوٹھری جس کی درودیوار سے لیکر چھت تک دھوئیں سے سیاہ تھی۔ اس کے ایک طرف جھلنگا پلنگ پڑا تھا۔ اس پر ہم اور بوا حسینی رات کو پڑے رہتے تھے۔ ایک طرف کوٹھری میں چولھا بنا ہوا تھا۔ اس کے پاس دو گھڑے رکھے ہوئے تھے۔ یہیں دو پتیلی سی پتیلیاں، لگن توا، رکابیاں، پیالے ادھر ادھر پڑے رہتے تھے۔ ایک کونے میں آٹے کی مٹکی تھی۔ اس پر دو تین دالیں۔ نمک، مصالحہ ہانڈیوں میں۔ اسی کے پاس جلانے کی لکڑیاں، سوختنے، مصالحہ پیسنے کی سل بٹہ۔ خلاصہ یہ کہ تمام کرکری خانہ یہیں تھا۔ چولھے کے اوپر دیوار میں دو کھیلیں لگی ہوئی تھیں۔ کھانا پکاتے وقت اس پر چراغ رکھ دیا جاتا تھا۔ اور چکنا ہوا چھوٹا سا ڈیوٹ پلنگ کے پاس دھرا رہتا تھا۔ کھانا پکانے کے بعد یہی نہ چراغ اس پر رکھ دیا جاتا تھا۔ چراغ میں پتلی سوت سی بتی پڑی ہے۔ موا اندھا اندھا جل رہا ہے۔ لاکھ اُکساؤ لو اونچی نہیں ہوتی۔ اس کوٹھری کی آرائش میں دو چھینکے بھی تھے۔ ان میں سے ایک میں پیاز رہتی تھی اور دوسرے میں سالن دال کی پتیلی۔ چپاتیاں مولوی صاحب کے واسطے ڈھانپ کے رکھ دی جاتی تھیں۔ پیاز والا چھینکا تو چولھے کے قریب تھا۔ اور اور یہ دوسرا میرے بچھونے پر تھا۔ جس کے بوجھ سے کھانا گویا میرے بچھونے پر دھرا رہتا تھا۔ اگرچہ پلنگ پر اچانک گھڑی ہوئی تو سالن کی پتیلی کھٹ سے سر میں لگی۔

صبح سے گیارہ بجے تک مولوی صاحب کی قمچیاں اور شام سے ۹ بجے تک استاد کی جھڑکیاں اور گزدوں کی مار۔ یہ ہمارا اخلاص پیار تھا۔ یہ سب کچھ تھا مگر میں اپنے کرتوتوں سے باز نہ آتی تھی۔

اوّل اوّل تو مجھے آئینہ دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اب میرا سن چودہ برس کا تھا۔ ادھر بوا حسینی کوٹھری سے ٹلیں ادھر میں نے اُن کی پٹاری سے آئینہ نکالا۔ اپنی صورت دیکھنے لگی۔ اپنا ناک نقشہ اور رنڈیوں سے ملاتی تھی۔ مجھے اپنے چہرے بھر میں کوئی چیز بری نہ معلوم ہوتی تھی۔ بلکہ اوروں سے اپنے کو بہتر سمجھتی تھی۔ اگرچہ درحقیقت ایسا نہ تھا۔

رسوا: "تو کیا آپ کی صورت کسی سے بری تھی؟ اب سینکڑوں سے اچھی ہو اس وقت تو اور بھی جوبن ہوگا۔"

امراؤ: "تسلیم۔ خیر اب اس تعریف کو رہنے دیجئے بالکل بے محل اور بے موقع ہے۔ معاف کیجئے گا۔ مگر ہاں اس وقت میرا ایسا ہی خیال اور یہ خیال میری جان کے لیے آفت تھا۔ میں دل ہی دل میں کہتی تھی۔ ہائے مجھ میں کیا برائی ہے جو کوئی میری طرف توجہ نہیں کرتا۔"

رسوا: "یہ تو ممکن نہیں کہ کسی کو آپ کی طرف توجہ نہ ہو۔ نگاہیں ضرور پڑتی ہوں گی مگر بات یہ ہے کہ مسی نہیں ہوئی تھی۔ خانم سے لوگ ڈرتے تھے۔ اس لیے آپ سے کوئی بولتا نہ ہوگا۔"

امراؤ: "شاید یہی ہو مگر مجھے اتنی تمیز کہاں تھی۔ میری تو وہ مثل تھی۔ "بے دولتی اپنے نیہے میں آپ کھولتی۔ اپنی ہجولیوں کو دیکھ دیکھ کے کھکی جاتی تھی، کھانا پینا حرام، راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔"

اسی زمانے میں پھر کنگھی کرتے وقت اور بھی صدمہ ہوتا تھا، اس لئے کہ کوئی

چوٹی کا گوندھنے والا نہ تھا۔ جب بسم اللہ کی چوٹی نواب چھبن صاحب اپنے ہاتھ سے گوندھتے تھے۔ میرے سینے پر سانپ لوٹ جاتا تھا۔ یہاں کون تھا وہی بوا حسینی۔ وہ بھی جب انہیں فرصت ہوئی۔ نہیں تو دن دن بھر بال کھلے ہیں۔ سر جھاڑ۔ منہ پھاڑ پھر رہی ہوں۔ آخر میں نے اپنے ہاتھ سے چوٹی گوندھنا سیکھا۔ اور سب رنڈیاں تو دن میں تین تین جوڑے بدلتی تھی۔ یہاں وہی آٹھویں دن۔ پوشاک بھی بھاری نہ تھی۔ وہ لوگ یہاں کار چوبی جوڑے بدلتے تھے۔ یہاں وہی نگل بدن کا پائجامہ ململ کا دوپٹہ۔ بڑی بڑائی بچکہ کی نیلی دے دی گئی

اس پر بھی کپڑے بدل کے میرا جی چاہتا تھا کہ مردوں میں جا کے بیٹھوں کبھی بسم اللہ کے کمرے میں چلی گئی کبھی امیر جان کے پاس۔ مگر جہاں جاتی تھی کسی نہ کسی بہانہ سے اٹھا دی جاتی تھی۔ ان لوگوں کو میرا بیٹھنا ناگوار تھا۔ سب کو اپنی مزے داریوں کا خیال تھا۔ مجھے کون بیٹھنے دیتا۔

اور نہ بیٹھنے دینے کا ایک اور بھی سبب تھا کہ ان دنوں میری طبیعت میں شرارت کسی قدر سما گئی تھی۔ جہاں بیٹھی کسی کو ٹھینگا دکھا دیا کسی کا منہ چڑھا دیا کسی کے چٹکی لے لی۔ ہر طرح مردوں سے لگاوٹ کرتی تھی۔ اس وجہ سے لوگ میرے بیٹھنے کے روادار نہ تھے۔

مرزا صاحب! آپ سمجھ سکتے ہیں کہ گوہر مرزا ایسے وقت اور اس حالت میں کس قدر غنیمت معلوم ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ مجھ سے پیار کی باتیں کرتا تھا۔ میں اس کو چھیڑتی تھی وہ مجھے چھیڑتا تھا۔ میں اس کو اپنا چاہنے والا سمجھتی تھی اور وہ بھی ان دنوں مجھ کو چاہتا تھا۔ جب صبح مکتب میں آتا کہیں نہ نارنگیاں جیب میں پڑی ہیں مجھے چپکے سے دے دیں۔ کسی دن حلوہ سوہن کی ٹکیہ بنا آیا مجھ کو کھلا دی۔ ایک دن نہیں معلوم کہاں سے ایک روپیہ لایا تھا۔ وہ بھی مجھے حوالے کر دیا۔ ہزاروں روپے

ں نے اپنی زندگی اپنے ہاتھ سے اٹھائے ہوں گے، مگر اس ایک روپے کی پانے
ی خوشی کبھی نہ بھولوں گی۔ اس کے پہلے مجھے پیسے تو بہت ملے تھے۔ مگر روپیہ کبھی نہ
لا تھا۔ وہ روپیہ میں نے بہت دن تک جگور رکھا۔ اس لیے کہ اس کے صرف کی کوئی ضرورت
ہے نہ تھی اور اگر تھی بھی تو یہ خیال تھا کہ اگر یہ صرف کرتی ہوں تو لوگ پوچھیں گے
ہاں سے ملا تو کیا بتاؤں گی۔ رازداری کی سمجھ مجھے بھی آ گئی تھی، اور یہ سمجھ بغیر سن تمیز
پہنچے نہیں آتی۔ بے شک میں سن تمیز کو پہنچ چکی تھی۔

(۵)

ایک شاطر چور دل میں میرا چرا کر لے گیا
پاسباں کمبخت سارے سوتے کے سوتے رہ گئے

برسات کے دن ہیں گھٹا آسمان پر چھائی ہوئی ہے۔ پانی تل دھار اوپر دھار برس رہا ہے۔ بجلی چمک رہی ہے بادل گرج رہا ہے۔ میں بوا حسینی کی کوٹھری میں اکیلی پڑی ہوں۔ بوا حسینی خانم کے ساتھ حیدری کے گھر گئی ہوئی ہیں۔ چراغ گل ہو گیا ہے۔ اور اندھیری وہ کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا۔

اور کمروں میں جشن ہو رہے ہیں۔ کہیں سے گانے کی آواز آرہی ہے۔ کہیں قہقہے اڑ رہے ہیں۔ ایک میں ہوں کہ اس اندھیری کوٹھری میں اپنی تنہائی کو رو رہی ہوں۔ کوئی آس پاس نہیں ہے۔ دل پر جو گزر رہی ہے دل ہی جانتا ہے۔ جب بجلی چمکتی ہے مارے ڈر کے دولائی سے منہ ڈھانپ لیتی ہوں۔ جب گرج کی آواز آتی ہے کانوں میں انگلیاں دے لیتی ہوں۔ اسی عالم میں آنکھ لگ گئی اتنے میں یہ معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میری گھگھی بندھ گئی۔ منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ اور آخر کار میں بیہوش ہو گئی۔

صبح کو چور کی ڈھونڈیا ہوئی وہ کہاں سے ملتا ہے۔ خانم منہ تھوتھائے بیٹھی ہیں۔ بوا حسینی بڑبڑاتی پھرتی ہیں۔ میں ٹھگ ماری سی چپکی بیٹھی ہوں۔ سب پوچھ پوچھ کے تھک گئے۔ مگر مجھے کچھ معلوم ہو تو بتاؤں۔

رسوا: یہ نہیں کہتیں کہ اگر معلوم بھی ہوتا تو کیوں بتاؤں؟

امراؤ: "خیر اب جانیے نہ چڑھائیے سُنے جائیے۔"

خانم کی اس دن کی مایوسی اور بوا حسینی کا اس چہرہ جب مجھے یاد آتا ہے تو بے اختیار ہنسی آتی ہے۔

رسوا: "کیوں نہ ہنسی آئے، ان کی تو ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں اور آپ کا مذاق ہو گیا۔"

امراؤ: "امیدیں خاک میں مل گئیں۔ خانم کو آپ نہیں جانتے، ایک ہی لکھا بیسوا تھیں۔ اس معاملہ کو اس طرح دبا دیا، جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا، اور انتیام کی وہ تدبیریں کیں کہ شاید و باید۔

اب کسی آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کی تلاش ہوئی۔ آخر ایک بُدھو پھنس گیا۔

ان دنوں ملک آئین سے ایک صدر الصدور کے صاحبزادے طالب علمی کے لئے لکھنؤ میں تشریف لائے ہوئے تھے۔ گھر سے خوش۔ والد مرحوم ان کے رشوت نذرانہ کے روپے سے ایک بڑا علاقہ ان کے صرف کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ چند روز یہاں آکر اچھے رہے پھر جو لکھنؤ کی ہوا لگی علم تماش بینی میں طاق اور فن بے غیرتی میں مشاق ہو گئے۔ اسم شریف علی تھا۔ راشد تخلص کرتے تھے۔ لکھنؤ کے کسی استاد نے مرشد بنا دیا اس تخلص پر آپ کو بہت ہی فخر تھا۔

وطن سے جو ملازم ہمراہ آئے تھے وہ سب رکھن میاں کہتے تھے۔ لکھنؤ والوں نے ان کو راجہ کا لقب دیا۔ مگر اس نام اور القاب میں کسی قدر دیہاتیت تھی۔ آپ لکھنؤ کی وضع قطع پر مرتے تھے۔ اس لیے تھوڑے ہی دنوں میں نواب صاحب بن گئے۔ جب گھر سے آئے تھے تو خاصی داڑھی منہ پر تھی۔ لکھنؤ کی ہوا لگتے ہی

پہلے کترواں ہوئی۔ پھر خشخاشی، اور تھوڑے دنوں کے بعد تو بالکل صفایا ہو گیا۔ داڑھی منڈنے سے چھوٹا سا چہرہ کیسا بدنما نکل آیا۔ مگر آپ اسے خوبصورتی سمجھتے تھے۔ سیاہ رنگ، چیچک کے داغ، بھدی سے ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں گال پچکے ہوئے۔ تنگ پیشانی۔ کوتاہ گردن۔ ٹھنگنا سا قد۔ غرض کہ بہمہ صفت موصوف تھے۔ مگر آپ اپنے کو یوسف ثانی سمجھتے۔ پہروں آئینہ سامنے رہتا تھا مونچھیں اس قدر مروڑی گئیں کہ آخر چوہیا کی دم ہوگئیں۔ بال بڑھائے گئے گھونگھر بنایا گیا۔ نکے دار ٹوپی سر پر رکھی گئی۔ اونچی چولی کا انگرکھا ڈانٹا۔ بڑے پائنچوں کا پاجامہ پہنا گیا۔ یہ سب ٹھاٹھ رنڈیوں کی درباری کے لیے کیا گیا تھا اول تو خود ہی طبیعت بہت رسا تھی۔ دوسرے لائق احباب کی وساطت سے چند ہی روز کے بعد اونچے اونچے کمروں پر رسائی ہوگئی۔ رسائی کیسی بے تکلفی بڑھ گئی۔ چھٹن جان سے مادر پدر ہو رہا ہے۔ بگن ٹیپیں لگاتی ہے۔ حنا نے جوتا کھینچ مارا۔ آپ ہیں کہ کھٹی کھٹی ہنس رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تھا مگر نائکاؤں کا بڑا ادب کرتے تھے جس رنڈی سے ایک شب کے لیے بھی واسطہ ہو گیا۔ اس کی نائکہ کو مجمع عام میں اماں جان کہنا اور جھک جھک کے تسلیم کرنا عین سعادت مندی تھی۔ اس میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ یاروں پر ظاہر ہو جاتا کہ آپ یہاں مشرب ہو چکے ہیں

سر شام سے دو تین گھڑی رات گئے تک خانم صاحب کا دربار کرتے تھے ان کی ہر ایک نوچی کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ علم موسیقی میں بھی آپ کو کمال تھا۔ ٹھمریاں خود تصنیف فرماتے۔ خود ہی دھن بنا کے گاتے تھے، خود ہی بھاؤ بتانے جاتے تھے۔ اور تو جو کچھ تھا وہ تھا منہ سے طبلہ خوب بجاتے تھے، یاروں نے خوب بنا لیا تھا۔ آپ کے اشعار پر لوگوں نے اتنی تعریف کہ آپ کو

فخرِ آتش و ناسخ بنادیا۔ مشاعروں میں ڈونگرے برسائے گئے۔ آپ سے غزل پڑھوائی تمام مشاعرہ چونک گیا۔ بھپتی گویوں سے پہلے آپ کا کلام پڑھا جاتا تھا ہنستے ہنستے لوگوں کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ لوگ بناتے تھے آپ خوش ہوتے تھے جھک جھک کے تسلیمیں کرتے تھے۔

وطن سے بے عمل وعش روپیہ چلا آتا تھا۔ ان کی والدہ بے چاری اس خیال سے کہ لڑکا پڑھنے گیا ہے مولوی بن کے آئے گا۔ یہ جو کچھ لکھ بھیجتے تھے بھیج دیتی تھیں لکھنؤ کے بے فکرے، خوش پوشاک عیش پسند مفت خورے، آپ کے ہمراہ رہتے تھے۔ انہیں لوگوں کے کہنے سننے سے کچھ خیال پیدا ہوا۔ اس خیال نے ترقی کرتے کرتے اشتیاق تک نوبت پہنچائی۔ آخر کو عشق اور اس کے بعد جنون ہو گیا۔ ادھر خانم نے کھنچاؤ کیا۔ خانم کا یہ کہنا "نا صاحب! ابھی وہ کمسن ہے اور ان کی التجامنت وزاری، بیقراری آج تک مجھے یاد ہے۔ آخر دعا تعویذ کی تاثیر اور غم خواروں کی دوادوش سے، پانچ ہزار روپے پر نوڑھیوا۔ اس روپے کے لینے کے لیے آپ کو چند روز کے لیے وطن جانا پڑا۔ ماں سے چھپا کے دو گاؤں آپ نے رہن کر دیئے، بس پچیس ہزار روپے لے کے لکھنؤ آئے پانچ توڑے گن دیئے۔

روپیہ عین المال دیوانجی کی معرفت خانم کے خزانۂ عامرہ میں داخل ہوا۔ بوا حسینی نے پاؤں پھیلائے۔ پانچ سو روپے نذر نیاز کے نام سے لے کر مریں۔ خلاصہ یہ کہ میں آپ کے سر منڈھ دی گئی۔ چھ مہینے تک آپ لکھنؤ میں رہے سو روپے ماہوار دیتے تھے۔ فرمائشوں کا ذکر نہیں جو کچھ مجھے خفیہ دیا وہ بوا حسینی کے پاس رہتا تھا۔ خانم کو اس کی خبر نہ تھی۔ اب میں گویا آزاد ہو گئی۔ دو مہریاں دو خدمت گار میرے لیے خاص ملازم ہوئے پھاٹک کے پاس والا کمرہ میرے لیے سجادیا گیا دو چار مرد آدمی شریف زادے، نواب زادے میرے پاس بھی آ کر بیٹھنے لگے

گلبدین اول گوہر مرزا ہر زمانے میں مجھ سے برابر ملتا رہا۔ خانم اور بوا حسینی اس کی صورت سے جلتی تھیں۔ مجھے محبت تھی۔ اس لیے کوئی روک نہیں سکتا تھا ادھر گوہر مرزا کے والد نے انتقال کیا۔ جو آمدنی ننہال سے تھی وہ بند ہو گئی۔ نوٹر چھبا ہو چکی تھیں۔ کوئی پوچھتا نہ تھا۔ اس لیے گوہر مرزا کے صرف کی خبر گیری میرے ذمہ تھی۔

سب رنڈیوں کا قاعدہ ہے کہ ایک نہ ایک کو اپنا بنائے رکھتی ہیں۔ ایسے شخص سے بہت زیادہ فائدہ ہوتا۔ ایک تو یہ کہ جب کوئی نہ ہوا تو اسی سے دل بہلایا۔ سودے سلف کا آرام رہتا ہے۔ آدمی سے منگاؤ تو کچھ نہ کچھ کھا جائے گا۔ یہ مارے خیر خواہی کے اچھے سے اچھی چیز شہر بھر سے ڈھونڈ کے لاتے ہیں۔ بیمار پڑو تو حد سے زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ طرح طرح کے آرام دیتے ہیں۔ رات بھر پاؤں دباتے ہیں۔ صبح کو دوا بنا کے پلاتے ہیں۔ حکیم صاحب سے حال کہنے جاتے ہیں۔ دوست آشناؤں سے تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ چرکٹ پھنسا کے لاتے ہیں۔ جہاں شادی بیاہ ہوا ناچ کا انتظام اپنے ذمہ لے کے مجرے میں ان ہی کو لے جاتے ہیں۔ محفل میں بیٹھ کے اہل محفل کو متوجہ کرتے ہیں۔ وہ ناچ رہی ہے یہ تال دیتے جاتے ہیں ہر سم پر آہ کہتے ہیں۔ ہر تال پر واہ کر رہے ہیں

انہیں کی وجہ سے اچھے سے اچھا کھانے کو ملتا ہے۔ خاطر مدارات اور رنڈیوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ انعام و اکرام سوا ملتا ہے۔ اگر کسی رئیس امیر سے ملاقات ہو گئی ان ہی کی بدولت ان کو لطف رقابت حاصل ہوتا ہے ادھر وہ چاہتے ہیں۔ کہ رنڈی ان کو چاہنے لگے۔ ادھر رنڈی جان جان کے دم کا کلمہ بھر رہی ہے کبھی یہ فقرہ ہے "صاحب! میں ان کی پابند ہوں" نہیں معلوم آپ سے کیوں ملتی ہوں اب ان کے آنے کا وقت ہے۔ مجھے جانے دیجئے وہ تو ہمنشہ کے ہیں۔ آپ اس

طرح کیا نباہیئے گا۔

تماشبین ان سے دبتے رہتے ہیں۔ اگر کسی سے کچھ تکرار ہوئی یہ حمایت کو مستعد شہر کے بانکے ترچھوں سے ملاقات۔ بات کی بات میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو سکتے ہیں۔ تماشبین ایک طرف خود نائکہ پر دباؤ رہتا ہے۔ ہر وقت یہ خوف لگا رہتا ہے کہ رنڈی ان کو پیار کرتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو ان کے گھر جا بیٹھے۔

امیر جان کاظم علی پر مرتی تھیں۔ برسوں اپنے پاس سے روپیہ دیا۔ ایک مرتبہ پانچ سو کے کڑے اتار کے دے دیئے اور صبح کو غل مچا دیا کوئی اتار کر لے گیا

ایک دن جھالر کی ایک فرد گیارہ سو کے جوڑے کی دے دی۔ اور کہہ دیا کہ عیش باغ کے میلے میں کانوں سے گر گئی۔ اسی طرح ہزاروں روپیہ کا سلوک کیا۔ گھر بھر کی رنڈیاں امیر جان کی بدولت تھیں۔

خورشید پیارے صاحب پر جان دیتی تھیں۔ بسم اللہ کے کوئی آشنا نہ تھا۔ طبیعت میں سفلہ پن تھا، کسی پر بند نہ تھیں۔

اوروں کا ذکر کیا، خانم صاحب، پچاس پچپن برس کی سن میں میر اولاد علی پر جان دیتی تھیں۔ میر صاحب کا سن اٹھارہ انیس برس کا۔ صورت دار جوان تھے کسرتی بدن تھا۔ اچھے اچھوں کی نگاہ پڑتی تھی۔ خانم کا رعب غالب تھا۔ کیا مجال کوئی بات کر سکے۔ بے چارے غریب آدمی تھے۔ نان شبینہ کو محتاج۔ خانم کی بدولت سارا کنبہ پرورش پاتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار روپیہ لگا کے شادی کر دی مگر برات کی رات کے سوا میر صاحب کو کبھی شب کو گھر میں سونا نصیب نہیں ہوا دن رات یہیں رہتے تھے۔ گھڑی دو گھڑی کو گھر بھی ہو آتے تھے۔

ایک اور مرزا صاحب کوئی ستر برس کا سن۔ کمر جھکی ہوئی۔ نہ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ خانم صاحب کے قدیم آشناؤں میں تھے۔ اب ان سے

کوئی واسطہ نہ تھا مگر گھر والوں کی طرح رہتے تھے صبح شام کھانا خانم کے ساتھ کھاتے تھے کپڑا خانم بنوا دیتی تھیں۔ فہیم گنا، ریوڑیاں ان سب کے اخراجات کا بار خانم کے سر تھا۔ ایک دن ہم لوگ خانم صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں خورشید جان غمزدہ صورت بنائے بیٹھی ہیں۔

کیوں! پیارے صاحب کی شادی ہوتی ہے۔ ان پر غم سوار ہے۔ خانم نے براہِ فہمائش کہا جاؤ چھوکریوں! نہیں معلوم اس زمانے کی تختیں کس قسم کی ہیں۔ جیسے رنڈیاں ویسے اُن کے آشنا۔ ایک ہمارا زمانہ تھا دیکھو (مرزا صاحب کی طرف اشارہ کر کے) ایک یہی مرد آدمی بیٹھے ہیں۔ جوانی میں مجھ سے آشنائی ہوئی۔ ماں باپوں نے شادی ٹھہرائی، یہ مانجھے کا جوڑا پہن کے مجھے دکھانے آئے۔ میں نے مانجھے کے جوڑے کے پرزے پرزے کر دیئے۔ ہاتھ پکڑ کے بیٹھ گئی کہ میں تو نہ جانے دوں گی۔ اس کو چالیس برس کا زمانہ گزرا، آج تک تو گھر نہیں گئے۔

کہو ہے کوئی ایسا تمہارا بھی؟ سب نے سر جھکا لیا۔

(۶)

یوں تو بسم اللہ کی مسی میں پہلے پہل ناچی گائی تھی۔ مگر پہلا مجرا میرا نواب شجاعت علی خاں لڑکے کی شادی میں ہوا تھا۔ وہ محفل بھی یادگار تھی۔ نواب کی بارہ دری کس شان سے سجائی گئی تھی۔ بیش قیمت شیشہ آلات کی روشنی سے رات کو دن ہو گیا۔ صاف ستھرا فرش، ایرانی قالین، زربفت کے مسند تکیے۔ سامنے رنگ رنگ کے مردانگوں کی قطار روشن۔

عطر اور پھولوں کی خوشبو سے تمام بارہ دری بسی ہوئی تھی۔ دھواں دھار حقوں کی خوشبو، گلوریوں کی مہک سے دماغ معطر تھے۔ میرا سن کوئی چودہ برس کا تھا اس زمانے میں بڑودے سے ایک بائی جی آئی ہوئی تھیں۔ تمام شہر میں ان کے گانوں کی دھوم تھی۔ بڑے بڑے گویے کان پکڑتے تھے۔ معلومات ایسی کہ پوتھیاں گویا نوک زبان تھیں۔ گلا نہ کہ چار تحلے اُدھر آواز جائے۔ مگر واہ خانم صاحب واقعی کیا رنگ دیکھتی تھیں۔ ان کے بعد مجھ کو کھڑا کر دیا۔ مجھے تو کیا تمیز تھی مگر سمجھدار لوگ حیران تھے کہ خانم صاحب کیا کرتی ہیں۔ بھلا بائی جی کے سامنے اس چھوکری کا رنگ جمے گا؟"

پہلے گت شروع ہوئی، اس میں کچھ محفل میری طرف مخاطب ہوئی۔ میری بھی وہ اٹھتی جوانی تھی۔ صورت اچھی نہ تھی، مگر اس وقت کی بھرتی چالاکی الھڑ پن۔

کچھ نہ پوچھو شباب کا عالم
کیا کہوں کیا عجب زمانہ تھا

گت تھوڑی ہی دیر ناچی ہوں گی کہ خانم نے یہ غزل شروع

کرا دی۔

آج اس بزم میں وہ جلوہ نما ہوتا ہے
دیکھئے دیکھئے ایک آن میں کیا ہوتا ہے

اس غزل کے شروع کرنے کے ساتھ ہی محفل تہ و بالا ہوگئی۔ اس کے بعد دوسرا مطلع اک ذرا بتا کے جو گایا اہل محفل جھومنے لگے۔

نالہ رکتا ہے تو سرگرم جفا ہوتا ہے
درد تھمتا ہے تو بیدرد خفا ہوتا ہے

اور اس شعر نے تو قیامت ہی برپا کر دی۔

پھر نظر جھینپتی ہے اور آنکھ جھکی جاتی ہے
دیکھئے دیکھئے پھر تیر خطا ہوتا ہے

اس شعر کا یہ حال تھا کہ جس سے نظر ملا کے گایا پھر نظر نہ اٹھا سکا۔

بت پرستی میں نہ ہوگا کوئی مجھ سا بدنام
جھینپتا ہوں جو کوئی ذکر خدا کرتا ہے

ذرا اس شعر کو سنیئے اور قیاس کیجئے عاشق مزاجوں پر اس کا کیسا اثر ہوا ہوگا

عشق میں حسرت دل کا تو نکلنا کیسا؟
دم نکلنے میں بھی کمبخت مزا ہوتا ہے

پھر اس کے بعد یہ شعر پڑھا۔

حال دل ان سے نہ کہنا تھا ہمیں چوک گئے
اب کوئی بات بنائیں بھی تو کیا ہوتا ہے

تمام محفل پر وجد کا عالم طاری تھا۔ ہر شخص محظوظ۔ ہر لفظ پر واہ،

ہر رسم پر آہا ہا۔ ایک شعر آٹھ آٹھ دس دس مرتبہ گوایا گیا۔ پھر بھی سیری نہیں ہوتی تھی۔ اسی غزل پر میرا مجرا موقوف ہوا۔ دوسرے مجرے میں پھر یہی گوائی گئی۔

مرزا رسوا: "وہ خیر محفل کا جو حال ہوا ہو۔ از برائے خدا اور جس قدر شعر اس غزل کے یاد ہوں سنا دیجئے۔ یہ کس کی غزل ہے؟"

امراؤ۔ "اوئی۔ کیا آپ نہیں جانتے؟"

رسوا: "میں سمجھا۔"

امراؤ: "اور شعر سنیئے۔"

غالب گور میں پہنچ جاتے ہیں مرنے والے
وہ بھی اس وقت جب شوق سا ہوتا ہے

رسوا: "سبحان اللہ"

امراؤ: "واقعی قلم توڑ دیا ہے"

آہ میں کچھ بھی اثر ہو تو شرربار کہوں
ورنہ شعلہ بھی حقیقت میں ہوا ہوتا ہے

رسوا: "یہ فلسفہ ہے۔ اسے وہی خوب سمجھتے ہیں"

امراؤ: "اور سنیئے۔"

کس قدر متفق حسن مکافات ہوں میں
دل میں خوش ہوتا ہوں جب رنج سوا ہوتا ہے

رسوا: "یہ بھی فلسفہ ہے۔ اسے وہی خوب سمجھتے ہیں"

امراؤ: "اور سنیئے"

شوقِ اظہار ہے اگر تو میرے دل کو نہ توڑ
اسی آئینہ میں تو جلوہ نما ہوتا ہے

رسوا: "یہ تصوف ہے۔ ہم دنیا کے لوگ ہیں، ہمیں اس سے کچھ غرض نہیں مگر "شوقِ اظہار" یہ لفظیں کیونکر مل جایا کرتی ہیں"۔

امراؤ: "مقطع سنیئے۔"

ہجر میں نالہ و فریاد سے باز آ

ایسی باتوں سے وہ بیدرد خفا ہوتا ہے

رسوا: "مطلع سے مقطع نکالا ہے۔ مقطع کہنے کی فرصت نہ ملی ہوگی"۔

امراؤ: "فرصت انہیں کب ملتی ہے"۔

پہلے مجرے کے دوسرے دن بوا حسینی میرے کمرے میں آئیں۔ ایک خدمت گار ان کے ساتھ تھا۔

بوا حسینی: "دیکھو امراؤ صاحب یہ کیا کہتا ہے"۔

اتنا کہہ کے بوا حسینی کمرہ کے باہر چلی گئیں۔

خدمت گار۔ (سلام کر کے) "مجھے نواب سلطان صاحب نے بھیجا ہے۔ جو کل شب کو محفل میں زرد قندیلی سر پہ رکھے دولھا کے داہنی طرف بیٹھے تھے۔ اور فرمایا ہے کہ میں کسی وقت آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ بشرطیکہ جس وقت میں آؤں اس وقت کوئی اور نہ ہو۔ اور اس غزل کی نقل مانگی ہے جو آپ نے کل گائی تھی۔

میں: "نواب صاحب سے میری تسلیمات کہنا اور کہنا شام کو جب چاہیئے تشریف لائیے۔ تخلیہ ہو جائے گا۔ غزل کے لیے دن کو کسی وقت آنا۔ لکھ دوں گی"۔

دوسرے دن پہر دن چڑھے خدمت گار آیا۔ میں کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی غزل کی نقل میں نے کر رکھی تھی۔ اس کے حوالے کی۔ اس نے پانچ اشرفیاں کمر سے نکال

کے مجھے دیں۔ اور کہا کہ نواب صاحب نے کہا ہے کہ آپ کے لائق تو نہیں مگر خیر پان کھانے کے لیے میری طرف سے قبول کیجئے۔ آج شب کو چراغ جلنے کے بعد میں ضرور آؤں گا۔ خدمت گار سلام کر کے رخصت ہوا۔ اس کے جانے کے بعد پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ بوا حسینی کو بلا کے یہ اشرفیاں دیدوں وہ خانم کے حوالے کر دیں۔ پھر ایک دفعہ اشرفیوں کی طرف جو دیکھا چمکتی چمکتی نئے گھن کی اشرفیاں، بھلا میرے دل سے کب نکلتی تھیں۔ اس وقت صندوقچہ وندوقچہ تو میرے پاس نہ تھا پلنگ کے پائے کے نیچے دبا دیں۔

---

(۷)

مرزا رسوا صاحب! میرے نزدیک ہر عورت کی زندگی میں ایک وہ زمانہ آتا ہے۔ جب وہ چاہتی ہے کہ اُسے کوئی چاہے۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ یہ خواہش چند روزہ ہے بلکہ عنفوان شباب سے اس کی ابتدا ہوتی ہے اور سن کے ساتھ ہی اس کا نشوونما ہوتا رہتا ہے۔ جس قدر سن بڑھتا ہے اسی قدر خواہش بڑھتی رہتی ہے۔

گوہر مرزا بے شک میرا چاہنے والا موجود تھا، مگر اس کی چاہت اور قسم کی تھی اس کی چاہت میں ایک بات کی کمی تھی۔ جسے میرا دل ڈھونڈھتا تھا۔ مردانہ ہمت کو اس کی طبیعت میں لگاؤ نہ تھا۔ ماں کا ڈومنی پنا اس کے خمیر میں شامل تھا وہ جو کچھ چاہتا تھا مجھ سے چھین جھپٹ کے لے لیتا تھا۔ خود ایک روپیہ کے سوا جس کو میں کبھی کبھی ہٹوں کبھی نہیں دیا۔ اب میرا دل ایسا عاشق ڈھونڈھتا تھا۔ جو میری ناز برداری کرے۔ روپیہ خرچے، کھلائے پلائے۔ نواب سلطان صاحب (نواب صاحب کا یہی نام آدمی نے بتایا تھا) صورت شکل کے اچھے تھے۔ ان کے چہرے پر اس قسم کا رعب تھا۔ جس پر عورت ہزار دل سے فریفتہ ہو جاتی تھی بعض لوگ غلطی سے یہ خیال کر بیٹھتے ہیں کہ عورت کو صرف خوشامد اور اظہار عشق پسند ہے۔ بے شک پسند ہے، مگر شرط یہ ہے کہ اس میں ذرا بھی کمینہ پن نہ ہو!! جو لوگ رنڈیوں کا گھناتا کتے ہوئے آتے ہیں۔ جن کے ہر کناتے سے یہ مدعا نکلتا ہے کہ ہمیں چاہو۔ خدا کے لیے چاہو۔ چاہو اور ہمارے گھر پڑ جاؤ۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے ہمیں دیدو۔ اور ہمارے گھر کی ماماگیری کرو۔ روٹیاں پکا پکا کے کھلاؤ۔ ہمارے اور ہمارے بال بچوں کی جوتیاں سیدھی کرو۔ ہر شخص کا

حسن حضرت یوسف کا معجزہ نہیں ہے کہ ہر ایک عورت اس پر جان دینے لگے۔ مرد عورت سے اور عورت مرد سے محبت کرتے ہیں۔ مگر اس محبت میں اکثر اغراض ذاتی کا بھی لحاظ رہتا ہے۔ بے غرض محبت جیسے لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، یہ صرف قصے کہانیوں میں سنی جاتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اکیطرفہ محبت نہیں ہوتی۔ ہم نے ایسے بھی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مگر اس کو خلل دماغ سمجھنا چاہیئے۔ پھر کیا ضرورت ہے کہ مرد عورت دونوں دیوانے ہوں۔

دوسرے دن شب کو نواب صاحب تشریف لائے۔ بوا حسینی سے معمولی گفتگو کے بعد تعین اخراجات ہو کر کمرے میں تخلیہ ہو گیا۔ معلوم ہوا نواب صاحب نے ملازم نہیں رکھا۔ صرف یہ طے ہوا ہے کہ کبھی کبھی رات کو گھڑی دو گھڑی کیلئے آیا کریں گے۔ نواب صاحب بہت ہی کمسخن، بھولے بھالے آدمی تھے۔ سن اٹھارہ انیس برس کا تھا۔ بسم اللہ کے گنبد میں پرورش پائی تھی۔ ماں باپ کے دباؤ میں تھے۔ دنیا کے جعل فریب سے آگاہ نہ تھے۔ اظہار تعشق خدمتگار کی زبانی ہو چکا تھا۔ ورنہ نواب صاحب کو اس میں بھی کسی قدر مشکل ہوتی۔ مگر میں نے تھوڑی دیر میں بے تکلف بنا لیا۔

بہت سی لگاوٹ کی باتیں کیں بالکل عاشق زار بن گئی۔ اس میں کچھ جھوٹ تھا کچھ سچ۔ سچ تو اس لیے کہ نواب صاحب کی صورت ایسی نہ تھی۔ کہ ایک عورت خواہ کیسی ہی سخت دل کیوں نہ ہو ان پر مائل نہ ہو جائے۔ گوری گوری رنگت جیسے گلاب کا پھول ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ۔ خوبصورت بتیسی، گھونگھر والے بال، کتابی چہرہ، اونچا ماتھا، بڑی بڑی آنکھیں بھرے بھرے بازو، مچھلیاں پڑی ہوئی۔ چوڑی کلائیاں، بلند بالا کسرتی بدن۔ خدا نے سر سے لے کر پاؤں تک تمام بدن نور کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ اس پر بھولی بھولی

باتیں۔ بات بات میں عاشقانہ شعر جن میں اکثر انہیں کی تصنیف، شعر پڑھنے میں ہوا دُ لوٹا ہوا تھا۔ خاندانی شاعر تھے۔ مشاعروں میں اپنے والد کیساتھ غزل پڑھتے تھے

شاعروں کو کیسا ہی عاشقانہ شعر ہو۔ کسی کے سامنے پڑھتے ہوئے جھجک نہیں ہوتی۔ خورد بزرگ کے سامنے اور خورد بزرگ کے سامنے چاہے اور قسم کی گفتگو نہ کرتے ہوں مگر شعر پڑھنے میں تکلف نہیں ہوتا۔ شعر بھی ایسے کہ اگر نثر میں ان کا مطلب ادا کیا جائے تو منہ سے کہتے نہ بنے۔ غرض کہ اس شب کو بڑے مزے کی صحبت رہی

نواب :" آپ کی اداؤں نے تو مجھے ایسا فریفتہ کر لیا کہ بغیر آپ کے دیکھے مجھے چین ہی نہیں آتا "

میں " یہ سب آپ کی قدر دانی ہے۔ ورنہ میں کیا اور میری حقیقت کیا۔" ایاز قدر خود بشناس من آنم کہ من دانم "

نواب " اوہو! آپ تو خواندہ معلوم ہوتی ہیں "

میں " جی ہاں کچھ شدھ بدھ پڑھا تو ہے "

نواب " اور لکھنا بھی جانتی ہو ؟"

میں " جی ہاں، لکھ بھی لیتی ہوں "

نواب " تو وہ غزل آپ ہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے ؟"

(میں مسکرا کے چپ ہو رہی)

نواب " واللہ کتنا پیارا خط ہے۔ اس بات سے تو بہت ہی جی خوش ہوا۔ خدمت گاروں سے دل کا حال کہتے نہیں بنتا۔ اب زبان قلم سے گفتگو ہوا کرے گی۔ ہم تو ایسا چاہتے ہی تھے۔ جہاں تک ہو سکے ایسے

معاملے میں غیر کی وساطت نہ ہو۔"

نہ غیروں کی وساطت ہو نہ یاروں کی شماتت ہو
جو ہیں آپس کی باتیں رازدارِ ان کے ہیں تم ہیں۔

میں" یہ آپ ہی کا شعر ہے؟

نواب" جی نہیں۔ والد مرحوم نے فرمایا تھا۔"

میں "کیا خوب فرمایا ہے۔"

نواب" ماشاء اللہ! آپ کو شاعری کا مذاق بھی ہے۔"

اچھی صورت جو خدا دے تو یہ اوصاف بھی دے
حسنِ تقریر بھی ہو خوبیٔ تحریر بھی ہو

میں" کس کا شعر ہے؟

نواب" انہیں کا۔"

میں" کیا خوب فرمایا ہے

نواب" جی ہاں وہ ایسا ہی فرماتے تھے۔ مگر واللہ آپ کی شان کے لائق ہے۔

میں۔ یہ فقط آپ کی عنایت ہے
ورنہ میں کیا مری حقیقت کیا

نواب" واہ کیا صاف صاف شعر ہے۔"

میں" تسلیم۔"

نواب" یہ کہیے آپ شعر بھی کہہ لیتی ہیں؟

میں" جی نہیں۔ آپ ایسے قدر دانوں سے کہلوا لیتی ہوں۔"

اس بات پر نواب صاحب اک ذرا چیں بجبیں ہوئے۔ پھر مجھے مسکراتے

ہوئے دیکھکر ہنس پڑے۔

نواب :" خوب کہی۔ جی ہاں اکثر رنڈیوں کا یہ وطیرہ ہے کہ یاروں سے کہلوا کے اپنے نام سے پڑھا کرتی ہیں "

میں :" آپ رنڈیوں کو ایسا نہ کہئے۔ کیا مرد ایسا نہیں کرتے؟

نواب :" واللہ سچ ہے۔ والد مرحوم کے دوستوں میں اکثر ایسے صاحب ہیں۔ جنہوں نے کبھی ایک مصرعہ نہیں کہا اور ہر مشاعرہ میں غزل پڑھنے کو موجود۔ اکثر والد ہی کہہ دیا کرتے تھے۔ کبھی ایسا ہوتا تھا کہ میری غزل میں شعر زائد ہوئے چھانٹ دیئے۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں لطف ہی کیا ہے۔ والد مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے حضرت استاد کے بنائے ہوئے شعر دیوان سے نکال ڈالے۔ جھوٹی تعریفوں سے دل کو کیا خوشی ہوتی ہوگی "

میں :" خدا جانے! یہ بھی ایک ہوس ہے اور بڑی ہوس۔

نواب :" اچھا تو اس غزل کا اور کوئی شعر یاد ہے تو پڑھیئے۔

میں :" فرض ہے ضبط نالہ و فریاد
جس سے ناخوش ہو تم وہ عادت کیا

نواب :" کیا شعر پڑھا ہے۔ پھر پڑھیئے گا۔ واللہ کیا نئی بات کہی ہے "

میں۔ (شعر دوبارہ پڑھ کے) تسلیم۔ آپ قدردانی کرتے ہیں "

نواب :" شعر ہی اچھا ہے۔ اور کوئی شعر پڑھیئے

میں۔" اس طرح میں میری غزل نہیں۔ یہ دو شعر ابھی کہے ہیں۔

نواب :" یہ اور طرہ ہوا۔ فی البدیہہ اور ایسے شعر۔ اچھا اور کسی غزل کے شعر پڑھیئے "

میں۔" اب آپ ارشاد کیجئے۔ اسی لیے میں نے سبقت کی تھی۔

نواب :۔ میں پڑھے دیتا ہوں۔ مگر آپ کو غزل پڑھنا ہو گی :۔

اتنے میں کمرہ کا دروازہ دھڑاک سے دروازہ کھلا۔ اور ایک صاحب پچاس پچپن برس کا سن، سیاہ رنگت، بڑی داڑھی، ترچھی پگڑی باندھے کمر بندھی ہوئی کٹار لگی ہوئی۔ کمرے کے اندر گھس آئے اور آتے ہی نہایت بے تکلفی سے میرا زانو پکڑ کے بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر جھکا لیا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ کہاں تو نواب صاحب سے یہ اقرار تھا کہ بالکل تخلیہ ہو گا۔ کمرے میں کوئی نہ ہو گا۔ کس مزے کی بات، کیا ستھرا مذاق تھا۔ کیا راز و نیاز ہو رہا تھا۔ کہاں یہ بلائے مہیب نازل ہوئی۔ سنگ آمد و سخت آمد ہائے کیا مزے کی صحبت تھی۔ اس کمبخت نے کیسے مزے میں خلل ڈالا۔ نواب ابھی غزل کہنے کو تھے اس کے بعد میں کچھ کہتی۔ نواب تعریفیں کرتے۔ کیا دل خوش ہوتا۔ آج تو ایسا ایک قدر دان ملا تھا۔ جسے مدتوں سے میرا دل ڈھونڈھتا تھا۔ اور آج ہی اس آفت کا سامنا ہوا۔ خدا اس موئے کو جلدی یہاں سے اٹھائے۔ یہ خیالات میرے دل میں تھے اور وہ خوں خوار صورت آنکھوں کے سامنے تھی۔ جس کی طرف سے میرا دل لرزا جاتا تھا۔ یہ تو میری جان کو گویا دلاور خاں ہو گیا۔ مجھے بار بار اندیشہ تھا کہ کٹار جو اس کی کمر میں ہے یا بر کلیجے کے پار ہو گی۔ یا خدا نخواستہ نواب کو کچھ گزند پہنچائے گی۔ دل ہی دل میں کوستی تھی۔ خدا غارت کرے۔ موا کہاں سے اس وقت آگیا۔

آخر مجھ سے اور تو کچھ نہ بن پڑا۔ بوا حسینی کو آواز دی۔ انہوں نے آکے یہ ماجرا دیکھا سمجھ گئیں بوا حسینی کی باتوں سے معلوم ہوا کہ وہ ان صاحب کو کچھ جانتی بھی تھیں۔

بوا حسینی :۔ خاں صاحب ! مجھے کچھ آپ سے عرض کرنا ہے۔ ادھر

تشریف لائیے۔"

خاں صاحب "جو کچھ کہنا ہے وہیں سے کہو۔ ہم لوگ کہیں بیٹھ کے اٹھتے ہیں۔"

بوا حسینی "تو خاں صاحب! کوئی زبردستی ہے۔"

خاں صاحب "اس میں زبردستی کیا۔ رنڈیوں کے مکان پر کسی ...... کا اجارہ نہیں۔ اور اگر یہ تو زبردستی ہی سہی۔ ہم تو نہیں اٹھنے کے دیکھیں تو ہمیں کون ...... اٹھا دیتا ہے۔"

بوا حسینی "اجارہ کیسے نہیں۔ جو زرِ خرچے گا رنڈی اسی کی ہے۔ پھر اور کوئی اس وقت نہیں آ سکتا۔"

خاں صاحب "تو زرِ خرچنے کو ہم نابر ہیں۔"

بوا حسینی "اچھا مگر اس وقت اس کا کوئی موقع نہیں۔ اور کسی وقت تشریف لایئے گا۔"

خاں صاحب "عورت کچھ واہی ہوتی ہے۔ کہہ دیا ہم نہیں اٹھینگے۔"
میں نے دیکھا کہ نواب کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔ مگر ابھی تک چپکے بیٹھے رہے۔ کچھ منہ سے نہیں بولے۔

بوا حسینی "بیٹی! اچھا تو اٹھ کے ادھر چلی آ۔ نواب صاحب آپ کے آرام کا وقت ہے۔ کوٹھے پر تشریف لے جائیے۔"

میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو اس نگوڑ مارے نے زور سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اب کیا کروں۔

نواب "خاں صاحب رنڈی کا ہاتھ چھوڑ دیجیے۔ اسی میں خیریت ہے آپ بہت کچھ زیادتیاں کر چکے ہیں۔ میں خاموش بیٹھا رہا صرف اس خیال

ہے کہ رنڈی کے مکان پر ٹھنٹک کرنا اچھا نہیں۔ مگر آپ ......"
خاں صاحب۔ مگر اب تم کیا کر سکتے ہو۔ دیکھیں تو کون ......
رنڈی کا ہاتھ چھڑا لیتا ہے۔"
ہیں" (زور سے ہاتھ جھٹک کر) اچھا تو ہاتھ چھوڑ دیجئے میں کہیں جاتی
نہیں (دل میں نواب کو چھوڑ کے ہرگز نہ جاتی)
(خاں صاحب نے ہاتھ چھوڑ دیا)
نواب" میں کہے دیتا ہوں کہ ذرا زبان سنبھال کے گفتگو کیجئے معلوم
ہوتا ہے کہ آپ نے شریفوں کی صحبت نہیں اٹھائی۔
خاں صاحب" خیر تم نے تو شریفوں کی صحبت اٹھائی ہے
جو کچھ ہو سکے کر لو"
نواب" یہ تو معلوم ہوا کہ آپ لڑنے پر آمادہ ہیں۔ مگر رنڈی کا مکان
بھی اکھاڑہ نہیں ہے۔ نہ میدان۔ بہتر ہے کہ اس کو کسی اور وقت پر موقوف رکھیئے
اور اب تشریف لے جایئے۔ نہیں تو ......"
خاں صاحب" نہیں تو تم مجھے گھول کے پی جاؤ گے۔ تشریف لے جایئے
ایک ہی کہی۔ تمہیں نہیں چلے جاتے"
نواب" خاں صاحب! جناب امیر کی قسم۔ میں بہت طرح دیتا ہوں
اس لیے کہ مجھے کسی قدر اپنی عزت کا سوال ہے۔ والدین، عزیز، دوست
سُننے گا نام دھرے گا۔ ورنہ آپ کو ابھی ان گستاخیوں کا مزا چکھا دیتا
مگر میں آپ سے کہتا ہوں کہ بے فایدہ حجت نہ کیجئے تشریف
لے جایئے"
خاں صاحب" رنڈی کے گھر پہ تو آتے ہو اور اماں جان سے

ڈرتے ہو گستاخیاں کیوں ہوں میں تمہارے باپ کا نوکر ہوں۔ تم اپنے گھر کے رئیس زادے ہو تو ہوا کرو۔ رنڈی کے مکان پر تم بھی بیٹھے ہو ہم بھی بیٹھے ہیں۔ جب ہمارا جی چاہے گا چلے جائیں گے۔ تم خود بے کار حجت کرتے ہو کسی کو اٹھاتے نہیں دیکھا۔

نواب :" اٹھا دینا کوئی مشکل نہیں ہے۔ خدمت گاروں کو آواز دیتا ہوں تو آپ کی گردن میں ابھی ہاتھ دے کے نکال دیتے ہیں۔"

خاں صاحب :" خدمت گاروں کے بل پر نہ پھولنا۔ یہ کٹار بھی دیکھا ہے۔

نواب :" ایسے بہت کٹار دیکھے۔ جو وقت پر کام آوے وہ کٹار ہے آپ کی کٹار میان سے نکلتی رہے گی۔ یہاں تو ابھی آپ کی گردن ناپ دی جائے گی۔" پھر دیکھا جائے گا۔"

خاں صاحب :" لے اب تمہیں گھر کو چلے جاؤ۔ اماں جان یاد کرتی ہوں گی۔"

میں دیکھ رہی تھی کہ نواب کا چہرہ بالکل متغیر ہو گیا ہے۔ مارے غصے کے تھر کانپ رہے ہیں۔ مگر واہ ری شرافت اس پاجی نے کس قدر سخت سخت کہا۔ مگر یہ آپ ہی کی آپ کر کے بات کر رہے ہیں۔ اس سے مجھے پہلے تو یہ خیال پیدا ہوا کہ نواب ڈر گئے مگر میرا یہ خیال غلط نکلا۔ واقعی نواب کو اپنی عزت کا خیال تھا۔ اسی لیے طرح دے رہے تھے۔ چاہتے تھے کہ معاملہ سہولت سے رفع دفع ہو جائے۔ مگر اس پاجی کی بد ذاتی بڑھتی جاتی تھی۔ جس قدر نواب طرح دیتے تھے وہ اور شیر ہوتا جاتا تھا۔ آخر نواب نے کہا۔

نواب :- اچھا اٹھیے خاں صاحب! ہم آپ دونوں سے یہاں سے چلے چلیں. عیش باغ میں چل کے ہمارے آپ کے دو دو ہاتھ ہو جائیں ؟

خاں صاحب (قہقہہ مار کے) صاحب زادے! ابھی تم خود منہ چومنے لائق ہو اور مردوں سے خانہ جنگی کرنے کا حوصلہ. کہیں کوئی چیر کا کھا جاؤ گے، اماں جان روتی پھریں گی.

نواب . مردود! اب تیری بدزبانیاں حد کو پہنچ گئی ہیں. دیکھ اب تجھے تیری گستاخیوں کی سزا دیتا ہوں.

یہ کہتے ہی نواب نے دولائی کے اندر سے ہاتھ نکالا ہاتھ میں طپنچہ تھا. دن سے داغ دیا. خاں صاحب دھم سے گر پڑے. میں سن سے ہو گئی. فرش پر خون ہی خون نظر آتا تھا. بوا حسینی جہاں کھڑی تھیں وہیں کھڑی رہ گئیں. طپنچہ کی آواز سن کے خانم صاحب، مرزا صاحب، میر صاحب، خورشید جان، امیر جان، بسم اللہ جان خدمتگار، مہریاں، تو، میں سب دوڑے آئے. میرے کمرے میں بھیڑ ہو گئی سب اپنی اپنی کہنے لگے. اتنے میں شمشیر خاں نے (ایک ادھیڑ سا آدمی نواب صاحب کا ملازم) لپک کے نواب کے ہاتھ سے طپنچہ لیا اور کہا: "لے حضور اب گھر تشریف لے جائیں میں سمجھ لوں گا."

نواب :- میں نہیں جاتا. اب جو کچھ ہوا ہوا. اور جو کچھ ہونا ہوگا ہو جائیگا.

شمشیر خاں :- (کمر سے چھری نکال کے) جناب امیر علیہ السلام کی قسم ابھی اپنے کلیجے میں ماروں گا. نہیں تو برائے خدا آپ چلے جائیے. آپ کا یہاں ٹھہرنا اچھا نہیں ہے.

اتنے میں لوگوں نے دیکھا خاں صاحب کے گولی کہاں لگی ہے. معلوم ہوا کہ جان کی خیریت ہے. بازو میں گولی لگی تھی.

شمشیر خاں: "میں عرض کرتا ہوں کہ حضور تشریف لے جائیں۔ اس مردود کا ہوا ہی کیا ہے۔ آپ کیوں بدنام ہوتے ہیں؟

بارے نواب صاحب بھی کچھ سمجھ کے اُٹھے۔ ایک آدمی ہمارے یہاں سے ساتھ کیا گیا۔ گھر تشریف لے گئے۔ خانم نے اسی وقت مرزا علی رضا بیگ کو بلوا بھیجا۔ وہ چوک ہی میں تھے فوراً چلے آئے۔ خانم نے علیحدہ لے جا کر نہیں معلوم کیا کان میں پھونکا۔ وہاں سے آئے تو یہ کہتے ہوئے۔

مرزا: "ہوگا پھینک دو مردود کو کمرے کے نیچے۔ سمجھ لیا جائیگا"

خیر خاں صاحب کو کمرے کے نیچے تو نہیں پھینکا۔ بازو پر پٹی باندھی گئی ڈولی بلوائی گئی۔ خاں صاحب کو بھی کسی قدر ہوش آ گیا تھا۔ مکان کا پتہ پوچھا معلوم ہوا مرغ خانے میں رہتے ہیں۔ ڈولی پر بٹھا کے ان کے گھر بھجوا دیا۔ کہاروں کو سمجھا دیا تھا کہ مکان کے قریب کہیں اتار کے چلے آنا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

سلطان صاحب کئی دن تک نہیں آئے۔ نہ ان کا آدمی آیا۔ مجھے دل سے محبت سی ہو گئی تھی یقین تھا کہ وہ اب نہیں آئیں گے۔ اور واقعی ایسا تھا بھی۔ وضعدار آدمی تھے۔ پہلے ہی جب وہ آئے تھے، آدمی کی زبانی بیشتر بہت تاکید تخلیئے کے لیے کر دی تھی۔ بوا حسینی نے اقرار کر لیا تھا کہ کوئی نہ آنے پائے گا۔ مگر اتنی چوک ہو گئی کہ دروازہ پر کسی کو نہ بٹھا دیا۔ خانصاحب از غیبی ڈھیلا خدا جانے کہاں سے آن پڑا۔ سارا کھیل بگڑ گیا۔ اتفاق سے پانچ چار دن کے بعد ایک برات میں میرا مجرا آ گیا تھا۔ وہاں سلطان صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ میرا پہلا مجرا نو بجے رات کو شروع ہوا تھا۔ محفل میں بات کرنا کیسا۔ اشارے کنائے کا بھی موقع نہ تھا۔ ایک لڑکا گورا گورا کوئی نو برس

کا سن بھاری کپڑے پہنے سلطان صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ کسی ضرورت سے اٹھا۔ مجرا ہو چکا تھا۔ علیحدہ کمرے میں پیشواز اتار رہی تھی۔ میں نے اسے اشارہ سے بلایا۔ پاس بٹھایا۔ ایک پان لگا کے دیا۔ پوچھا۔

میں: "سلطان صاحب کو جانتے ہو؟"

لڑکا: "کون سلطان صاحب؟"

میں: "وہ جو دولھا کے برابر تمہارے پاس بیٹھے تھے"

لڑکا: "(تیوری چڑھا کے) واہ وہ ہمارے بڑے بھائی ہیں۔ انہیں ذرا سلطان صاحب نہ کہنا"

میں۔ "اچھا تو ہم کچھ دیں انہیں دے دو گے؟"

لڑکا: "کہیں مجھ پر خفا نہ ہوں"

میں: "خفا نہیں ہوں گے"

لڑکا: "اور دو گی کیا پان؟"

میں: "پان نہیں۔ پان تو ان کے خاصدان میں ہوں گے۔ اے لو۔ یہ کاغذ دے دینا۔ ایک پرچہ کاغذ کا کمرے میں فرش پر پڑا تھا میں نے اس پر کوئلے سے یہ شعر لکھ دیا۔

مدتوں سے ہم ہیں محروم عتاب
بزم میں آج اُن کو چھیڑا چاہیئے

اور سمجھا دیا کہ یہ کاغذ اُن کی آنکھ بچا کے سامنے رکھ دینا۔ اُن کو معلوم بھی نہ ہوگا۔ لڑکے نے ویسا ہی کیا۔ میں کمرے کے پٹ کی آڑ سے جھانک رہی تھی۔ سلطان صاحب نے وہ کاغذ اٹھایا۔ پڑھا تو پہلے چہرے پر کچھ فکر کے آثار ظاہر ہوئے۔ پھر تھوڑی دیر تک پرچے کو غور سے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد مسکرا کے

جیب میں رکھ لیا۔

شمشیر خاں کو اشارے سے بلایا۔ اس کے کان میں چپکے سے کچھ کہا۔ کوئی گھنٹہ بھر کے بعد شمشیر خاں ہمارے پاس کمرے میں آیا۔

شمشیر خاں: "نواب صاحب نے کہا ہے کہ اس پرچہ کا جواب ہم گھر پر جاکر لکھ بھیجیں گے۔"

دوسرا مجرا صبح کو ہوا تھا۔ اس وقت سلطان صاحب محفل میں نہ تھے۔ ان کے بغیر مجھے محفل سونی معلوم ہوتی تھی۔ گانے میں دل نہ لگتا تھا۔ جوں توں مجرا ختم ہوا۔ میں گھر پر آئی۔ اس دن، دن بھر شمشیر خاں کا انتظار رہا۔ بارے چراغ جلنے کے بعد وہ آیا۔ نواب کا رقعہ دیا۔ مضمون یہ تھا۔

تمہارے شعر نے اس آگ کو جو میرے دل میں دبی ہوئی تھی کرید کر بھڑکا دیا۔ واقعی مجھے تم سے محبت ہے۔ مگر اپنی وضع سے مجبور ہوں۔ تمہارے مکان پر اب ہرگز نہ آؤں گا۔ میرے ایک بے تکلف دوست نواز گنج میں رہتے ہیں۔ کل میں تمہیں وہاں بلوا بھیجوں گا بشرط فرصت چلی آنا یہی ایک صورت ملنے کی ہے وہ بھی رات نو دس بجے تک۔

شب وصال کی کوتاہیوں کا شکوہ کیا
یہاں تو ایک نظر دیکھنے کے لالے ہیں

سلطان صاحب اس دن سے کبھی خانم کے مکان پر نہ آئے۔ ہفتہ میں دو تین مرتبہ نواز گنج میں نواب بنے صاحب کے مکان پر بلوا بھیجتے تھے عجب لطف کی صحبت رہتی تھی۔ کبھی شعر و سخن کا چرچا ہوا کبھی نواب بنے صاحب طبلہ بجانے لگے۔ میں گانے لگی۔ سلطان صاحب خود بھی گاتے تھے۔ نال سم سے تو کچھ ایسے واقف نہ تھے، مگر اپنی غزل آپ خوب گا لیتے تھے۔

کچھ اس طرح سے نظر بازیوں کی مشق بڑھی
میں اُن کو اور وہ میری نظر کو دیکھتے ہیں

جب یاد آتی ہے اس جلسہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے گرمیوں کے دن، شب مہتاب کا عالم، صحن باغ میں تخنوں کے چوکے پر سفید چاندنی کا فرش ہے۔ گاؤ تکیئے لگے ہوئے، بیلے چمبیلی کی مہک سے دماغ معطر، خوشبودار گلوریاں، بسے ہوئے حقے، تخلیئے کا جلسہ، آپس کی چہلیں، بے تکلفی کی باتیں۔ ایسے ہی جلسوں میں بیٹھ کر دنیا و مافیہا کا تو ذکر کیا، انسان خدا کو بھی بھول جاتا ہے۔ اور اسی کی سزا ہے کہ ایسے جلسہ بہت ہی جلد برہم ہو جاتے ہیں۔ اور ان کا افسوس مرتے دم تک رہتا ہے۔ بلکہ شاید مرنے کے بعد بھی۔

لذت معصیت عشق نہ پوچھ
خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی

واقعی سلطان صاحب کو مجھ سے اور مجھے اُن سے محبت تھی دونوں کے مذاق کچھ ایسے ملتے ہوئے تھے کہ اگر عمر بھر کا ساتھ ہوتا تو کبھی ملال نہ ہوتا۔ سلطان صاحب کو شعر و سخن کا شوق تھا۔ اور مجھے بھی بچپن سے اس کی لت ہے۔ سلطان صاحب سے جیسا میرا دل ملا اور کسی سے نہیں ملا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی اسی سبب سے محبت کرتے تھے۔ بات بات میں شعر پڑھتے تھے۔ میں جواب دیتی تھی۔ مگر افسوس فلک تفرقہ انداز نے وہ جلسہ بہت ہی جلد برہم کر دیا۔

دل یہ کہتا ہے فراق ماہ و انجم دیکھ کر
ہائے کیا کیا صحبتیں راتوں کی برہم ہو گئیں

رسوا: "اچھا وہ سب کچھ تو ہوا آپ کے قدم کی برکت سے ایسے ایسے بہت سے جلسے برہم ہو گئے ہوں گے۔"

امراؤ: "واہ مرزا صاحب! تو کیا میرے دشمن بہن بہرے ہیں؟ یہ آپ نے خوب کہی۔"

رسوا: "یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔ مگر سلامتی سے جہاں آپ تشریف لے گئیں صفائی ہو گئی۔"

امراؤ: "آپ جو چاہے کہئے۔ اگر ایسا جانتی کہ آپ یہ کہیں گے تو اپنی روداد ہرگز نہ بیان کرتی۔ خیر! اب قصور ہوا۔"

رسوا: "قصور! یہی تو آپ نے زندگی بھر میں ایک کام کیا ہے۔ جس سے آپ کا نام دنیا میں رہ جائے گا، خواہ نیک نامی کے ساتھ خواہ بدنامی کے ساتھ۔ اس کا میں ذمہ نہیں کرتا۔ اب اس بات کو یہیں تک رہنے دیجئے۔ ذرا اس غزل کے دو تین شعر اور یاد ہوں تو پڑھ دیجئے۔"

امراؤ: "آپ بھی آدمی کو خوب بناتے ہیں۔"

رسوا: "خیر! بگاڑتا نہیں۔ اچھا اب شعر پڑھئے۔"

امراؤ: "اچھا سنئے۔ ایک مطلع اور دو شعر اور یاد ہیں۔"

دردِ دل کی لذتیں صرفِ تبِ غم ہو گئیں
طولِ فرقت سے بہت جتنا بیاں کم ہو گئیں

وہ جو بیٹھے سوگ میں زلفِ رسا کھولے ہوئے
حسرتیں میری شریکِ بزمِ ماتم ہو گئیں

ہمنشیں دیکھی نحوست داستانِ ہجر کی
صحبتیں جمنے نہ پائی تھیں کہ برہم ہوگئیں

(۸)

اسی زمانہ میں نواب جعفر علی خاں صاحب کی ملازم ہوئی۔ سن شریف کوئی ستر برس کے قریب تھا۔ منہ میں ایک دانت نہ تھا۔ پشت خم ہوگئی تھی۔ سر میں ایک بال سیاہ نہ تھا۔ مگر اب تک اپنے کو پیار کرنے کے لائق سمجھتے تھے۔ ہائے وہ اُن کا کیچلی کا انگرکھا اور گلبدن کا پائجامہ لال نیفہ، مسالحہ دار ٹوپی۔ کا کلیں بٹی ہوئی عمر بھر نہ بھولیں گے۔

آپ کہئیے گا اس عمر اور ایسی حالت میں رنڈی نوکر رکھنا کیا ضرور تھا؟ سنئیے! مرزا صاحب! اس زمانہ کا فیشن یہی تھا۔ کوئی امیر، رئیس ایسا بھی ہوگا جس کے پاس رنڈی نہ ہو۔ نواب صاحب کی سرکار میں جہاں اور سامان شان و شوکت کے تھے، وہاں سلامتی منانے کے لیے جلوسیوں میں ایک رنڈی کا بھی اسم۔ بچھتر روپے ماہوار ملتے تھے۔ دو گھنٹہ کے لیے مصاحبت کر کے چلی آتی تھی۔ اور تکلف سنئیے۔ نواب بوڑھے ہو گئے تھے مگر کیا مجال نو بجے کے بعد دیوان خانے میں بیٹھ سکیں۔ اگر کسی دن اتفاق سے دیر ہوگئی۔ کھلائی آکے زبردستی اٹھالے گئی رہتی۔ نواب کی والدہ زندہ تھیں۔ ان سے اچھی طرح ڈرتے تھے۔ جس طرح پانچ برس کا بچہ ڈرتا ہے۔ بیوی سے بھی انتہا کی محبت تھی۔ بچپن میں شادی ہوئی تھی مگر سوائے عشرہ محرم اور شبوں کے کسی دن علیحدہ سونے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔

آپ تو ہنستے ہوں گے مگر میرے دل سے پوچھئے۔ بے شک پیار کرنے کے قابل تھے۔ اس بڑھاپے میں جس وقت سوز پڑھتے تھے

دل لوٹ جاتا تھا۔"

فن موسیقی میں ان کو کمال تھا۔ کیا مجال کوئی ان کے سامنے گا سکے اچھے اچھے گویوں کو ٹوک دیا۔ سوز خوانی میں یکتا تھے۔ سندی سوز میر علی صاحب کے ان کو بہو بچے ہوئے تھے۔ ان کی ملازمت سے مجھے یہ فائدہ ہوا کہ سینکڑوں سوز یاد ہو گئے۔ دور دور میری شہرت ہو گئی۔

ماتم کی تعزیہ داری تمام شہر کی رنڈیوں سے بڑھ چڑھ کے تھی۔ امام باڑہ میں ٹھکے، شیشہ آلات، جو شے تھی نادر تھی۔ عشرۂ محرم میں دس روز تک مجلس ہوتی تھی۔ عاشورے کے دن سینکڑوں محتاج مومنین کی فاقہ شکنی کی جاتی تھی پھر چہلم تک ہر جمعرات کو مجلس ہوتی تھی۔

میری سوز خوانی مشہور تھی۔ ایسی ترکیبیں اور کسی کو کب یاد تھیں بڑے بڑے سوز خوان میرے سامنے منہ نہ کھول سکتے تھے۔ اسی سوز خوانی کی بدولت نواب ملکہ کشور کے محل تک میری رسائی ہوئی۔ جہاں پناہ نے خود میری نوحہ خوانی کی تعریف کی۔ سرکار شاہی سے مجھ کو بہت کچھ ہر محرم میں عطا ہوتا تھا۔

مرثیہ خوانوں میں میرا اسم تھا۔ شب کو امام باڑہ میں ماتم کر کے مجھے درِ دولت پر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ کبھی دو بجے رات کو وہاں سے آتی تھی۔

جس زمانہ میں بسم اللہ کی مسی ہوئی تھی، نواب چھبن صاحب کے چچا کربلائے معلیٰ گئے ہوئے تھے۔ بسم اللہ کی مسی کو کوئی چھ مہینے گزرے ہوں گے کہ وہ کربلا سے تشریف لائے۔ ان کی لڑکی کی نواب کے ساتھ منگنی ہو گئی تھی۔ انہوں نے آتے کے ساتھ ہی شادی پر زور دیا۔ نواب

صاحب بسم اللہ جان پر مرتے تھے۔ ادھر بسم اللہ جان نے گھر میں بیٹھ جانے کا نقرہ دے رکھا تھا صاف انکار کر دیا، مگر انکار چلتا کب تھا، شاہی زمانہ ان کی لڑکی پر گائی چڑھ چکی تھی۔ وہ کب ماننے تھے۔ ایک شب کو نواب کے مکان پر جلسہ ہے۔ مصاحبین جمع ہیں۔ بسم اللہ نواب کے پہلو میں بیٹھی ہے اس رات کو بسم اللہ کے ساتھ میں بھی چلی گئی تھی۔ سامنے بیٹھی ہوئی گا رہی ہوں نواب صاحب طنبورہ چھیڑ رہے ہیں نواب کے ایک مصاحب خاص دلبر حسین طبلہ بجا رہے ہیں۔ اتنے میں ایک خبر دار نے خبر دی کہ بڑے نواب صاحب (نواب صاحب کے چچا) تشریف لاتے ہیں۔ نواب صاحب یہ سمجھے کہ آئے ہیں تو اندر محل میں بیگم صاحب (نواب صاحب کی والدہ) کے پاس جائیں گے ہم سب کو بھی یہی خیال تھا مگر وہ درانہ دیوان خانے میں گھسے چلے آئے آکے جو دیکھا تو یہ جلسہ ہے۔ آگ بگولہ ہو گئے۔ خیر ان کے آنے کے ساتھ ہی گانا تو موقوف ہوا۔ نواب صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔

بڑے نواب صاحب "خیر اب تعظیم و تکریم کو رہنے دیجئے۔ مجھے ایک امر ضروری عرض کرنا ہے۔ ورنہ آپ کے عیش میں خلل انداز نہ ہوتا۔"

نواب "ارشاد"

بڑے نواب "آپ بچے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں میرے چھوٹے بھائی نواب احمد علی خاں مرحوم نے والدہ مرحومہ کے سامنے انتقال کیا تھا اس وجہ سے آپ محجوب الارث ہیں۔ کوئی حق آپ کا اس جائداد میں نہیں ہے جس پر آپ قابض اور متصرف ہیں۔ بے شک والدہ مرحومہ نے آپ کو بیٹا کیا تھا۔ اور مرتے وقت آپ کے نام وصیت بھی کر گئی ہیں۔ مگر وہ کوئی

بڑے نواب:" یہ میں کیا جانوں۔ یہ اپنے مصاحبین اور ملازمین اور معشوقہ سے دریافت کیجئے"

نواب:" اچھا تو میرے کپڑے، اسباب وغیرہ تو دے دیجئے۔"

بڑے نواب:" اس مکان میں آپ کا کوئی اسباب نہیں ہے، نہ آپ کے ذاتی بنوائے ہوئے کپڑے ہیں۔"

اس کے بعد منصف الدولہ کے آدمی دیوان خانے میں چلے آئے۔ نواب صاحب کو مع مصاحبین و ارباب نشاط گھر سے باہر کیا۔

ہم لوگوں نے گھر سے نکلتے ہی ڈولیاں کرایہ پر کیں چوک کا راستہ لیا مصاحبین اور نواب صاحب خدا جانے کہاں گئے۔

سنا ہے کہ مصاحبین ایک ایک کر کے راستہ ہی سے رخصت ہو گئے۔ نواب کے والد کا ایک قدیم ملازم مخدوم بخش جس کو نواب صاحب نے بے کار سمجھ کر نوکری سے برطرف کر دیا تھا۔ راستہ میں ملا۔ اس نے حال دریافت کیا۔ ان کی بے کسی پر ترس کھا کے اپنے گھر لے آیا۔

نواب صاحب کے گھر سے آنے کے بعد شب کو بسم اللہ کے کمرے میں جلسہ ہے۔ میاں حسنو نواب صاحب کے خاص کار رکن، مصاحب، دوست، جہاں نثار، جہاں نواب کا پسینہ گرے وہاں اپنا خون گرانے والے تشریف رکھتے ہیں۔ آج ہی کچھ نہیں آئے ہیں پہلے بھی نواب کے چوری چھپے آیا کرتے تھے۔ مگر آج کھلے خزانے بڑے ٹھاٹھ سے بیٹھے ہیں۔ اس وقت بسم اللہ جان پر گویا بے شرکت واحدے و

چیز نہیں۔ صرف ایک ثلث جائیداد بنا بر اس وصیت نامہ کے آپ کو مل سکتی ہے۔ لوگوں کے کہنے سننے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ایک ثلث سے زیادہ صرف کر چکے ہیں۔ خیر ثلث کا مجھ کو دعویٰ نہیں۔ اور زیادہ کی آپ سے باز پرس نہ کیجائے گی، اس لیے کہ آپ میرے خون و جگر ہیں (اس کے بعد بڑے نواب صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ مگر پھر ضبط کر کے) آپ اس جائیداد پر مدت العمر قابض و متصرف رہتے۔ میری ذاتی جائیداد میرے خرچ کے لیے کفالت کرتی ہے اور اس جائداد کے بھی آپ ہی وارث ہوتے۔ مگر آپ کی بدوضعی نے مجھے مجبور کیا کہ آپ کو اس جائداد موروثی سے بے دخل کر دوں۔ بزرگوں کی نیک کمائی حرام کاری میں مٹانے کے لیے نہیں ہے منصف الدولہ کے آدمی میرے ہمراہ ہیں۔ اس وقت تمام گھر کا انخلاء ہو گا۔ آپ فوراً مع ارباب نشاط یہاں سے تشریف لے جائیے۔"

نواب "تو اس جائداد میں میرا کوئی حق نہیں"؟

بڑے نواب "جی نہیں۔

نواب "اچھا ایک ثلث پانے کا مستحق ہوں۔

بڑے نواب "وہ آپ لے چکے۔ اور اگر آپ کو کچھ دعویٰ ہے تو درِ دولت پر تشریف لے چلئے۔ میرے نزدیک آپ کا ایک حبہ نہیں"۔

نواب "تو اچھا اماں جان کو میں اپنے ساتھ لیتا جاؤں گا"۔

بڑے نواب "وہ آپ سے دستبردار ہوتی ہیں۔ وہ میرے ساتھ کربلا جائیں گی۔

نواب "تو اچھا میں کہاں جاؤں؟

بے مزا، جتنے غیرے قابض و متصرف ہیں۔ نوکری کی گفتگو ہو رہی ہے۔

حسنو: "دیکھو بسم اللہ جان نواب سے نواب کوئی امید نہ رکھو۔ میں جو کچھ کہو وہ دے دیا کروں۔" غریب آدمی ہوں زیادہ تو میری اوقات نہیں۔ جو نواب صاحب دیتے تھے اس کا نصف بھی ممکن نہیں۔ مگر ہاں کسی نہ کسی طرح آپ کو خوش ضرور رکھوں گا۔"

بسم اللہ: "غریب آدمی ہو، یہ نہیں کہتے کہ نواب کی دولت کاٹ کے گھر میں بھر لی اور پھر ہم سے غریبی بیان ہوتی ہے۔ ایسے غریبوں کو تاؤ تو لو من چربی سے کم نہ نکلے۔"

حسنو: "ہیں ہیں! تم تو ایسا نہ کہو، وہ نواب کے پاس تھا ہی کیا جو میں گھر بھر لیتا۔ کیا میری والدہ صاحبہ کے پاس کچھ کم تھا۔"

بسم اللہ: "آپ کی والدہ صاحبہ بوا فرخندہ نواب سرفراز محل کی خاصہ والیوں میں تھیں نہ؟"

میر حسنو (جھینپ کر) وہ جو کوئی ہوں۔ جب مری ہیں تو کوئی چار ہزار کا زیور چھوڑ کے مری ہیں۔"

بسم اللہ: "وہ آپ کی بیوی لے یار کے ساتھ نکل گئیں۔ آپ کے پلے کیا پڑا۔ میرے آگے ذرا شیخی نہ بگھاریئے۔ مجھے رتی رتی آپ کا حال معلوم ہے۔"

حسنو: "تو کیا والد کے پاس کچھ کم تھا؟"

بسم اللہ: "والد آپ کے نواب حسن علی خاں کے چڑی ماروں میں تھے۔"

حسنو: "چڑی ماروں میں؟"

بسم اللہ: "اچھا وہ مرغ بازوں میں سہی۔"

حسنو: "مرغ بازوں میں تھے؟"

بسم اللہ: "اچھا وہ بٹیر باز سہی۔ تھا تو چڑی مار کا کام۔"

حسنو: "لیجئے آپ تو مذاق کرتی ہیں۔"

بسم اللہ: "میں کھری کہتی ہوں۔ اسی سے بڑی مشہور ہوں، اور کہتی بھی نہ تمہارے چھچھورے پن پر جی جل گیا۔ یوں تو تم آنے تھے میں نے کبھی منع نہیں کیا۔ آج ہی تو نواب پر یہ واردات گزری۔ آج ہی آپ نے میرے منہ در منہ نوکری کا پیغام دیا۔ ہوش کی دوا کرو۔ تم کیا نوکر رکھو گے، یہی نہ ایک مہینہ دو مہینے، تین مہینے سہی۔"

حسنو: "چھ مہینے کی تنخواہ جمع کر دوں؟"

بسم اللہ: "زبان سے۔"

حسنو: "یہ لو (سونے کے جڑاؤ کڑے کمر سے نکال کے) تمہارے نزدیک کتنے کا مال ہوگا؟"

بسم اللہ: "میں دیکھوں۔ (سونے کے کڑے حسنو کے ہاتھ سے لے کے اپنے ہاتھوں میں پہن لیے) کل چھنا مل کے لڑکے کو دکھاؤں گی۔ مگر بنے اچھے ہیں۔ اچھا آپ تشریف لے جائیے۔ اس وقت تو مجھے چھٹن باجی نے بلا بھیجا ہے ٹھہر نہیں سکتی۔ کل اسی وقت آئیے گا۔"

حسنو: "تو کڑے اتار دیجئے۔"

بسم اللہ: "یا اللہ! کوئی چوروں سے بیوپار ہے۔ میں تمہارے کڑے کچھ کھا نہ لوں گی۔ اس وقت میرے ہاتھ میں سادی پڑی ہوئی ہیں، اماں جان سے چھپ کے جاتی ہوں۔ ان سے کڑے مانگوں گی تو کہیں گی کیا کرو گی۔

اس بیسے ذرا ہاتھ میں ڈال لیے صبح لے جانا۔"

حسنو۔" کڑے دے دیجئے۔ میرے نہیں ہیں۔ نہیں تو کیا بات تھی۔ تم پر سے صدقے کیے تھے۔"

بسم اللہ۔ تو کیا آپ کی اماں کے ہیں۔ انہوں نے انتقال کیا، پھر بھی آپ کا مال نہیں۔"

حسنو۔" میں نے یوں ہی تمہیں دکھائے تھے۔ میرا مال نہیں ہے۔"

بسم اللہ۔" جیسے میں پہچانتی نہیں۔ یہ وہی کڑے ہیں۔ جو نواب نے اُس دن میرے سامنے گروی کو دیئے تھے۔

حسنو۔" لو اور سنو۔ یہ کب؟"

بسم اللہ۔" یہ جب کہ جس دن بہن امراؤ کے مجرے کی فرمائش ہوئی تھی۔ بہن امراؤ نے ضد کی کہ میں پورے سنو لوں گی۔ نواب کے پاس خرچ نہ تھا، میرے سامنے صندوقچہ سے نکال کے کڑے پھینک دیئے تھے (پھر میری طرف مخاطب ہو کے دیکھا) بہن امراؤ یہ وہی کڑے ہیں نہ؟"

میں۔" مجھ سے کیا پوچھتی ہو۔ کیا تم جھوٹ کہو گی۔"

بسم اللہ۔" لے خسکا کھائیے۔ اب یہ کڑے آپ کو نہ دیے جائینگے۔ نواب کے کڑے ہیں یہ ہم نے پہچانے اب ہم نہ دیں گے۔"

حسنو۔" لو اچھی کہی۔ اور وہ روپے جو ہم نے دیئے ہیں؟"

بسم اللہ۔" روپے تم کہاں سے لائے وہ بھی نواب کا مال تھا۔"

حسنو۔ جی سچ۔ مہاجن سے بیاز (سودی) نہ لا کے دیئے

تھے۔"

بسم اللہ: "اچھا تو مہاجن کو بھیج دیجئے۔ ہم اس کو روپے دے دیں گے۔ آپ ٹہلئے۔"

حسنو: "کڑے تو میں لے جاؤں گا۔"

بسم اللہ: "میں تو نہ دوں گی۔"

حسنو: "تو کچھ زبردستی ہے؟"

بسم اللہ: "جی ہاں زبردستی ہے۔ لے اب چپکے سے کھسک جایئے نہیں تو ......"

حسنو: "اچھا تو رہنے دیجئے۔ کل ہی دے دیجئے گا۔"

بسم اللہ: "کل دیکھا جائے گا۔"

"دیکھا جائے گا"۔ بسم اللہ نے اس تیور سے کہا کہ میاں حسنو کو چپکے سے اٹھ کے چلے جانا ہی پڑا۔

بات یہ تھی کہ نواب صاحب کے چچا چھبن صاحب کے نوکروں سے خساب فہمی کی ہے اس وقت جس قدر اسباب جس کی معرفت تھا اس کو سود در اصل کے روپے دے کے چھڑا لیا۔ حسنو سے جب اس کڑے کی جوڑی کے لیے باز پرس ہوئی تو صاف مکر گیا کہ میری معرفت گروی نہیں ہوتے۔

اسی سے میاں حسنو کی کور دبی تھی۔"

بسم اللہ (حسنو کے چلے جانے کے بعد مجھ سے) دیکھا بہن۔ یہ بڑا فابو چلا ہے نواب کا گھر اسی موذی نے تہس نہس کیا۔ میں مدت سے اس موے کی تاک میں تھی۔ آج ہی تو داؤں پر چڑھا ہے۔ یہ کڑے میں اس کو کب دینے ہوں۔ کر ہی کیا سکتا ہے چوری کا تو مال ہے۔

"میں ہرگز نہ دینا۔ دینا ہے تو نواب کو دے دو احسان ہوگا۔

بسم اللہ " نواب کو بھی نہ دوں گی۔ بہن گیارہ سو کی جوڑی ہے ہوتے نے سوا دو سو روپے پر ہتھیائی تھی۔ زیادہ بریں نیست۔ سوا دو سو حوالے کروں گی۔ دس بیس سود کے سہی"۔

میں " بھلا مہاجن یوں کیوں دینے لگا۔

بسم اللہ۔ مہاجن! اسی نے روپے دیئے تھے اور جب بڑے نواب نے پوچھا تو کیسا مکر گیا۔ اگر یہ کچھ زیادہ ٹرپھس کریں گے تو ان کو کوتوالی کا چبوترہ دکھاؤں گی۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ نواب صاحب تشریف لائے۔ پا پیادہ اکیلے۔ چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے، نہ وہ شان نہ وہ شوکت، نہ وہ رعب و داب، نہ وہ بے تکلفی۔ چپکے سے آکے بیٹھ رہے۔

سچ کہوں میری تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مگر میں نے اپنے کو روکا مگر واہ ری بسم اللہ رنڈی ہو تو ایسی ہو آتے کے ساتھ ہی گڑوں کا قصہ چھیڑ دیا۔

بسم اللہ: نواب دیکھو یہ وہی کڑے کی جوڑی ہے نا جو تم نے اس دن حسنو کو گروی کرنے کو دی تھی"۔

نواب " وہی ہیں۔ وہ تو نگر گیا تھا کہ میرے ہاتھوں گروی نہیں ہوتے۔

بسم اللہ " کتنے پر گروی ہوئے تھے؟

نواب " یہ تو کچھ یاد نہیں۔ شاید ڈھائی سو۔ یا سوا دو سو کچھ ایسے

ہی نکھے؟

بسم اللہ: ”اور سود کیا تھا؟“

نواب: ”سود کا حساب کس نے آج تک کیا۔ جو چیز گروی ہوتی پھر اس کے چھڑانے کی نوبت کبھی نہیں آئی جو سود کا حساب کیا جاتا۔“

بسم اللہ۔ اچھا تو یہ کڑے میں لے لوں؟

نواب: ”لے لو۔“

بسم اللہ: ”کہو تو میاں حسنو کو مرزا صاحب کے پاس بھیجوں؟“

نواب: ”نہیں میرے سر کی قسم ایسا نہ کرنا۔“ ”بید“ ہے۔

بسم اللہ: ”بید ہے؟۔ اس کے باپ کا تو پتہ نہیں۔“

نواب: ”خیر وہ تو اپنے منہ سے کہتا ہے۔“

میں اپنے دل میں نواب کی ہمت کی آفریں کرنے لگی۔ واہ ری ہمت کیا کہنا۔ خاندانی رئیس ہیں منہ:

بسم اللہ کی بے مروتی دیکھئے۔ نواب سے وہی چھٹن جان کے گھر جانے کا بہانہ کر کے اُن کو سویرے سے رخصت کر دیا۔ خدا جانے کس سے وعدہ تھا اس واقعے کے دوسرے تیسرے دن کا ذکر ہے۔ میں خانم کے پاس بیٹھی ہوں اتنے میں ایک بوڑھی سی عورت آئی۔ خانم صاحب کو جھک کے سلام کیا خانم نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے بیٹھ گئی۔

خانم: ”کہاں سے آئی ہو؟“

بڑھیا: ”کیا بتاؤں کہاں سے آتی ہوں۔ کوئی ہے تو نہیں کہوں؟“

خانم: ”بوا یہاں کون ہے؟ میں ہوں تم ہو اور یہ چھوکری۔ اس کو بات سمجھنے کی تمیز نہیں۔ کہو۔“

بڑھیا: "مجھے نواب فخر النسا بیگم نے بھیجا ہے۔"

خانم: "کون فخر النسا بیگم صاحبہ؟"

بڑھیا: "اے تو تم نہیں جانتیں، نواب چھبن صاحب ......"

خانم: "سمجھی کہو!"

بڑھیا: "بیگم صاحب نے مجھے بھیجا ہے۔ آپ بسم اللہ جان کی اماں ہیں نا؟"

خانم: "ہاں بات کہو!"

بڑھیا: "بیگم صاحب نے کہا ہے کہ "چھبن صاحب میرا اکلوتا لڑکا ہے۔ میں بھی اس پر پروانہ ہوں اور اس کا باپ بھی پروانہ تھا میرے نازوں کا پالا ہے اور اس کا چچا بھی دشمن نہیں ہے۔ اپنی اولاد سے بڑھ کر سمجھتا ہے۔ اس کی بھی ایک اکلوتی لڑکی ہے۔ چھبن کی منگیتر۔ لڑکی پرگالی چڑھ چکی ہے۔ چھبن نے شادی سے انکار کر دیا ہے۔ اسی پر چچا کو برا معلوم ہوا۔ میں نے دخل نہیں دیا۔ سب تنبیہ کے لیے کیا گیا ہے۔ تمہاری لڑکی کا عمر بھر کا گھر ہے جو تنخواہ لڑکا دیتا تھا اس سے دس اوپر مجھ سے لینا۔ مگر اتنا احسان مجھ پر کرو کہ شادی پر راضی کر دو۔ شادی کے بعد جائداد اسی کی ہے۔ سوا اس کے اور کون ہے۔ میری اور چچا کی جان و مال کا مالک ہے۔ مگر اتنا خیال رکھو کہ یہ گھر تباہ نہ ہونے پائے۔ اس میں ہمارا بھی بھلا ہے اور تمہارا بھی۔ آئندہ تم کو اختیار ہے۔"

خانم: "بیگم صاحبہ کو میری طرف سے آداب تسلیمات کہنا۔ اور عرض کرنا کہ جو کچھ آپ نے ارشاد فرمایا ہے خدا چاہے تو وہی ہوگا۔ میں آپ کی عمر بھر کی لونڈی ہوں۔ مجھ سے کوئی امر خلاف نہ ہوگا۔ خاطر جمع رکھیے۔"

بڑھیا: "مگر بیگم صاحب نے کہا ہے کہ چھبن کو اس کی خبر نہ ہونے پائے

بڑا ضدی لڑکا ہے۔ اگر کہیں معلوم ہو گیا تو ہرگز نہ مانے گا۔"

خانم: (ماما سے) کیا مجال (مجھ سے) دیکھو چھوکری کہیں کسی سے یہ قصہ نہ لے بیٹھنا۔"

میں: جی نہیں۔"

اس کے بعد بڑھیا نے علیحدہ لے جا کے خانم سے چپکے چپکے باتیں کیں، وہ میں نے نہیں سنیں۔ ماما کے رخصت کے وقت خانم کو اتنا کہتے سنا۔"

خانم: میری طرف سے عرض کرنا اس کی کیا ضرورت تھی۔ ہم لوگ تو ندیمی نمک خوار ہیں۔"

بڑھیا کے چلے جانے کے بعد خانم نے بسم اللہ کو بلا بھیجا۔ اور کچھ ایسے منتر کان میں پھونک دیئے کہ اب جو نواب صاحب آئے تو وہ آؤ بھگت ہوتی کہ ملازمت کے زمانے میں بھی کبھی نہ ہوئی تھی۔

نواب صاحب بیٹھے ہیں۔ بسم اللہ سے اختلاط کی باتیں ہو رہی ہیں۔ میں بھی موجود ہوں کہ اتنے میں خانم صاحب بسم اللہ کے کمرے کے دروازے پر آ کے کھڑی ہوئیں۔

خانم: اے لوگو! ہم بھی آ دیں؟"

بسم اللہ: (نواب سے) ذرا سرک بیٹھو اماں آتی ہیں۔ (خانم سے) آیئے۔"

خانم نے سامنے آتے ہی نواب کو تین تسلیمیں کیں۔ میں نے آج کے دن کے سوا خانم کو اس طرح مؤدب ہو کر سلام کرتے نہ دیکھا تھا۔

خانم۔ (حضور کا) حضور کا مزاج کیسا ہے؟"

نواب: (گردن جھکا کے) الحمد للہ۔"

خانم: "خدا خوش رکھے، ہم لوگ تو دعا گو ہیں۔ ہزار بڑھ جائیں، مگر پھر بھی وہی ٹکے کی مال زادی۔ آپ کے ہاتھ کی دیکھنے والے۔

آپ کو خدا نے رئیس کیا ہے، اس وقت ایک عرض لے کے حاضر ہوئی ہوں۔ یوں تو بسم اللہ خدا رکھے سال بھر سے آپ کی خدمت میں ہے۔ مگر میں نے کبھی آپ کو تکلیف نہیں دی، بلکہ حضور کے سلام کو بہت کم حاضر ہونے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ اس وقت ایسی ہی ضرورت تھی جو چلی آئی۔"

خانم تو یہ باتیں کر رہی ہیں، بسم اللہ ان کا منہ دیکھ رہی ہیں کہ کیا کہہ رہی ہیں میں کسی قدر بات کا پہلو سمجھتے ہوئے تھی۔ نواب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نواب کا یہ حال ہے کہ چہرے سے ایک رنگ جاتا ہے، اور ایک آتا ہے۔ آنکھیں جھپکی جاتی ہیں مگر چپکے بیٹھے ہیں۔

خانم: "تو پھر عرض کر دوں؟"

نواب (بہت ہی مشکل سے) کہیئے۔"

خانم: (مجھ سے) ذرا بوا حسینی کو بلا لینا!"

میں گئی۔ اور بوا حسینی کو بلا لائی۔

خانم: (بوا حسینی سے) بوا ذرا دوشالے کی جوڑی تو اٹھا لانا۔ وہی جو کل بکنے کو آگئی ہے۔"

'بکنے کو گئی ہے'، ان لفظوں نے نواب پر وہی اثر کیا۔ جیسے کسی پر دفعتاً بجلی گرے۔ مگر بہت ضبط کر کے چپکے بیٹھے رہے۔ اتنے میں بوا حسینی دوشالہ لے آئیں۔ کیا پر متن زر کا دوشالہ کہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔"

خانم۔ (نواب کو دوشالہ دکھا کے) دیکھئے یہ دوشالہ کل بکنے آیا ہے۔ سوداگر دو ہزار کہتا ہے۔ پندرہ سو تک لوگوں نے لگا دیئے

ہیں وہ نہیں دیتا۔ میری نگاہ میں ستر ہ بلکہ اٹھارہ سونگ مہنگا نہیں ہے۔ اگر حضور پرورش کریں تو بھلا اس بڑھاپے میں آپ کی بدولت ایک دوشالہ تو اور اوڑھ لوں۔

نواب خاموش بیٹھے رہے۔ بسم اللہ کچھ بولا ہی چاہتی تھیں کہ خانم نے نواب سے کہا۔

خانم :" ٹھہر لڑکی تو ہمارے بیچ میں نہ بول۔ تو تو آئے دن فرمائش کیا کرتی ہے۔ ایک فرمائش ہماری بھی سہی۔"

نواب :" پھر چپکے بیٹھے رہے۔"

خانم :" اوئی نواب ! ستی سے سوم بھلا۔ جو جلدی دے جواب۔ کچھ تو ارشاد کیجئے۔ سکوت سے تو بندی کو تسکین نہ ہوگی۔ ہاں نہ سہی نہیں سہی۔ کچھ تو کہہ دیجئے۔ میرے دل کا ارمان تو نکل جائے۔"

نواب اب بھی چپ ہیں۔

خانم :" اللہ حضور ! جواب دیجئے۔ یوں تو میری حقیقت ہی کیا ہے۔ موئی بازاری کسبی۔ مگر آپ ہی لوگوں کی عزت دی ہوئی ہے۔ برائے خدا ان چھوکریوں کے سامنے تو مجھ بڑھیا کو ذلیل نہ کیجئے۔"

" نواب (آبدیدہ ہو کر) خانم صاحب ! اس دوشالے کی کوئی اصل نہیں۔ مگر تم کو شاید میرا حال معلوم نہیں۔ کیا بسم اللہ جان نے کچھ نہیں کہا اور امراؤ جان بھی تو اس دن تھیں۔"

خانم :" مجھ سے کسی نے بھی کچھ نہیں کہا۔ کیوں ؟ خیر تو ہے ؟"

بسم اللہ پھر کچھ بولنے کو تھیں کہ خانم نے آنکھ کا اشارہ کیا۔ وہ چپ رہیں۔ ٹال کے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ میں پہلے ہی سے بت بنی

بیٹھی تھی۔

نواب "اب ہم اس قابل نہیں رہے جو آپ کی فرمائشوں کو پورا کر سکیں"

خانم: "آپ کے دشمن اس قابل نہ رہے ہوں۔ اور میں ایسی چھوری نہیں جو روز فرمائشیں کیا کروں۔ فرمائشیں کریں نہ کریں بسم اللہ کریں۔ بھلا میں بوڑھی آڑھی میری فرمائشیں کیا اور میں کیا۔"

یہ کہہ کے خانم نے ایک آہ سرد بھری "ہائے تقدیر اب ہم اس لائق ہو گئے کہ ایسے ایسے رئیس ایک ذرا سے جھگڑے کے لیے ہم سے منہ چھپاتے ہیں۔"

میں دیکھ رہی تھی کہ خانم کا ایک ایک فقرہ نواب کے دل پر نشتر کا کام دے رہا تھا۔

نواب: "خانم صاحب آپ سب لائق ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں اب میں اس لائق نہیں رہا۔ جو کسی کی فرمائش پوری کروں۔"

اس کے بعد نواب نے اپنی تباہی کا مختصر حال کہا۔

خانم: "خیر میاں! اس لائق تو آپ نہیں رہے کہ ایک ادنیٰ سی فرمائش پوری کریں۔ پھر تو لونڈی کے مکان پر آنا کیا فرض تھا۔ حضور کو نہیں معلوم کہ بیسوائیں چار پیسے کی میت ہوتی ہے۔ کیا آپ نے یہ مثل نہیں سنی کہ رنڈی کس کی جورو؟ ہم لوگ مروت کریں تو کھائیں کیا یوں آیئے، آپ کا گھر ہے۔ میں منع نہیں کرتی۔ مگر آپ کو اپنی عزت کا خود ہی خیال چاہیئے۔"

یہ کہہ کے خانم فوراً کمرہ سے چلی گئیں۔

نواب: "واقعی مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔ اب انشاء اللہ نہ آؤں گا

یہ کہہ کے وہ اٹھنے کو تھے کہ بسم اللہ نے دامن پکڑ لیا۔

بسم اللہ: "اچھا تو اس کڑے کی جوڑی کے بارے میں کیا کہتے ہو؟"

نواب: "(کسی قدر ترش ہو کے) میں نہیں جانتا۔"

بسم اللہ: "اے واہ تم تو بالکل ہی خفا ہو گئے۔ جانے کہاں ہو ٹھہرو۔"

نواب: "نہیں بسم اللہ جان اب مجھ کو جانے دو۔ اب میرا آنا بیکار ہے۔ جب خدا ہمارے دن پھیرے گا تو دیکھا جائے گا۔ اور اب کیا دن پھر ہی گئے۔"

بسم اللہ: "میں نہ جانے دوں گی۔"

نواب: "تو کیا اپنی اماں سے جوتیاں کھلواؤ گی؟"

بسم اللہ (مجھ سے) ہاں سچ تو ہے بہن امراؤ۔ آج یہ بڑی بی کو ہو کیا تھا۔ برسوں ہو گئے میرے کمرے میں آج تک جھانکی نہیں۔ آج آئیں بھی تو قیامت برپا کر گئیں۔ بھئی اماں چاہے خفا ہو جائیں چاہے خوش ہوں میں نواب سے رسم ترک نہیں کر سکتی۔ آج نہیں ہے ان کے پاس نہ سہی۔ ایسی بھی کیا آنکھوں ٹھیکری رکھ لینا چاہیے۔ آخر یہی نواب ہیں جن کی بدولت ہزاروں روپے اماں جان نے پائے۔ آج زمانہ ان سے پھر گیا تو کیا ہم بھی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ گھر سے نکال دیں۔ یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اب اگر اماں زیادہ تنگ کریں گی تو بہن امراؤ میں سچ کہتی ہوں (نواب کا ہاتھ پکڑ کے) کسی طرف کو نکل جاؤں گی۔ لو میں نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔"

میں بسم اللہ کی باتیں بہت اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ ہاں میں ہاں ملا

رہی تھی۔

بسم اللہ۔ "اچھا تو نواب تم کہاں رہتے ہو"؟

نواب: "کہاں بتاؤں"؟

بسم اللہ: "آخر کہیں تو"؟

نواب: "تحسین گنج میں مخدوم بخش کے مکان پر رہتا ہوں۔ افسوس میں نہ جانتا تھا کہ مخدوم ایسا نمک حلال آدمی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں اس سے بہت ہی شرمندہ ہوں"۔

میں: "یہ وہی مخدوم بخش ہے نا جو آپ کے والد کے وقت سے نوکر تھا۔ جس کو آپ نے موقوف کر دیا تھا"؟

نواب: "ہاں وہی مخدوم بخش۔ کیا کہوں اس وقت وہ کیسا کام آیا۔ خیر اگر خدا نے چاہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اتنا کہہ کے نواب کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر پڑے۔ اسکے بعد نواب بسم اللہ کے ہاتھ سے دامن چھڑا کے کمرے کے باہر چلے گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ نواب سے چلتے وقت کچھ باتیں کروں گی اور اسی لیے ان کے ان کے ساتھ ہی اٹھی تھی۔ مگر وہ اس قدر جلد زینے سے اتر گئے کہ میں کچھ کہہ نہ سکی۔ نواب کے تیور اس وقت بہت بُرے تھے۔ خانم کی باتوں نے نواب کے دل پر سخت اثر کیا تھا۔ ان کی حالت بالکل مایوسی کی تھی۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ یہ سب باتیں خانم نے جو کی ہیں وہ سب اس فہمائش کی تمہید ہے جو اور کسی وقت پر موقوف رکھی گئی ہے مگر مجھے بہت ہی تشویش تھی کہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کچھ کھا کے سو رہیں تو اور غضب ہو۔

سرِ شام میں اور بسم اللہ دونوں سوار ہو کے تحسین گنج گئیں۔ مخدوم بخش کا مکان بڑی مشکل سے ملا۔ کہاروں نے اس کے دروازے پر آواز دی۔ ایک چھوٹی سی لڑکی اندر سے نکلی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مخدوم بخش گھر پر نہیں ہے۔ نواب کو پوچھا۔ اس نے کہا وہ صبح سے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ ابھی تک نہیں آئے۔ دو گھنٹہ تک انتظار کیا، نہ نواب صاحب آئے نہ مخدوم بخش۔ آخر مایوس ہو کر گھر چلے آئے۔

دوسرے دن صبح کو مخدوم بخش نواب کو ڈھونڈھتا ہوا آیا۔ معلوم ہوا کہ رات کو بھی اس کے مکان نہیں گئے۔ شام کو ان کی والدہ کی ماما وہی بڑھیا جو ایک دن خانم کے پاس آئی تھی روتی پیٹتی آئی۔ اس سے بھی یہی خبر ملی کہ نواب کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ بیگم صاحب نے روتے روتے اپنا عجب حال کیا۔ بڑے نواب سخت متفکر ہیں۔

اس واقعہ کو کئی دن گذر گئے اور نواب چھبن صاحب کا کہیں پتہ نہیں ملا۔ اس واقعہ کے چوتھے پانچویں روز چھبن صاحب کی انگوٹھی نخاس میں بکتی ہوئی پکڑی گئی۔ بیچنے والے کو علی رضا بیگ کوتوال کے پاس لے گئے۔ اس نے کہا مجھے امام بخش ساقی کے لڑکے نے بیچنے کو دی ہے امام بخش ساقی کا لڑکا تو نہ ملا خود امام بخش پکڑ بلایا گیا پہلے تو امام بخش صاف مکر گیا کہ اس انگوٹھی کو نہیں جانتا۔ آخر جب مرزا نے خوب ڈانٹا اور دھمکایا تو قبول دیا۔

امام بخش: حضور! میں لب دریا لوہے کے پل کے پاس حقہ پلاتا ہوں جو لوگ دریا نہانے جاتے ہیں ان کے کپڑوں کی رکھوالی کرتا ہوں پانچ دن کا ذکر ہے کہ ایک شریف زادے کوئی بیس بائیس برس کی عمر

...وگی، گورے سے تھے۔ بہت خوب صورت نوجوان تھے۔ سر شام پکے پل پر ...نہانے آئے۔ کپڑے اتار کے میرے پاس رکھوا دیئے۔ مجھ سے لنگی لے کے ...ندھی۔ اور دریا میں اتر گئے۔ تھوڑی دیر تک نہایا کیے۔ پھر میری ...نظروں سے اوجھل ہو گئے اور سب لوگ دریا سے نہا کے نکلے۔ کپڑے پہن ...ہن کے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ وہ صاحب نہ آئے۔ میں یہ سمجھا ...کسی طرف پیرتے ہوئے نکل گئے ہوں گے۔ بڑی دیر ہو گئی میں اس ...ئیں میں کہ اب آتے ہیں اب آتے ہیں۔ پہر رات گئے تک بیٹھا رہا۔ آخر ...مجھے یقین ہو گیا کہ ڈوب گئے۔ اب دل میں یہ سوچا کہ کسی کو خبر دیتا ...وں تو جھگڑوں میں پھنس جاؤں گا، کھنچا کھنچا پھروں گا۔ اس سے ...ہتر ہے کہ چپ ہو رہوں۔ ان کے کپڑے اٹھا کے گھر پر لے آیا۔ جیب ...ں سے یہ انگوٹھی نکلی اور ایک اور انگوٹھی ہے اس میں خدا جانے کیا لکھا ہے ...نے مارے ڈر کے آج تک کسی کو نہیں دکھائی۔ میں تو اس انگوٹھی کو نہ بیچتا ...گر میرا لڑکا شہدا ہو گیا ہے وہ چرا کے لے آیا۔"

مرزا علی رضا بیگ نے دو سپاہی کوتوالی سے ساتھ کیے۔ وہ انگوٹھی ...ور کپڑے اس کے گھر سے منگوائے۔ انگوٹھی مہر کی تھی۔ مرزا علی رضا بیگ نے ...ے نواب کو اس سانحے کی خبر کی۔ کپڑے اور دونوں انگوٹھیاں گھر بھجوا ...یں۔ امام بخش کو سزا ہو گئی۔

بسم اللہ: "ہا ہا۔ آخر نواب چھبن خاں ڈوب گئے نہ؟ میں تو سچ ...تی ہوں اماں جان کی گردن پر ان کا خون ہوا۔"

میں: افسوس! میں تو اسی دن دل میں کھٹک گئی اسی لیے جس ...ت ان کے ساتھ اٹھی تھی کہ کچھ سمجھا دوں گی۔ مگر وہ زینے سے اتر ہی گئے۔"

(۹)

کچھ اُن کو امتحان وفا سے غرض نہ تھی
اک زار و ناتواں کے ستانے سے کام تھا

امراؤ:" مرزا رسوا صاحب! آپ کو کسی سے عشق بھی ہوا ہے؟"
رسوا:" جی نہیں۔ خدا نہ کرے۔ آپ کو تو سیکڑوں سے عشق ہوا ہوگا۔ آپ اپنا حال کہیے۔ ایسی ہی باتیں سننے کے تو ہم مشتاق ہیں، مگر آپ کہتی ہی نہیں!"

امراؤ:" تو مبر از نڈی کا پیشہ ہے۔ اور یہ ہم لوگوں کا چلتا ہوا فقرہ ہے جب کسی کو دام میں لانا چاہتے ہیں اس پر مرنے لگتے ہیں۔ ہم سے زیادہ کسی کو مرنا نہیں آتا۔ ٹھنڈی سانسیں بھرنا، بات بات پر رو دینا، دو دو دن کھانا نا کھانا، کنوئیں میں پیر لٹکا کے بیٹھ جانا، سنکھیا کھا لینا۔ یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ کیسا ہی سخت دل کا آدمی کیوں نہ ہو۔ ہمارے فریب میں آ ہی جاتا ہے۔ مگر آپ سے سچ کہتی ہوں کہ نہ مجھ سے کسی کو عشق ہوا اور نہ مجھ کو کسی سے۔ البتہ بسم اللہ جان کو عشق بازی میں بڑا ملکہ تھا۔ انسان تو انسان فرشتہ ان کے جل سے نہیں نکل سکتا تھا ہزاروں ان کے عاشق تھے اور وہ ہزاروں پر عاشق تھیں۔ سچے عاشقوں میں ایک مولوی صاحب قبلہ کا بھی چہرہ تھا۔ ایسے ویسے مولوی نہ تھے عربی کی اونچی کتابوں کا درس دیتے تھے۔ دور دور سے لوگ ان سے پڑھنے آتے تھے معقولات میں

بسم اللہ: "اُن کے سر پر قضا سوار تھی۔ خدا غارت کرے بڑے نواب کو، نہ اُن کو جائداد سے بے حق کرتے نہ وہ اپنی جان دیتے۔"

میں: "خدا جانے ماں کا کیا حال ہوا ہوگا۔"

بسم اللہ: "سنا ہے کہ بے چاری دیوانی ہوگئی ہیں۔"

میں: "جو نہ ہو کم ہے۔ یہی تو ایک اللہ آمین لڑکا تھا۔ ایک تو بیچاری رانڈ بیوہ۔ دوسرے یہ آفت اُن کے سر پر ٹوٹ پڑی۔ سچ پوچھو تو ان کا گھر ہی تباہ ہوگیا۔"

رسوا: "تو نواب چھبن صاحب کو آپ نے ڈبو ہی دیا۔ اچھا اس موقع پر ایک بات مجھے اور پوچھ لینے دیجئے۔"

میں: "پوچھئے۔"

رسوا: "نواب صاحب پیرنا جانتے تھے یا نہیں؟"

میں: "کیا معلوم۔ یہ آپ کیوں پوچھتے ہیں؟"

رسوا: "اس لیے کہ مجھے میر مچھلی صاحب نے ایک نکتہ بتا دیا تھا کہ جو شخص پیرنا جانتا ہے وہ اپنے قصد سے نہیں ڈوب سکتا۔"

ان کا مثل و نظیر تھا۔ جس زمانے کا میں ذکر کرتی ہوں سن شریف ستر سے کچھ کم ہی ہوگا۔ نورانی چہرا، سفید داڑھی، سر منڈا ہوا۔ اس پر عمامہ عبائے شریف عصائے مبارک ہاتھ میں۔ ان کی صورت دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ ایک چھٹی ہوئی شوخ نوجوان رنڈی پر عاشق ہیں اور بُری طرح عاشق ہیں۔

ایک دن کا واقعہ عرض کرتی ہوں۔ اس میں کسی طرح کا مبالغہ نہ سمجھئے۔ بالکل صحیح ہے۔ آپ کے دوست ..... میر صاحب مرحوم ان کو دلبر جان سے تعلق تھا خود شاعر تھے اور عمدہ اشعار پر دم دیتے تھے اسی سلسلے میں حسن پرستی کا بھی شوق تھا، مگر نہایت ہی معقولیت کے ساتھ۔ شہر کی وضعدار رنڈیوں میں کون ایسی تھی جہاں وہ نہ جاتے ہوں

رسوا: "جی ہاں۔ کہئے میں خوب جانتا ہوں۔ خدا ان کے درجات عالی کرے۔"

امراؤ: "وہ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ شاید آپ کو یاد ہو۔ بسم اللہ جان خانم سے لڑ کے کچھ دنوں کے لیئے اس مکان میں جا کر رہی تھیں جو بزازے کے پچھواڑے تھا۔"

رسوا: "میں اس مکان پر کبھی نہیں گیا۔"

امراؤ: "خیر۔ مگر بسم اللہ کے دیکھنے کو لیئے اور اس غرض سے بھی کہ ماں بیٹیوں میں میل ملاپ کرا دوں میں اکثر جایا کرتی تھی۔ ایک دن قریب شام صحن میں تختوں کے چوکے پر گاؤ سے لگی بیٹھی ہیں۔ میر صاحب مرحوم ان کے قریب تشریف رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب قبلہ سامنے دو زانوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس وقت ان کی بے کسی کی صورت مجھے نہ بھولیگی۔ زیتون کی تسبیح چپکے چپکے (شاید) یا حفیظ پڑھ رہے ہیں۔ میں

جو گئی تو بسم اللہ نے ہاتھ پکڑ کے مجھے برابر بٹھا لیا۔ میں میر صاحب اور مولوی صاحب کو تسلیم کر کے بیٹھ گئی۔ بسم اللہ نے چپکے سے میرے کان میں کہا "تماشا دیکھو گی؟"

میں: (حیران ہو کر) کیا تماشا؟"

بسم اللہ: "دیکھو!" (یہ کہہ کے مولوی صاحب کی طرف متوجہ ہوئیں)

مکان کے صحن میں ایک بہت پرانا نیم کا درخت تھا۔ مولوی صاحب کو حکم ہوا اس درخت پر چڑھ جاؤ۔

مولوی صاحب کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ تھر تھر کانپنے لگے۔ میں زمین پر گری پڑی جاتی تھی۔ میر صاحب منہ پھیر کے بیٹھ گئے مولوی صاحب بے چارے کبھی آسمان کو دیکھتے تھے، کبھی بسم اللہ کی صورت کو۔ ایک حکم کر کے دوسرا حکم پہنچا اور فوراً تیسرا نادری حکم۔ "چڑھ جاؤ۔ میں کہتی ہوں!"

اب میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب بسم اللہ کہہ کے اٹھے۔ عبائے شریف کو ٹخنوں کے پہو کے پر چھوڑا نیم کی جڑ کے پاس کھڑے ہوتے۔ پھر ایک مرتبہ بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس نے اک ذرا چیں بجبیں ہو کے کہا: "ہوں!"

مولوی صاحب پائجامہ چڑھا کے درخت کے پر چڑھنے لگے تھوڑی اوپر جا کر بسم اللہ کی طرف دیکھا۔ اس دیکھنے کا شاید یہ مطلب تھا کہ بس یا اور؟

بسم اللہ: "اور!"

مولوی صاحب اور چڑھے پھر حکم کا انتظار کیا پھر وہی " اور!"

اسی طرح درخت کی پھننگ کے پاس پہونچ گئے۔ اب اگر اور اوپر جانے تو شاخیں اس قدر پتلی تھیں کہ ضرور ہی گر پڑتے اور جاں بحق تسلیم ہوجاتے بسم اللہ کی زبان سے اور نکلنے کو ہی تھا کہ میں قدموں پر گر پڑی۔ میر صاحب نے نہایت منت کے ساتھ سفارش کی۔ بارے حکم ہوا اترآؤ۔ مولوی صاحب چڑھنے کو تو چڑھ گئے تھے مگر اترنے میں بڑی دقت ہوئی۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب گرے اور جب گرے۔ مگر بخیر و عنایت اتر آئے۔ بیچارے پسینے پسینے ہو گئے۔ دم پھول گیا قریب تھا کہ گر پڑیں مگر اپنے کو سنبھال نعلین پہنے تخت کے قریب آئے۔ عبائے مبارک زیب دوش کیا۔ چپکے بیٹھ گئے۔ تسبیح پڑھنے لگے۔ بیٹھ تو گئے۔ مگر کسی پہلو قرار نہ تھا۔ چونٹے ازار شریف میں گھس گئے تھے۔ اس سے بہت پریشان تھے۔

رسوا۔ "بھئی واللہ بسم اللہ بھی عجب دل لگی باز رنڈی تھی"۔

امراؤ۔ "دل لگی کا ذکر کیا ہے۔ وہ بیدردچپکی بیٹھی تھی۔ تبسم کا اثر بھی چہرے پر نہ تھا۔ میں اور میر صاحب دونوں دم بخود تھے۔ ایک عجیب عالم حیرت طاری تھا۔

رہے گا کیوں کوئی طرزِ ستم باقی زمانے میں
مزا آتا ہے اس کافر کو الفت آزمانے میں

رسوا۔ "یہ جملہ عمر بھر ہنسنے کیلئے کافی ہے۔ تصور شرط ہے۔ تم نے تو بیان کیا اور میری ہی آنکھوں کے سامنے بسم اللہ مولوی صاحب اور ان کی مقدس صورت، میر صاحب، تم، صحن، نیم کا درخت، ان سب کی تصویریں کھنچ گئیں۔ یہ تو کچھ ایسا واقعہ ہے کہ دفعتاً ہنسی بھی نہیں آتی۔ مولوی صاحب کی حماقت پر رونا آتا ہے۔ بے شک بسم اللہ قیامت کی رنڈی تھی ستر برس

کا بڈھا اس پر یہ حکم درخت پر چڑھ جاؤ اور وہ بھی چڑھ گئے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بڑا دقیق مسئلہ ہے۔"

امراؤ۔" واقعی آپ نہیں سمجھ سکتے۔ اس میں قیامت کی باریکی ہے۔ آخر بیان ہی کرنا پڑیگا

رسوا۔" للہ بیان کیجئے۔ کیا ابھی کچھ اور فضیحت باقی ہے؟"

امراؤ۔" ابھی بہت سی فضیحتیں باقی ہیں۔ لے سُنیئے۔

مولوی صاحب کے جانے کے بعد میں نے بسم اللہ جان سے پوچھا تھا۔"

میں "بسم اللہ! یہ تجھ کو کیا ہوا تھا؟"

بسم اللہ "کیا؟"

میں "ستر برس کا بڈھا اور جو درخت پر سے گر پڑتا تو مفت میں خون ہوتا؟"

بسم اللہ " ہماری بلا سے خون ہوتا۔ میں تو اس موئے بڈھے سے جلی ہوئی تھی۔ کل میری دھنو کو اس زور سے دے پٹخا کہ ہڈی پسلی ٹوٹ گئی ہوتی۔"

بات یہ تھی کہ بسم اللہ جان نے ایک بندریا پالی تھی۔ اس کا بڑا گھر اسہاگ تھا ذرا اس کے ٹھاٹھ سن لیجئے۔ اطلس کی گھنگھریا۔ کامدانی کی کرتی۔ جالی کی اوڑھنی۔ چاندی کی چوڑیاں۔ طوق گھونگھرو۔ سونے کی بالیاں۔ جلیبیاں، امرتیاں کھانے کو۔ جب مول لی تھی تو موئی ذرا سی تھی۔ دو تین برس میں خوب کھا کھا کے موٹی ہوئی تھی۔ جو لوگ جانتے تھے وہ تو خیر۔ اجنبی آدمی پر جا پڑے تو گھگھی بندھ جائے۔ زور بھی تھا کہ اچھے

مرد کا ہاتھ پکڑ لے تو چھڑائے نہ بنے۔"

جس دن مولوی صاحب نیم پر چڑھائے گئے ہیں اس سے ایک دن پہلے کا ذکر ہے کہ آپ تشریف لائے۔ تختوں کے چوکے پہ بیٹھے ہوئے تھے کہ بسم اللہ جان کو مسخرا پن سوجھا۔ دھنو کو اشارہ کیا وہ پشت سے چھپکے آئی اور اچک کے مولوی صاحب کے کندھے پر جا بیٹھی۔ مولوی صاحب نے جو مڑکے دیکھا۔ بے چارے گھبرا گئے۔ زور سے جھٹک دیا۔ یہ تخت کے نیچے گر پڑی۔ یا میں تو جانتی ہوں۔ خود چلی گئی ہوگی۔ مولوی صاحب پر کھو کھیانے لگی۔ مولوی صاحب نے لاٹھی دکھائی۔ وہ ڈر کے بسم اللہ کی گود میں جا بیٹھی۔ بسم اللہ نے اسے تو چمکار کے دو پٹے کا آنچل اڑھا دیا۔ اور مولوی صاحب کو خوب دل کھول کر کوسا۔ گالیاں دیں۔ اس پر بھی صبر نہ آیا۔ دوسرے دن یہ سزا تجویز کی۔

رسوا "سزا مناسب تھی۔"

امراؤ "مناسبت میں تو کوئی شک نہیں۔ مولوی صاحب کو کھٹکے کا لنگور بنا دیا۔"

رسوا "واقعی مولوی صاحب لائق تعزیر تو تھے۔ قیس نے تو سگ لیلیٰ کو پیار کر کے گود میں اٹھا لیا تھا۔ اور مولوی صاحب نے بسم اللہ جان کی چہیتی بندریا کو اول تو جھٹک دیا۔ پھر بے ادبی کے اسے لاٹھی دکھائی۔ عشق کی شان سے بہت بعید تھا۔"

امراؤ ایک دن رات کے آٹھ بجے بسم اللہ جان کے کمرے میں ہوں۔ بسم اللہ گا رہی ہیں طنبورہ چھیڑ رہی ہوں۔ خلیفہ جی طبلہ بجا رہے ہیں۔

اتنے میں مولوی صاحب قبلہ تشریف لائے۔

بسم اللہ "(دیکھتے ہی) آٹھ دن سے تم کہاں تھے؟"

مولوی صاحب: "کیا بتاؤں مجھے تو اب ایسی تپ تند باد لاحق ہوئی تھی کہ بچنا محال تھا۔ مگر تمہارا دیدار کرنا تھا اس لیے جانبر ہو گیا۔"

بسم اللہ "تو یہ کہیئے وصال ہو گیا ہوتا۔"

اس فقرہ نے مجھ کو اور خلیفہ جی کو پھڑکا دیا۔

مولوی صاحب: "جی ہاں آثار تو کچھ ایسے ہی تھے۔"

بسم اللہ "واللہ اچھا ہوتا۔"

مولوی صاحب: "میرے مرنے سے آپ کو کیا نفع ہوتا؟"

بسم اللہ "جی آپ کے عرس میں ہر سال جایا کرتے، گاتے، ناچتے لوگوں کو رجھاتے۔ آپ کا نام روشن کرتے۔"

اسی طرح کی چٹ پٹی باتوں کے بعد پھر گانا شروع ہوا۔ بسم اللہ نے حسب موقع یہ غزل شروع کی۔

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی
اسی کافر کی ادا یاد آئی

مولوی صاحب پر وجد کی حالت طاری تھی۔ آنسوؤں کا تار بندھا تھا۔ قطرے ریش مقدس سے ٹپک رہے تھے۔ اتنے میں سامنے والا دروازہ کھلا۔ اور ایک صاحب گندمی رنگ، گول چہرہ، سیاہ داڑھی، میانہ قد کسرتی بدن، جامدانی کا انگرکھا بھنسا بھنسا پہنے ہوئے۔ کھلے پائنچوں کا پاجامہ مخملی جوتا۔ نہایت عمدہ۔ جالی پر کی چکن کا رومال اوڑھے ہوئے داخل ہوئے۔ بسم اللہ نے دیکھتے ہی کہا "واہ صاحب! اس دن کے گئے آج آپ آئے

ے بس اب ٹہلیئے۔ میں ایسی آشنائی نہیں رکھتی۔ اور وہ لال لال فی گردن کے طانفے کہاں ہیں۔ اسی سے تو آپ نے منہ چھپایا۔"

وہ صاحب: "(لجاجت کے لہجہ میں)۔ نہیں سرکار! یہ بات نہیں ہے اُس دن سے مجھے فرصت نہیں ملی۔ والد کی طبیعت بہت علیل تھی۔ میں اُن کی تیمارداری میں تھا۔

بسم اللہ: "جی ہاں، آپ ایسے ہی سعادت مند ہیں۔ مجھے یقین ہے۔ یہ نہیں کہئے کہ بن کی چھوکری پر آپ فریفتہ ہیں اور رات کو وہیں کی درباداری ہوتی ہے۔ مجھے سب خبریں ملتی ہیں اور ہم سے فقرے ہوتے ہیں۔ کہ والد کی طبیعت علیل تھی۔"

اس آواز کو سن کے ایک مرتبہ مولوی صاحب نے پیچھے مڑکے دیکھا اُن کی آنکھیں چار ہوئیں۔ مولوی صاحب نے فوراً منہ پھیر لیا۔ دوسرے صاحب کو جو دیکھتی ہوں تو چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں تھر تھر کانپنے لگے۔ جلدی سے دروازہ کھول کے کمرے کے نیچے تھے۔ بسم اللہ پکارتی کی پکارتی رہی۔ انہوں نے جواب تک نہ دیا۔

بسم اللہ بھی کچھ سمجھ کے پہلے تو چپ ہو گئی، مگر پھر ایک ہی مرتبہ تیوری چڑھا کے آپ ہی آپ کہنے لگی: "پھر باشد،" اتنا کہہ کے گانے میں مصروف ہو گئی۔

"اس دن کے بعد میں نے ان کو کبھی بسم اللہ کے پاس آتے نہیں دیکھا۔ مولوی صاحب برابر آیا کیے۔"

رسوا: "جی ہاں۔ اگلے زمانے کے لوگ ایسے ہی وضعدار ہوتے تھے۔

گانا ہو رہا تھا کہ گوہر مرزا شاید یہ سُن کے کہ میں یہاں ہوں بہیں چلے آئے ان سے اور بسم اللہ سے ہنسی ہوتی تھی۔ گالی گلوچ سے لے کے کشتم کشتہ تک نوبت پہونچ جاتی تھی۔ میرا مزاج ایسا چھچھورا نہ تھا کہ بُرا مانتی۔

گوہر مرزا میرے اور بسم اللہ کے بیچ میں بیٹھ گیا اور جھپٹ بسم اللہ کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔

گوہر مرزا۔ "آج خوب گا رہی ہو۔ جی چاہتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

اب جو دیکھتی ہوں تو مولوی صاحب کے ماتھے کی جھریوں میں حرکت ہونے لگی۔ ایک ہی مرتبہ گوہر مرزا کی نگاہ مولوی صاحب پر جا پڑی۔ پہلے تو بغور صورت دیکھی۔ پھر اپنا کان زور سے پکڑا۔ جھجک کے پیچھے ہٹا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آپ ڈر گئے۔ بسم اللہ اس حرکت پر بے تحاشہ ہنس پڑی۔ خلیفہ جی مسکرائے لگے۔ میں نے منہ پر رومال رکھ لیا۔ مگر مولوی صاحب بہت چیں بہ جبیں ہوئے بلکہ قریب تھا کہ اٹھ جائیں۔ مگر بسم اللہ نے کہا "بیٹھو" بے چارے پھر بیٹھ گئے بسم اللہ بھی کیا ہی شریر تھی۔ مولوی صاحب کو یہ ظاہر کرنا منظور تھا کہ گوہر مرزا میرے آشنا ہیں تاکہ مولوی صاحب دیکھ کے جلیں۔ گوہر مرزا سے ہنسنا شروع کیا۔ بڑی دیر تک مولوی صاحب کو اس دھوکے میں رکھا۔ اور ان کا وہ حال جیسے کوئی انگاروں پر لوٹ رہا ہو۔ جھلسے جاتے ہیں۔ مارے ہنسی کے میرے پیٹ میں بل پڑے جاتے ہیں۔ آخر مولوی صاحب کی بے کسی پر مجھے رحم آیا۔ میں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ اس میں بسم اللہ مجھ سے ناراض ہو گئیں۔ میں نے گوہر مرزا کی طرف متوجہ ہو کر کہا "لے اب من چلا پن کر چکے، چلو۔"

اب مولوی صاحب کو معلوم ہو گیا کہ گوہر مرزا سے مجھ سے رسم ہے۔ بسم اللہ سے کوئی واسطہ نہیں، بہت ہی خوش ہوئے۔ باچھیں کھل گئیں۔

رسوا: "مولوی صاحب سے تو پاک محبت تھی نہ ؟"

امراؤ: "پاک محبت تھی۔"

رسوا: "پھر ان کو جلنا نہ چاہیے تھا۔"

امراؤ: "واہ! کیا پاک محبت میں رشک نہیں ہوتا؟ ہوتا ہے۔"

رسوا: "تو پاک محبت نہ ہوگی۔"

امراؤ: "اب یہ اُن کا ایمان جانے۔ میں تو یہی سمجھتی تھی۔"

(۱۰)

خانم کی نوچیوں میں یوں تو میرے سوا ہر ایک اچھی تھی۔ مگر خورشید کا جواب نہ تھا۔ پری کی صورت تھی۔ رنگ میدا شہاب، ناک نقشہ گویا صانع قدرت نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔ آنکھوں میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ موتی کوٹ کوٹ کے بھر دیئے ہیں۔ ہاتھ پاؤں سڈول۔ نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے۔ بھرے بھرے بازو۔ گول کلائیاں۔ جامہ زیبی وہ قیامت کی کہ جو پہنا معلوم ہوا کہ یہ اسی کے لیے مناسب تھا اداؤں میں وہ دلفریبی، وہ بھولا پن جو ایک نظر دیکھے ہزار جان سے فریفتہ ہو جائے۔ جس محفل میں جا کے بیٹھ گئی معلوم ہوا کہ ایک شمع روشن ہو گئی۔ بیسیوں رنڈیاں بیٹھی ہوں، نظر اسی پر پڑتی تھی۔ یہ سب کچھ تھا مگر تقدیر کی اچھی نہ تھی۔ اور تقدیر کو بھی کیوں الزام دیجیے خود اپنے ہاتھوں سے عمر بھر خراب رہی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ رنڈی بننے کے لائق نہ تھی۔ بیسواڑے کے ایک زمیندار کی لڑکی تھی۔ صورت سے شرافت ظاہر تھی۔ حسن خداداد تھا۔ مگر اس حسن و جمال پر خبط یہ تھا کہ کوئی مجھ پر عاشق ہو۔ یوں تو خود ہی پیار کرنے کے لائق تھی۔ کون ایسا ہوگا جو اس پر فریفتہ نہ ہو جاتا۔ اول ہی اول پیارے صاحب کو محبت تھی۔ ہزاروں روپیہ کا سلوک کیا۔ واقعی جان دیتے تھے۔ خورشید نے بھی انہیں اچھی طرح کسا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ سچا عاشق ہے خود جان دینے لگیں۔ دن دن بھر کھانا نہیں کھاتیں۔ اگر ان کو کسی دن اتفاق سے دیر ہو گئی بیٹھی زار و قطار رو رہی ہیں۔ ہم نے صلاح دی " دیکھو خورشید! ایسا نہ کرو۔ مرد وے بے مروت

ہوتے ہیں۔ تمہارے ان کے صرف آشنائی ہے۔ آشنائی کی بنیاد کیا۔ نکاح نہیں ہوا بیاہ نہیں ہوا۔ اگر ایسا چاہو گی تو اپنا برا چاہو گی۔ پچھتاؤ گی" آخر ہمارا ہی کہا ہوا۔ پیارے صاحب نے جب دیکھا کہ رنڈی پیار کرتی ہے۔ لگے نخرے کرنے۔ یا تو آٹھوں پہر بیٹھے رہتے تھے یا اب ہیں کہ وہ دو دو دن نہیں آتے خورشید جان دیئے دیتی ہے۔ روتی ہے۔ پیٹتی ہے۔ کھانا نہیں کھاتی عجیب حال ہے۔ خانم کو صورت سے نفرت ہو گئی۔ یہاں تک کہ آنا جانا، کھانا پینا آدمیوں کی تنخواہ سب موقوف۔

میں نہیں سمجھ سکتی کہ اس حسن کے ساتھ عشق اس کے دل میں کس نے بھر دیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ کسی مرد آدمی کی جورو ہوتی تو خوب نباہ ہوتا عمر بھر مرد پاؤں دھو دھو کے پیتا۔ بشرطیکہ قدر دان ہوتا۔ بسم اللہ خورشید کے تلوؤں کی برابری نہیں کر سکتی تھیں۔ اس پر وہ تمکنت، وہ غرور، وہ نخرہ، وہ نکتوڑا کی خدا کی پناہ۔ مولوی صاحب کا حال تو آپ سن ہی چکے ہیں اور آشناؤں سے بھی اس کا سلوک کچھ اچھا نہ تھا۔ اصل تو یہ ہے کہ اس کو اپنی دولت پر بڑا گھمنڈ تھا۔ واقعی دولت بھی لازوال تھی۔ اپنی ہستی کسی کی ہستی ہی نہ تھی۔ خورشید کی ذات سے خانم کو بڑی امیدیں تھیں۔ واقعی اگر اس میں رنڈی پن ہوتا تو لاکھوں ہی پیدا کرتی۔ اس حسن و خوبی پر آواز بالکل نہ تھی۔ ناچنے میں بھی بالکل بھدی تھیں۔ صرف صورت ہی صورت تھی۔ اول اول مجرے بہت آتے تھے آخر جب معلوم ہوا کہ گانے ناچنے میں تمیز نہیں۔ لوگوں نے بلانا چھوڑ دیا۔ جو تھا وہ صورت کا مشتاق ہو کے آتا تھا۔ اچھے اچھے مرتے تھے۔ مگر جب آ کے دیکھا منہ تھوتھائے بیٹھی ہیں۔ ان پر عشق سوار تھا۔ ہر ایک سے بے رخی، بے اعتنائی یہ حالت دیکھ کے لوگوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ اب پیارے صاحب ہی صرف

ہو گئے ۔ ادھر تماشا دیکھئے کہ پیارے صاحب کی والدہ پر عتاب شاہی نازل ہوا
گھر کی ضبطی ہو گئی ۔ جاگیر چھین لی گئی ۔ بے چارے محتاج ہو گئے ۔ یہ سب کچھ ہوا
مگر خورشید کے عشق میں کمی نہ ہوئی ۔ اب یہ ضد ہوئی کہ مجھے گھر میں بٹھا لو ۔

پیارے صاحب نے بپاس خاندان یا یوں کہو کہ باپ کے ڈر سے منظور نہ
کیا ۔ خورشید کی آس ٹوٹ گئی ۔

خورشید بہت بھگی عورت تھی ۔ سیکڑوں رنڈیہ لوگ پھسلا پھسلا کے
کھا گئے ۔ فقیر فقرا سے آپ کو بڑا اعتقاد تھا ۔ ایک دن ایک شاہ صاحب
تشریف لائے وہ ایک کے دو کرتے تھے خورشید نے اپنے کڑے اور کنگن کی
جوڑیاں اتار دیں ۔ شاہ صاحب نے ایک کوری ہانڈی منگوائی ۔ اس میں
سیاہ تل بھروائے ۔ کڑے کنگن اس میں رکھ کر چپنی ڈھانک دی ۔ شال
کا ایک پرچہ گلے میں باندھ ، ناڑے سے باندھ دیا ۔ شاہ صاحب
روانہ ہو گئے چلتے چلتے کہہ گئے کہ آج نہ کھولنا کل کھولنا ۔ مرشد کے حکم سے
ایک کے دو ہو جائیں گے ۔ صبح کو ہانڈی کھولی گئی ، کالے تلوں کے سوا
کچھ نہ ملا ۔

ایک جوگی نے کالے سانپ کا پھن منہ سے نکال کے دکھلایا کہ یہ تجھے
برسوں آ کے ڈس جائے گا ۔ بی خورشید نے کانوں سے پتے بالیاں اتار کے
دے دیں ۔ خورشید کو کبھی غصہ آتا ہی نہ تھا ۔ ایسی نیک دل اور نیک مزاج
عورتیں بہو بیٹیوں میں کم ہوتی ہیں ، رنڈیوں کا کیا ذکر ۔ مگر ہاں ایک دن
غصہ آیا جب پیارے صاحب مانجھے کا جوڑا پہن کے آئے ۔ اول تو چپکی بیٹھی رہی
تھوڑی دیر کے بعد گالوں پر سرخی نمودار ہوئی ۔ رفتہ رفتہ سرخ بھبھوکا ہو گئے ۔ اس
کے بعد اٹھی مانجھے کے جوڑے کے پرزے پرزے کر ڈالے ۔ اب رقت شروع ہوئی

دو دن تک رویا کی۔ تمام دنیا نے سمجھایا کچھ نہ مانا۔ آخر بخار آنے لگا۔ دو مہینے بیمار رہی۔ جینے کے دینے پڑ گئے حکیموں نے دق تجویز کی لیکن خدا کے فضل سے دو مہینے کے بعد مزاج خود بخود رو بہ اصلاح ہو گیا۔ اب پیارے صاحب سے بظاہر چھٹم چھٹا ہو گئی۔ اس کے بعد اور لوگوں سے ملاقات ہو گئی مگر کسی سے دل نہ لگا۔ اور نہ کسی کا دل ان سے۔ اس بیٹے کے بے توجہی اور بے اعتنائی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ بظاہر ملتی تھیں مگر دل نہ ملتا تھا۔

(۱۱)

ساون کا مہینہ ہے۔ سہ پہر کا وقت ہے پانی برس کے کھل گیا ہے۔ چوک
ے کوٹھوں اور بلند دیواروں پر جابجا دھوپ ہے۔ ابر کے ٹکڑے آسمان
۔ ادھر ادھر آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ پچھم کی طرف شفق پھولی ہوئی ہے۔ چوک
ں سفید پوشوں کا مجمع زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ آج زیادہ مجمع کی وجہ یہ بھی تھی
جمعہ کا دن ہے۔ لوگ عیش باغ کے میلے کو جلد جلد قدم اٹھاتے چلے جاتے ہیں
رشید، امیر جان، بسم اللہ اور میں میلے جانے کے لیے بن ٹھن رہی ہیں دھانی
پٹے ابھی رنگ ریز رنگ کے دے گیا ہے۔ چنے جاتے ہیں۔ بالوں میں
گھی ہو رہی ہے، چوٹیاں گوندھی جاتی ہیں، بھاری زیور نکالے جاتے ہیں
انم صاحب سامنے چوکے پر گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی ہیں۔ بوا حسینی پیچوان لگا کے بھی
بیچھے ہٹی ہیں۔ خانم صاحب کے سامنے میر صاحب بیٹھے ہیں۔ میلے جانے پر
صرار کر رہے ہیں۔ وہ کہتی ہیں آج میری طبیعت سست ہے میں نہیں جانے
ں۔ ہم لوگ دعائیں مانگ رہے ہیں کہ خدا کرے نہ جائیں تو میلے کی
بہار ہے۔

خورشید پر اس دن غضب کا جوبن ہے۔ گوری رنگت۔ ململ کے
دھانی دوپٹے سے پھوٹی نکلتی ہے۔ اودی گرنٹ کا پاجامہ، بڑے بڑے
پائنچوں کا، سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ پھنسی پھنسی کرتی قیامت ڈھا رہی ہے
ہاتھ، گلے میں ہلکا ہلکا زیور ہے۔ ناک میں ہیرے کی کیل۔ کان میں سونے
کی نتھیاں۔ ہاتھ میں کڑے۔ گلے میں موتیوں کا کنٹھا۔ سامنے کمرے میں

قد آدم آئینہ لگا ہے۔ اپنی صورت دیکھ رہی ہیں۔ کیا کہوں کیا صورت تھی۔ اگر میری صورت ویسی ہوتی تو اپنے عکس کی آپ ہی بلائیں لے لیتی۔ مگر ان کو یہ غم ہے کہ ہائے اس صورت پر کوئی دیکھنے والا نہیں۔ پیارے صاحب سے بگاڑ ہی ہو چکا ہے۔ چہرہ اداس اداس ہے۔ ہائے وہ اداسی بھی غضب کر رہی ہے۔ اچھی صورت والوں کا سب کچھ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اس پری پیکر کی صورت دیکھنے سے دل بیٹھا جاتا ہے۔ اور تو کوئی مثال اپنے دل کی حالت کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی اچھے شاعر کا کوئی شعر درد آمیز سنا ہے اور دل اس کے مزے لے رہا ہے۔

بسم اللہ کی صورت ایسی بُری نہ تھی۔ کھلتا ہوا سانولا رنگ کتابی چہرہ، ستواں ناک، بڑی بڑی آنکھیں، سیاہ پتلی، بھرا بھرا بدن، بوٹا سا قد، کارچوبی نیلواں جوڑا کاہی کریپ کا دوپٹہ۔ بنت ٹکی ہوئی۔ زرد گرنٹ کا پاجامہ، بیش قیمت زیور۔ سر سے پاؤں تک گہنے میں لدی ہوئی اس پر طرہ پھولوں کا گہنا عین مین چوتھی کی دلہن معلوم ہوتی تھی۔ پھر اس پر بات بات میں شوخی شرارت میلے میں پہنچکر کسی کو منہ چڑھا دیا۔ کسی سے آنکھ لڑائی۔ جب وہ دیکھنے لگا تو منہ پھیر لیا۔ ہاں یہ کہنا بھول گئی کہ ہم لوگ بناؤ سنگھار کر کے میانوں میں سوار ہوئے میلے پہنچے۔

میلے میں وہ بھیڑ جمع تھی۔ کہ اگر تھالی پھینکو تو سر ہی سر جائے۔ جا بجا کھلونے والوں مٹھائی والوں کی دکانیں۔ خوانچہ والے، میوہ فروش۔ ہار والے تنبولی، سقنیں۔ غرضکہ جو کچھ میلوں میں ہوتا ہے سب کچھ تھا۔ مجھے تو اور کسی چیز سے کام نہیں، لوگوں کے چہرے دیکھنے کا ہمیشہ سے شوق ہے۔ خصوصاً میلے تماشوں میں۔ خوش ناخوش۔ مفلس، تونگر، بیوقوف،

عقل مند، عالم، جاہل، شریف، ذلیل، سخی، بخیل ۔ یہ سب چہرے سے کھل جاتا ہے۔ ایک صاحب ہیں کہ وہ اپنے تن زیب کے انگرکھے اور اودی صدری نکہ دار ٹوپی، چست گھٹنے۔ اور مخملی چڑھویں جوتے پر اتراتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ کوئی صاحب ہیں، صندلی رنگا ہوا دوپٹہ، سر سے آڑا باندھے ہوئے رنڈیوں کو گھورتے پھرتے ہیں۔ ایک صاحب آئے تو ہیں میلہ دیکھنے مگر بہت ہی مکدر۔ جبیں بہ جبیں کچھ چپکے چپکے بڑبڑاتے بھی جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے بیوی سے لڑ کے آئے ہیں۔ جن باتوں کے جواب بروقت نہ سوجھے تھے۔ انہیں اب یاد کر رہے ہیں۔ کوئی صاحب اپنے چھوٹے سے لڑکے کی انگلی پکڑے اس سے باتیں کرتے چلے آتے ہیں۔ ہر بات میں اماں کا نام آتا ہے۔ اماں کھانا پکاتی ہوں گی۔ اماں کا جی ماندہ ہے۔ اماں سو رہی ہوں گی۔ اماں جاگتی ہوں گی۔ بہت شوخی نہ کیا کرو۔ نہیں تو اماں حکیم کے یہاں چلی جائیں گی ایک صاحب سات آٹھ برس کی لڑکی کو سرخ کپڑے پہنا کے لائے ہیں۔ کندھے پر چڑھائے ہوئے ہیں ناک میں ننھی سی نتھنی ہے۔ اونچی چوٹی گندھی ہوئی۔ لال شال باف کا موباف پڑا ہے۔ ہاتھوں میں چاندی کی چوڑیاں ہیں، معصوم کے دونوں ہاتھ زور سے پکڑے ہیں کلائیاں دکھی جاتی ہیں۔ کوئی چوڑیاں نہ اتار لے۔ کیئے پھر پہنا کے لانا ہی کیا ضرور تھا۔

لیجئے دوسرے صاحب ایک اور اُن کے یار غار بھی ساتھ ہیں۔ فرماتشی گالیاں چل رہی ہیں "اماں پان تو کھاؤ۔ کھٹ سے پیسہ تنبولی کی دکان پر پھینکا معلوم ہوا کہ آپ بڑے تونگر ہیں۔ پیسہ دو پیسہ آپ کے آگے کیا اصل ہے۔ فوراً ہی حقہ والے کو بھی آواز دی "بھئی ساقی ادھر آنا۔ حقہ سلگا ہوا ہے؟" ایک اور یار اُن کے آموجود ہوتے۔ معمولی گالی گلوچ کے بعد "آداب، سلام بندگی مزاج پرسی بے تکلفی دوستوں میں ہوا کرتی ہے "ابے پان تو کھلوا۔"

لطف تو یہ کہ آپ مسلمان، پار ہندی۔ جب تنبولی نے پان دینے جھپ سے بڑھ کے لیے لیے۔" ابے یار بھول گئے"! اب یہ کھسیانے ہوتے۔ ٹینٹ سے ایک پیسہ نکالا۔" لو بھئی ہمیں بھی دو۔ پان دینا۔ الائچی بھی چھوڑ دینا۔ چونا زیادہ نہ ہو"! (دوست سے)" اچھا لو چلم تو پلواؤ گے"!

چلم حقہ سے اتارتے ہی تھے کہ ساقی نے گھور کے دیکھا۔ فوراً ہاتھ سے حقہ اور جیب سے پیسہ نکال کے دینا پڑا۔

گوہر مرزا نے موتی جھیل کے کنارے فرش بچھوا دیا تھا۔ وہیں جا کے ٹھہرے۔ ادھر اُدھر درختوں میں پھرتے رہے۔ سر شام سے دو گھڑی رات گئے تک میلہ کی سیر کی۔ پھر گھر چلنے کی ٹھہری۔ اپنے اپنے میانوں میں سوار ہوتے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو خورشید جان کا میانہ خالی ہے۔ ان کا کہیں پتہ نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کے گھر واپس آئے۔ خانم نے سنتے ہی سر پیٹ لیا۔ تمام گھر کو صدمہ ہوا۔ میں خود رات بھر رویا کی۔ پیارے صاحب کے آدمی مکان پر گیا۔ وہ بے چارے اسی وقت دوڑے ہوئے آئے۔ ہزاروں قسمیں کھائیں۔ مجھے بالکل نہیں معلوم میں میلہ میں بھی نہیں گیا۔ بیگم کی طبیعت علیل ہے جاتا تو کیونکر جاتا۔ پیارے صاحب پر یوں بے جا سا گمان تھا۔ ان کے قسمیں کھانے کے بعد کسی کو شبہ نہ رہا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ شادی کے بعد بیوی کے ایسے پابند ہو گئے تھے کہ چوک کا آنا جانا بالکل موقوف کر دیا تھا۔ رات کو گھر سے نکلتے ہی نہ تھے۔ خورشید کے گم ہونے کی خبر سن کے کچھ تو اگلی محبت کے خیال سے اور کچھ خانم کی مروت سے نہیں معلوم کس طرح سے چلے آئے تھے۔

خورشید کے گم ہونے کے ڈیڑھ مہینے کے بعد ایک صاحب جن کی وضع شہر کے بانکوں کی ایسی تھی، سانولا رنگ، چھریرا بدن ایک دوشالہ کمر سے اور ایک

سر سے باندھے میرے کمرے میں درانہ چلے آئے اور آتے کے ساتھ ہی سامنے قالین کے کنارے بیٹھ گئے اس سے مجھے معلوم ہوا کہ طبیعت میں کسی قدر کمینہ پن ہے۔ یا ابھی انبیلے ہیں۔ رنڈیوں کے یہاں جانے کا کم اتفاق ہوا ہے۔ اس وقت میں اکیلی بیٹھی تھی۔ میں نے بوا حسینی کو آواز دی۔ وہ کمرے میں آئیں۔ اُن کے آتے ہی وہ صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور کسی قدر بے تکلفی کے ساتھ بوا حسینی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ علیحدہ لے کر کچھ باتیں کیں۔ جن میں کچھ میں نے سنیں اور کچھ نہیں سنیں۔ اس کے بعد بوا حسینی خانم صاحب کے پاس گئیں۔ وہاں سے آکے پھر باتیں ہوئیں آخر کلام یہ تھا کہ آپ کو ایک مہینہ کی تنخواہ پیشگی دینی ہو گی۔ ان صاحب نے کمرے بنڈر روپیوں کی نکالی بوا حسینی نے گود پھیلائی انہوں نے چھن سے روپے پھینک دیئے۔

بوا حسینی: "یہ کتنے ہیں؟"

وہ صاحب: "نہیں معلوم۔ گن لیجئے۔"

بوا حسینی: "اے مجھے تو نگوڑا گننا بھی نہیں آتا۔"

وہ صاحب: "میں جانتا ہوں۔ بچھتر روپے ہوں گے شاید۔ ایک دو کم ہوں زیادہ۔"

بوا حسینی: "میاں پچھتر کسے کہتے ہیں۔؟"

وہ صاحب: "تین بیسی اور پندرہ پچیس کم سو۔"

بوا حسینی: "پچیس کم سو۔ تو یہ کتنے دن کی تنخواہ ہوئی؟"

وہ صاحب: "پندرہ دن کی۔ کل وہ بھی پندرہ دن کی دیدوں گا۔ پورے ڈیڑھ سے نخر چے آپ کو پہنچ جائیں گے۔"

یہ نخر چے کی سن کے مجھے بہت ہی برا معلوم ہوا۔ اب تو بالکل ہی یقین ہو گیا کہ یہ ایسے ہی ویسے ہوں گے مگر مجبور رنڈی کا پیشہ، دوسرے پرائے بس میں کرتی تو کیا کرتی۔

بوا حسینی روپے لے کے خانم کے پاس گئیں۔ خانم اس وقت نہیں معلوم کس نیکی کے دم میں تھیں کہ فوراً منظور کر لیا۔ بلکہ تعجب ہوا اس لیے کہ بڑے بڑے رئیسوں سے روپے بارے میں ایک دم کے لیے مروت نہیں کرتی تھیں۔ یا اس وقت ایک دن کا وعدہ ٹال لیا۔

اس معاملے کے طے ہونے کے بعد وہ صاحب میرے ہی کمرے میں شب باش ہوئے۔ کوئی پہر رات باقی ہوگی مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے کمرے کے پیچھے آ کے دستک دی۔ وہ صاحب فوراً اٹھ بیٹھے، اور کہا تو اب میں جاتا ہوں کل شب کو پھر آؤں گا۔ چلتے وقت پانچ اشرفیاں اور تین انگوٹھیاں 'ایک سونے کی' یاقوت کا نگینہ، ایک فیروزے کی ایک ہیرے کی مجھ کو دیں اور کہا "یہ تم اپنے پاس رکھنا خانم کو نہ دینا۔" میں نے خوشی خوشی ہاتھ میں پہن اور اپنی انگلیوں کو دیکھنے لگی۔ مجھے بہت ہی خوب صورت معلوم ہوتی تھیں۔ پھر صندوقچہ کھولا اور انگوٹھیوں کو چور خانے میں رکھ دیا۔

دوسرے دن شب کو پھر وہی صاحب آئے۔ اس وقت میں تعلیم لے رہی تھی۔ وہ ایک کنارے آکر بیٹھ گئے۔ گانا ہوا کیا۔ پانچ روپے سازندوں کو دیئے استاد جی اور سارنگیے خوشامد کی باتیں کرنے لگے۔ استاد جی نے کمر میں جو دو شالہ بندھا ہوا تھا اس کے اینٹھنے کی فکر کی پھر منہ پھوڑ کے مانگا۔ مگر وار خالی گیا۔ انہوں نے نہ دیا۔

وہ صاحب: "استاد جی۔ روپیہ پیسہ اور جس چیز کو کہیئے موجود ہے۔ یہ دوشالہ میں نہیں دے سکتا۔ ایک دوست کی نشانی ہے!"

استاد جی اپنا سا منہ لے کے چپ ہو رہے۔

اس کے بعد تعلیم ختم ہوئی۔ بوا حسینی کو باقی پچھتر گن دیئے گئے۔ پانچ روپے

بوا حسینی کو اپنی طرف سے دیجئے۔ وہ رخصت ہوئیں۔ جب میں اور وہ صرف دو آدمی کمرے میں رہ گئے۔ میں نے پوچھا "آپ نے مجھ کو کہاں دیکھا تھا جو یہ عنایت کی؟"

وہ: "دو مہینے ہوئے عیش باغ کے میلے میں۔"

میں: "اور آئے پھر دو مہینے کے بعد۔"

وہ: "میں باہر چلا گیا تھا اور اب پھر جانے والا ہوں۔"

اب میں نے رنڈی پن کی لگاوٹ شروع کی۔

میں: "تو ہمیں چھوڑ کے چلے جاؤ گے۔"

وہ: "نہیں۔ پھر بہت جلد چلا آؤں گا۔"

میں: "اور تمہارا مکان کہاں ہے؟"

وہ: "مکان تو فرخ آباد میں ہے۔ مگر یہاں بہت کام رہنا ہے بلکہ رہتا نہیں ہوں۔ کچھ دنوں کے لیے باہر چلا جاتا ہوں پھر چلا آتا ہوں۔"

میں: "اور یہ دوشالہ کس کی نشانی ہے؟"

وہ: "کسی کی نہیں۔"

میں: "واہ میں سمجھ گئی۔ یہ تمہاری آشنا کی نشانی ہے"

وہ: "نہیں تمہارے سر کی قسم میری کوئی آشنا نہیں ہے۔ بس تمہیں ہو جو کچھ ہو۔"

میں۔ "تو پھر مجھے دیدو۔"

وہ: "میں نہیں دے سکتا۔"

یہ بات مجھے بہت ناگوار ہوئی۔ اتنے میں انہوں نے بڑے بڑے موتیوں کی مالا جس میں زمرد کی لڑیں لگی ہوئی تھیں۔ اور ایک جوڑی ہیرے کے کڑے کی اور دو انگوٹھیاں سونے کی میرے آگے رکھ دیں۔ یہ سب تو میں نے خوشی خوشی اٹھا لیا

صندوقچہ کھول کے بند کرنے لگی۔ مگر مجھے تعجب ہوا کہ یہ ہزاروں کی رقم تو یوں مجھکو دیئے دیتے ہیں۔ مگر یہ دوشالہ زیادہ سے زیادہ پانچ سو کا ہوگا۔ اس سے کیوں انکار کیا۔ واقعی مجھ کو یہ دوشالہ پسند نہ تھا جو میں اصرار کرتی۔ اپنے کام سے کام تھا۔

ان صاحب کا نام فیض علی تھا۔ پہر ڈیڑھ پہر رات گئے آتے تھے۔ اور کبھی آدھی کو۔ کبھی پچھلے پہر سے رات کو اٹھ کے جاتے تھے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینے میں کئی بار دستک یا سیٹی کی آواز میں نے سنی۔ اور فوراً ہی فیض علی اٹھ کے روانہ ہو گئے۔ فیض علی سے رسم ہوئے کوئی ڈیڑھ مہینہ گذرا ہوگا کہ میرا صندوقچہ سادے اور جڑاؤ گہنے سے بھر گیا۔ اشرفیوں اور روپیوں کا شمار نہیں۔ اب میرے پاس خانم اور بوا حسینی سے چھپا ہوا دس بارہ ہزار کا مال ہو گیا تھا۔

فیض علی سے اگر مجھ کو محبت نہ تھی تو نفرت بھی نہ تھی اور نفرت ہونے کی کیا وجہ اول تو وہ کچھ بدصورت بھی نہ تھے۔ دوسرے لینا دینا عجیب چیز ہے۔ میں سچ کہتی ہوں جب تک وہ نہ آتے تھے میری آنکھیں دروازہ کی طرف لگی رہتی تھیں۔ گوہر مرزا کی آمدرفت ان دنوں صرف دن کی رہ گئی تھی۔ شب کے آنے والوں میں سے بھی اکثر لوگ سمجھ گئے تھے کہ میں کسی کی پابند ہو گئی ہوں۔ اس لیے سویرے سے کھسک جاتے تھے اور جو صاحب جم کے بیٹھتے تھے ان کو میں کسی حیلے سے ٹال دیتی تھی۔ خورشید کی تلاش بہت کچھ ہوئی۔ مگر کہیں سراغ نہ ملا۔ اس اثنا میں فیض علی کو مجھ سے بہت محبت تھی جس کا اظہار طرح طرح سے ہوتا تھا۔ اگر میرا دل ابتدا سے گوہر مرزا کی طرف مائل نہ ہو گیا ہوتا تو میں ضرور فیض علی سے محبت کرتی۔ اور اسی کو دل دیتی۔ اس پر بھی میں نے ان کی دلجوئی اور ظاہرداری میں کسی طرح کمی نہیں کی۔ میں نے فیض علی کو فریب دے رکھا تھا کہ مجھے تم سے محبت ہے اور وہ بےچارا میرے دام میں پھنسا ہوا تھا۔ جو کچھ خفیہ اس نے مجھ کو دیا اس کی کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ خانم اور بوا حسینی کے کہنے سے

مجھے فرمائشیں بھی کرنا پڑتی تھیں۔ ان کی بجا آوری کو بھی وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس کو روپیہ پیسہ کی کوئی پرواہ نہ تھی۔ ایسا دل چلا آدمی نہ میں نے رئیسوں میں دیکھا۔ نہ شہزادوں میں:"

رسوا۔ جی ہاں کیوں نہیں۔ ماں سفت دل بے رحم۔ بھلا اس کے برابر کس کا دل ہو سکتا تھا"

امراؤ:" ماں سفت کیوں؟"

رسوا:" نہیں تو اپنی اماں جان کا زیور آپ کو اتار کے لا دیا کرتا تھا"

امراؤ:" ہمیں کیا معلوم تھا"

(۱۲)

شب کے آنے والوں میں ایک پناامل چودھری تھے۔ گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ کے چلے جاتے تھے۔ ان کو چار آدمیوں میں بیٹھنے کا مزا تھا۔ اگر ان کی خاطر داری ہوتی رہے تو اور کسی کے آنے جانے سے ان کو غرض نہ تھی۔ مہینے میں دو سو روپے کا نقد سلوک اور فرمائشوں کا ذکر نہیں۔ فیض علی کی ملاقات کے زمانے میں ان کی آمدرفت بھی کم ہو گئی تھی۔ یا تو ہر روز آیا کرتے تھے یا دوسرے تیسرے روز آنے لگے۔ پھر ایک مرتبہ پندرہ دن کا غوطہ لگایا۔ اب جو آئے تو اداس اداس معمولی باتوں کا جواب دیتے تھے اور خاموش ہو جاتے ہیں۔

پناامل: "کیا تم نے سنا نہ ہوگا؟"

میں: "کیا؟"

پناامل: "ہم تو تباہ ہو گئے۔ گھر میں چوری ہو گئی۔ پشتینیوں کا اثاثہ اٹھ گیا"

میں: (چونک کر) "ہائیں! چوری ہو گئی۔ کتنے کا مال گیا؟"

پناامل: "سب اٹھ گیا۔ رہا کیا؟ دو لاکھ کا جواہر اٹھ گیا!"

میں: دل میں تو ہنسی۔ ہنسی اس بات پر کہ ان کے باپ چھناامل تو کروڑ پتی مشہور تھے:

اس میں کچھ شک نہیں کہ دو لاکھ بہت بڑی رقم ہوتی ہے مگر ان کے نزدیک کیا اصل ہے۔ بظاہر منہ بنا کے بہت افسوس کیا۔

پناامل: "جی ہاں۔ آج کل شہر میں چوریاں بہت ہوتی ہیں۔ نواب ملکہ عالم کے یہاں چوری ہوئی۔ لالہ ہر پرشاد کے ہاں چوری ہوئی۔ اندھیر ہے۔ سنا ہے

باہر سے چور آتے ہوتے ہیں۔ مرزا علی بیگ بیچارے حیران ہیں۔ شہر کے چور سب طلب ہوگئے تھے۔ کسی سے کچھ پتہ نہیں ملا۔ وہ لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے ہیں کہ یہ ہمارا کام نہیں ہے۔ بنا مل کے آنے کے دوسرے دن میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں کہ چوک میں ایک شور ہوا۔ میں بھی چلمن کے پاس جا کھڑی ہوتی اب جو دیکھتی ہوں تو خلائق کا انبوہ ہے۔

ایک :" آخر گرفتار ہوئے نا"

دوسرا :" واہ مرزا کیا کہنا۔ کوتوال ہو تو ایسا ہو"

تیسرا :" کیوں بھئی کچھ مال کا بھی پتہ لگا"؟

چوتھا :" بہت کچھ برآمد ہوا۔ مگر ابھی بہت سا باقی ہے"

پانچواں :" میاں فیضو بھی گرفتار ہوئے"؟

چھٹا۔" وہ کیا آرہے ہیں"

میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میاں فیضو بندھے چلے آتے ہیں، سپاہیوں کا گارد ساتھ ہے۔ گرد خلائق کا انبوہ ہے۔ میاں فیضو منہ پر دوپٹہ ڈالے ہوتے، ان کی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ دوپہر سے پہلے کا واقعہ ہے۔

حسب معمول فیض علی کوئی پہر رات گئے تشریف لائے کمرے میں میں تھی اور وہ ہیں آتے ہی کہا۔" آج ہم باہر جاتیں ہیں۔ پرسوں آئیں گے۔ دیکھو امراؤ جان جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے۔ اس پر ظاہر نہ کرنا۔ بوا حسینی کو نہ دینا نہ خانم کو دکھانا تمہارے کام آئے گا۔ ہم پرسوں ضرور آئیں گے۔ اچھا یہ کہو کہ ہمارے ساتھ تھوڑے دنوں کے لیے باہر چل سکتی ہو"؟

میں :" تم جانتے ہو کہ میں اپنے بس میں نہیں خانم صاحب کو اختیار ہے۔ تم ان سے کہو اگر وہ راضی ہوں تو مجھے کیا عذر ہے۔

فیض علی "سچ ہے کہ تم لوگ بڑے بے وفا ہوتے ہو۔ ہم تو تم پر جان دیتے ہیں اور تم ایسا خشک جواب دیتی ہو۔ اچھا بوا حسینی کو بلواؤ۔"

میں نے بوا حسینی کو آواز دی وہ آئیں۔

فیض علی۔ (میری طرف اشارہ کر کے) بھلا کچھ دنوں کے لیے باہر بھی جا سکتی ہیں؟"

حسینی "کہاں؟"

فیض علی "فرخ آباد۔ میں کوئی ایسا ویسا آدمی نہیں ہوں۔ میری وہاں ریاست ہے۔ بالفعل میں دو مہینے کے لیے جاتا ہوں۔ اگر خانم صاحب منظور کریں تو دو مہینے کی تنخواہ پیشگی بلکہ اس کے علاوہ جو کچھ کہیں میں دینے کو تیار رہوں۔"

بوا حسینی "مجھے تو نہیں یقین کہ خانم منظور کریں گی۔"

فیض علی "اچھا تم پوچھو تو۔"

بوا حسینی "خانم صاحب کے پاس گئیں۔

میرے نزدیک بوا حسینی کو خانم کے پاس بھیجنا بے کار تھا۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ وہ ہرگز منظور نہ کریں گی۔"

فیض علی نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا تھا کہ اگر میں اپنے اختیار میں ہوتی تو مجھے ان کے ساتھ جانے میں کچھ عذر بھی نہ ہوتا۔ میں یہ خیال کرتی تھی کہ جب اس شخص نے گھر بیٹھے اتنا سلوک کیا تو وطن جا کر نہال کر دے گا۔ میں اس خیال میں تھی کہ اتنے میں بوا حسینی نے آکر صاف جواب دیا کہ "ان کا باہر جانا کسی طرح نہیں ہو سکتا!"

فیض علی "دوگنی تنخواہ پر سہی۔"

بوا حسینی۔ چوگنی تنخواہ پر بھی ممکن نہیں۔ ہم لوگ باہر نہیں جانے دیتے۔"

فیض علی۔ خیر! جانے دو۔

بوا حسینی چلی گئیں۔ میں نے دیکھا کہ فیض علی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ یہ حال دیکھ کے مجھے بہت ہی ترس معلوم ہوا۔

معشوقوں کی بیوفائیاں کا تذکرہ قصہ کہانیوں میں جب سنتی تھی تو مجھے افسوس ہوتا تھا۔ برا کہتی تھی۔ مجھے یہ خیال آیا کہ اگر اس کا ساتھ نہ دیا تو میری بے وفائی اور احسان فراموشی میں کوئی شبہ نہیں۔

میں نے دل میں ٹھان لیا کہ اس شخص کا ضرور ساتھ دوں گی۔

میں "اچھا تو میں چلونگی"

فیض علی "چلو گی؟"

میں "ہاں۔ کوئی جانے دے یا نہ جانے دے میں ضرور چلونگی"

فیض علی "کیونکر؟"

میں "چھپ کے"

فیض علی "اچھا تو پرسوں رات کو ہم آئیں گے۔ پہر رات رہے تمہیں یہاں سے نکال لے چلیں گے۔ دیکھو دغا نہ دینا ورنہ اچھا نہ ہوگا"

میں "میں اپنی خوشی سے چلنے کو کہتی ہوں۔ تم سے وعدہ کر چکی ہوں میرے وعدہ کو بھی دیکھنا۔

فیض علی "بہت اچھا۔ دیکھا جائے گا"

اس رات کو فیض علی کوئی ڈیڑھ پہر رات رہے۔ میرے پاس سے اٹھ کے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں دل میں غور کرنے لگی۔ وعدہ تو کر لیا۔ مگر دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ جاؤں یا نہ جاؤں۔

جب فیض علی کی محبت اور اپنے وعدہ کا خیال آتا تھا تو دل کہتا تھا جانا چاہیے۔ مگر جیسے کوئی منع کرتا ہو کہ نہ جاؤ۔ خدا جانے کیا ہو۔

اسی ادھیڑ بن میں صبح ہو گئی کو بات طے نہ ہوتی۔ دن بھر یہی باتیں دل سے نہ رہیں۔ رات کو اتفاق سے کوئی میرے پاس نہ آیا۔ کمرے میں اکیلی اسی فکر میں رہی آخر نیند آگئی۔ صبح کو ذرا دن چڑھے تک سویا کی گوہر مرزا نے کچی نیند میں آ کر جھنجھوڑ کے اٹھا دیا۔ مجھے بہت ہی برا معلوم ہوا۔ دن بھر نیند کا سا خمار رہا۔ نہیں معلوم کس بات پر بوا حسینی سے الجھن ہو گئی۔ ہاں خوب یاد آیا۔ بات یہ تھی کہ کہیں باہر سے مجرے آیا تھا۔ بوا حسینی نے مجھ سے کہا: "جاؤ گی؟" اس وقت میرے سر میں درد ہو رہا تھا۔ میں نے صاف انکار کر دیا۔ بوا حسینی نے کہا: "واہ جب نہ تب انکار کر دیتی ہو آخر اس پیشہ میں ہو کر کرو گی کیا؟" میں نے کہا: "میں تو نہ جاؤنگی۔ بوا حسینی نے کہا۔ "نہیں جانا ہو گا۔ خاص تمہاری فرمائش ہے اور خانم صاحب نے وعدہ کر لیا ہے۔ روپیہ بھی لے لیا ہے۔" میں نے کہا: "بوا میں نہیں جانے کی۔ روپیہ پھیر دو۔"

بوا حسینی: "بھلا تم جانتی ہو۔ خانم صاحب روپیہ لے کے کبھی پھیرتی ہیں؟"

میں: "اگر کسی کی طبیعت اچھی ہو چاہے نہ اچھی ہو۔ اگر خانم صاحب روپیہ نہ پھیریں گی تو میں اپنے پاس سے پھیر دوں گی۔"

بوا حسینی: "آہا! اب تم بڑی روپیہ والی ہو گئی ہو۔ لاؤ پھیر دو۔"

میں: "کتنا روپیہ ہے؟"

بوا حسینی: "سو روپیہ ہے۔"

میں: "سو روپیہ تو گی! کسی کی جان نا؟"

بوا حسینی کو بھی اس دن خدا جانے کہاں کی ضد چڑھ گئی تھی۔

بوا حسینی: "بڑی کھری ہو تو دے دو۔"

میں: "شام کو دے دوں گی۔"

بوا حسینی: "وہاں باہر کے آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ شام تک کے لیے کیوں مانینگے۔"

بوا حسینی اپنے دل میں یہ سمجھے نہیں کہ اس کے پاس روپیہ کہاں سے آیا۔ اگر اس وقت اس حیلے سے تنگ کی جائے گی تو خواہ مخواہ مجرے پر راضی ہو جاتے گی میرے صندوقچے میں اس وقت کچھ نہ ہوں گے تو ہزار ڈیڑھ ہزار کی تو اشرفیاں ہوں گی۔ زیور کا ذکر نہیں۔ مگر اس وقت بوا حسینی کے سامنے صندوقچہ کھولنا مناسب نہ تھا۔

میں "جاؤ۔ گھنٹہ بھر میں لے جانا۔"

بوا حسینی "یہ گھنٹے بھر میں کیا موکل دے جائیں گی"؟

میں "ہاں، دے جائیں گے۔ جاؤ بھئی مجھے اس وقت دق نہ کرو میری طبیعت اچھی نہیں ہے۔"

بوا حسینی۔ "آخر کچھ کہو تو لڑکی کیا ہوا؟"

میں "مجھے بخار کی سی حرارت ہے اور سر میں شدت سے درد ہو رہا ہے"۔

بوا حسینی "(ماتھے پر ہاتھ رکھ کے دیکھا) "ہاں سچ تو ہے۔ بنڈا پھیکا ہے مگر مجرے کو تو کہیں پرسوں جانا ہوگا۔ جب تک خدا نہ کرے کیا طبیعت کا یہی حال رہے گا؟ روپے کیوں پھیرے جائیں؟"

میں اس بات کا کچھ جواب نہ دینے پائی تھی کہ بوا حسینی جلدی سے اٹھ کے چلی گئیں۔ بوا حسینی کی اس ہماہمی سے مجھے بہت ہی غصہ معلوم ہوا۔ اس وقت دل میں بدی آ گئی۔ دل نے کہا "واہ جی! جب ان لوگوں کو ہمارے دکھ بیماری کا خیال نہیں، اپنے مطلب سے مطلب ہے تو ان کے ساتھ رہنا بے کار ہے۔

رسوا "کبھی پہلے بھی یہ خیال آپ کے دل میں آیا تھا؟"

امراؤ "کبھی نہیں۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھتے ہیں؟"

رسوا۔ اس لیے کہ فیض علی نے جو وہ سہارا دیا تھا۔ اسی سے آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا۔

امراؤ: "یہ تو کھلی ہوئی بات ہے۔"

رسوا: "کھلی ہوئی بات تو ہے۔ مگر اس میں ایک باریکی بھی ہے۔"

امراؤ: "وہ باریکی کیا ہے، خدا کے لیے جلدی کہیے۔"

رسوا: "فیض علی کے ساتھ نکل جانا وعدہ کرنے سے پہلے آپ کے دل میں ٹھن گیا تھا۔ اب دل بہانے ڈھونڈھ رہا تھا کہ کیونکر نکل جاؤں۔"

امراؤ: "نہیں یہ بات نہ تھی۔ میں ڈانوا ڈول ہو رہی تھی کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ گوہر مرزا کے بے وقت چھیڑنے اور بوا حسینی کی زبردستی سے میں نے جانے کا قصد کر لیا تھا بلکہ اس وقت تک کچھ یوں ہی سا ارادہ تھا۔ جب تک رات کو فیض علی آئے تھے ان کی صورت اور مستعدی دیکھ کے یکا ارادہ ہو گیا تھا۔"

رسوا: "جی نہیں۔ پہلے ہی سے قصد مصمم ہو چکا تھا۔ اسی لیے گوہر مرزا کا چھیڑنا اور بوا حسینی کی ضد آپ کو بڑی معلوم ہوئی۔ ورنہ یہ معمولی باتیں تھیں۔ ایسا تو اکثر ہوا کرتا ہوگا۔"

امراؤ: "میں نے مانا کہ ایسا ہوگا۔ اچھا پھر وہ منع کرنے والا کون تھا۔ میں سچ کہتی ہوں کہ چلتے چلتے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی کان میں کہہ رہا ہے "امراؤ نہ جا۔ کہا مان۔" جس وقت دو تین زینے اتر چکی ہوں اس وقت تو ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی ہاتھ پکڑ کے کھینچے لیتا ہے کہ نہ جا مگر میں نے نہ مانا۔"

رسوا: "یہ روکنے والا بڑا زبردست تھا۔ اسی کا حکم نہ ماننے کی تو آپ نے سزا بھگتی۔"

امراؤ: "اچھا میں سمجھی۔ یہ وہ چیز ہے جو نیک کاموں کی ہدایت کرتی ہے اور برے کاموں سے روکتی ہے۔"

رسوا: "جی نہیں۔ یہ وہ نہیں تھی۔ خانم کے مکان پر رہنا کونسا اچھا کام تھا۔

آپ کی باتوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ بدکاری کو ہمیشہ برا سمجھتی رہی ہیں اگرچہ آپ کی حالت نے آپ کو ایسا کرنے پر مجبور کر دیا۔ پھر خانم کے مکان پر رہنے سے ایک شخص کا ساتھ دے کے اُس کا پابند ہو جانا بدرجہا بہتر تھا۔

بات یہ تھی کہ فیض علی کے حسنِ سلوک نے آپ کو اُس کے ساتھ نکل جانے کی ترغیب دی تھی۔ قیافہ شناسی کے شوق اور اس میں کسی قدر ملکہ ہو جانے سے آپ اچھی خاصی مردم شناس ہو گئی تھیں۔"

عیش باغ میں لوگوں کے چہرے دیکھنے کا حال میں نے بڑے غور سے سنا تھا فیض علی کے کرتوت آپ پر ظاہر نہ تھے۔ مگر اس کی شکل و شمائل رفتار و گفتار سے آپ کے دل کو آگاہی ہو گئی تھی کہ اس کے ساتھ جانے میں کچھ نہ خطرہ ضرور ہے۔ مگر اس کی فریب کی باتوں اور روپیہ کے لالچ نے آپ کی آنکھوں پر پردے ڈال دیئے تھے افسوس اگر آپ علم مردم شناسی کے اصول سے واقف ہوتیں تو کبھی اُس کے دام میں نہ آتیں۔"

امراؤ۔" میں پڑھوں گی کسی کتاب کا نام لیجئے۔

خانم کا مکان چوک میں بہت ہی محفوظ جگہ ہے۔ پچھم کی طرف بازار ہے۔ اتر دکھن اونچی اونچی رنڈیوں کے گھرے ہیں۔ ایک طرف بیبا جان کا مکان ہے۔ دوسری طرف حسین باندی رہتی ہیں۔ پچھواڑے میر حسین علی صاحب کا دیوان خانہ ہے۔ غرضکہ کسی جانب سے چور کا لگاؤ نہیں ہے۔ اس پر بھی تین پاسی نوکر تھے جو رات بھر کوٹھوں پر پھرتے تھے۔ جب سے فیض علی کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ مکا پاسی خاص میرے کمرے کے دروازہ پر رہتا تھا۔ کیونکہ فیض علی رات گئے آتے تھے اور پہر رات سے چلے جاتے تھے۔ دروازہ بند کرنے اور قفل لگانے کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔

شب کو حسب وعدہ فیض علی آئے۔ تھوڑی دیر تک چپکے چپکے نکلنے کے مشورے ہوا کیے۔ اتنے میں مکا نے انگڑائی لی۔ معلوم ہوا کہ جاگ رہا ہے۔ فیض علی نے اسے

کمرے میں بلایا۔" ایک روپیہ انعام لو۔ تم کو ہم نے کچھ نہیں دیا تھا۔ دروازہ بھیڑ دینا۔ ہم جاگ رہے ہیں کوئی ڈر نہیں۔"

مکا سلام کر کے کمرے کے باہر نکلا۔ فیض علی نے کہا "لو اب چلو" میں اٹھی۔ دو جوڑے کپڑے دن ہی سے گٹھری میں باندھ رکھے تھے۔ زیور کا صندوقچہ میں نے پہلے ہی سے کھسکا دیا تھا۔ گٹھری بغل میں دبائی اکبری دروازہ کی طرف کا راستہ لیا۔ نخاس میں بیل گاڑی پہلے ہی سے کھڑی کی گئی تھی۔ ہم دونوں سوار ہوئے۔ اور چل نکلے۔ ہنڈولے کے ناکہ سے تھوڑی دور جا کے فیض علی کا سائیس گھوڑا لیے ہوئے ملا۔ وہ بھی بہل کے ساتھ ہو لیا صبح ہونے ہوتے موہن لال گنج پہنچے۔ یہاں سرا میں دوپہر تک قیام کیا۔ بھٹیاری سے کھانا پکوا کے کھایا۔

دال ارہر کی بے نمک پھیکی

مطلقاً جس میں بو نہ تھی گھی کی

تیسرے دن رائے بریلی میں داخل ہوئے۔ یہاں سفر کیلئے مناسب کپڑا خریدا میرے دو جوڑے بنوائے۔ لکھنؤ سے جو کپڑے پہن کے آئی تھی اتار کے گٹھری میں باندھے۔

رائے بریلی سے بیل گاڑی کو جو لکھنو سے آئی تھی۔ رخصت کیا۔ دوسری گاڑی کرایہ کی۔ لال گنج کی طرف روانہ ہوئے۔ یہ قصبہ رائے بریلی سے کوئی نو دس کوس کے فاصلے پر ہے۔ شام کو لال گنج پہنچ گئے۔ رات بھر سرائے میں رہے۔ فیض علی ضروری سودے سلف کو بازار گئے۔ جس کوٹھری میں ہم تھے۔ اس کے پاس والی کوٹھری میں ایک دیہاتی رنڈی اتری ہوئی تھی نصیبن نام تھا۔ گہنے پاتے سے درست تھی۔ کپڑے بھی اچھے تھے۔ تھی تو دیہاتی مگر زبان بہت صاف تھی۔ لب و لہجہ قصبانیوں کا ایسا تھا۔ میرے اس کے دیر تک باتیں ہوا کیں۔

نصیبن: ”آپ کہاں سے آئی ہیں؟“

میں: ”فیض آباد سے۔“

نصیبن: ”فیض آباد میں تو میری بہن پیارن رہتی ہے۔ آپ ضرور جانتی ہونگی۔“

میں: ”(آخر پہچان گئی ناکہ میں بھی رنڈی ہوں!) میں کیا جانوں۔“

نصیبن: ”فیض آباد میں کون ایسی بتریا ہے جو ہم کو نہیں جانتی۔“

میں: ”بہت دنوں سے ان کے گھر بیٹھ گئی ہوں۔ یہ لکھنؤ میں رہتے ہیں اسی لیے میں بھی اکثر وہیں رہتی ہوں۔“

نصیبن: ”آخر پیدائش تو تمہاری فیض آباد کی ہے۔“

میں: ”(یہ تو بالکل سچ کہتی ہے۔ اب کیا جواب دوں) ہاں پیدا تو وہاں ہوئی مگر بچپنے سے باہر رہی۔“

نصیبن: ”تو فیض آباد میں کسی کو نہیں جانتی؟“

میں: ”کسی کو نہیں۔“

نصیبن: ”یہاں کیونکر آنا ہوا؟“

میں: ”ان کے ساتھ ہوں۔“

نصیبن: ”اور جاؤ گی کہاں؟“

میں: ”اناؤ۔“

نصیبن: ”لکھنؤ ہوتی ہوئی آتی ہو؟“

میں: ”ہاں۔“

نصیبن: ”پھر سیدھا راستہ چھوڑ کے ادھر بھیڑ میں کہاں آئی ہو۔ نرپت گنج ہو کے اناؤ چلی گئی ہوتیں۔“

میں: ”رائے بریلی میں ان کا کچھ کام تھا۔“

نصیبن: ”بہن تم نے سنا کہاں کہ ادھر کا راستہ بہت خراب ہے۔ ڈاکوؤں کے مارے مسافروں کی آمد و رفت بند ہے۔ پلیہ کی بھیڑ میں سیکڑوں کو لوٹ لیا۔ اناؤ کا راستہ ادھر سے بہت ہو کے ہے۔ تم تین آدمی ہو جس میں

دو مرد ایک عورت ذات۔ تمہارے ہاتھ گلے میں گہنا بھی ہے۔ وہاں تمہاری کیا خفیف بات ہے۔ یہاں تو برائیں لٹ جاتی ہیں۔"

میں:"تن بہ تقدیر۔"

نصیبن:"بڑی دل کی کڑی ہو۔"

میں:"پھر کیا کروں؟"

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں جن کا دہرانا کوئی ضروری نہیں۔ اور نہ مجھے یاد ہیں ہاں میں نے پوچھا "تم کہاں جاؤ گی؟"

نصیبن:"ہم تو گدائی کو نکلے ہیں۔"

میں:"نہیں سمجھی۔"

نصیبن:"اے لو گدائی نہیں جانتیں کیسی پتر یا ہو۔"

میں:"بہن میں کیا جانوں گدائی تو بھیک مانگنے کو کہتے ہیں۔"

نصیبن:"ہمارے دشمن بھیک مانگیں۔ اور سچ پوچھو تو میں کہوں۔ پتریا کی ذات بھیک منگنی ہے اس میں ڈیرے دار ہو یا نہ ہو۔"

میں:"ہاں سچ تو ہے مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ گدائی کسے کہتے ہیں۔"

نصیبن:"سال میں ایک مرتبہ ہم لوگ گھر سے نکل کے گاؤں گاؤں پھرتے ہیں۔ امیر رئیسوں کے مکان پر جا کے اترتے ہیں۔ جو کچھ جس کے مقدر میں ہوتا ہے ہمیں دیتا ہے۔ کہیں مجرا ہوتا ہے کہیں نہیں ہوتا۔

میں:"اچھا اس کو گدائی کہتے ہیں۔"

نصیبن:"ہاں اب سمجھیں۔"

میں:"یہاں کسی رئیس کے یہاں آئی ہو؟"

نصیبن:"یہاں سے تھوڑی دور پر ایک شمبھو دھیان سنگھ راجہ کی گڑھی ہے۔ انہیں کے پاس گئی تھی۔

راجہ صاحب کو بادشاہی حکم پہنچا ہے۔ ڈاکوؤں کے بندوبست کو گئے ہوئے ہیں۔ کئی دن ٹھہری رہی۔ آخر دم گھبرایا یہاں چلی آئی۔ یہاں سے دو کوس پر ایک گاؤں ہے۔ سمریہا۔ وہ گاؤں بالکل پتریوں کا ہے۔ وہاں میری خالہ رہتی ہیں کل ان کے پاس جاؤں گی۔"

میں: "پھر کہاں جاؤ گی؟"

نصیبن: "وہیں ٹھہری رہوں گی۔ جب راجہ صاحب آجائیں گے تو پھر گڑھی کو جاؤنگی اور بہتسے ڈیرے بھی ان کے انتظار میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

میں: "کیا راجہ صاحب کو ناچ مجرے کا بھی شوق ہے؟"

نصیبن: "بہت شوق تھا۔"

میں: "کیوں۔ اب کیا ہوا؟"

نصیبن: "جب سے ایک پتریا لکھنؤ سے لائے ہیں ہم لوگوں کی کوئی قدر نہیں رہی۔"

میں: "اس پتریا کا کیا نام ہے؟"

نصیبن: "نام تو مجھ کو یاد نہیں صورت دیکھی ہے۔ گوری گوری سی ہے ذرا چہرے مہرے کی اچھی ہے۔"

میں: "گانی خوب ہو گی؟"

نصیبن: "خاک گانا وانا نہیں آتا۔ ہاں ناچتی ذرا اچھا ہے۔ راجہ صاحب اس پر لٹو ہیں۔"

میں: "کتنے دنوں سے وہ پتریا آئی ہے؟"

نصیبن: "کوئی چھ مہینے ہوتے ہوں گے۔"

رات کو میں نے فیض علی سے راستہ کی خرابی کا حال بیان کیا۔ انہوں نے کہا۔ خاطر جمع رکھو ہم نے بندوبست کر لیا ہے۔

(۱۳)

دوسرے دن منہ اندھیرے موہن لال گنج کی سرا سے روانہ ہوئے۔ نصیبن کی گاڑی پیچھے پیچھے تھی۔ فیض علی گھوڑے پر سوار تھے۔ ہم اور نصیبن باتیں کرتے جاتے تھے۔ تھوڑی دور جا کے سریہا ملا۔ نصیبن نے دور سے ہم کو وہ گاؤں دکھایا۔ سڑک کے کنارے کھیت تھے۔ ان میں کچھ گنواریاں پانی دے رہی تھیں۔ کچھ کھیت نرا رہی تھیں۔ ایک پیمانی چل رہی تھی۔ اس میں ایک مشٹنڈی عورت دھوتی باندھے بیل ہنکا رہی تھی۔ ایک پر لے رہی تھی۔ نصیبن نے کہا یہ سب ہنریاں ہیں۔ میں نے دل میں کہا: واہ پیشہ بھی کیا پھر اس قدر محنت جو مردوں سے مشکل ہو آخر ان کو ہنریاں ہونا کیا ضرور تھا۔ مگر ان کی صورتیں بھی ایسے ہی کاموں کے لائق ہیں۔ لکھنؤ میں جو گنڈے تعویذ والیاں گھوسنیں آتی ہیں۔ ان کی شکل بھی ایسی ہی ہوتی ہے۔ نصیبن یہاں سے رخصت ہوئی۔

کوئی دوس جا کے ایک نشیب ملا۔ جابجا بیہڑ، بڑے بڑے غار۔ سامنے ندی کا کنارہ نظر آیا۔ دونوں طرف دور تک گنجان درختوں کی قطار تھی۔ جب ہم اس موقع پر پہنچے ہیں دھوپ اچھی طرح نکل چکی تھی۔ کوئی پہر بھر دن چڑھا ہوگا۔ اس سڑک پر سوا ہمارے اور کوئی راستہ چلنے والا دکھائی نہ دیتا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ ندی کے پاس پہنچ کے فیض علی نے گھوڑا آگے بڑھا دیا۔ میں روکتی کی روکتی رہ گئی۔ یہ جا وہ بہت دور نکل گئے۔ تھوڑی دور تک گھوڑا نظروں سے غائب رہا۔ پھر ندی کے اس پار جا کے معلوم ہوا۔

ہماری گاڑی اسی طرح چلی تھی۔ گاڑی بان گاڑی ہانک رہا تھا۔ سائیس گھوڑے کے پیچھے دوڑا چلا گیا تھا۔ اب میں ہوں اور وہ گاڑی بان ہے۔ اتنے میں میں نے دور سے دیکھا کہ دس پندرہ گنوار گاڑی کی طرف دوڑے چلے آتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا خدا خیر کرے۔ تھوڑی دیر میں گنواروں نے آ کر گھیر لیا۔ سب تلواریں باندھے ہوئے تھے۔ بندوقیں کندھے پر تھیں توڑے سلگ رہے تھے۔

گنوار۔ (گاڑی بان سے) گاڑی روک۔ کون ہے گاڑی میں؟

گاڑی بان "یہ سواری بریلی سے آئی ہے۔ ؟ ناؤ کا بھاڑا کیا ہے"

گنوار: "روک گاڑی"

گاڑی بان گاڑی کیوں روکیں۔ خانم صاحب کے یہاں کی زنانی سواری ہے۔"

گنوار "یہ کوئی مرد ساتھ نہیں ہے؟"

گاڑیبان "مرد آگے بڑھ گئے ہیں آتے ہونگے"

گنوار "اتر دبی گاڑی سے"

ایک "پردہ کھول کے کھینچ دوسری پنڑیا تو ہے اس کا پردہ کون"

ایک گنوار آگے بڑھا۔ گاڑی کا پردہ الٹ کے مجھے گاڑی سے اتارا۔ بیں آدمی مجھے گھیر کے کھڑے ہوگئے۔ اتنے میں ندی کی طرف سے گرد اٹھی اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ جب میں نے دیکھا آگے فیض علی کا گھوڑا ہے پیچھے اور دس پندرہ سوار ہیں۔ گنواروں نے دیکھتے ہی بندوقوں کی ایک باڑ ماری۔ اس میں دو سوار ادھر کے گر پڑے۔ پھر تلواریں میانوں سے نکالیں۔ سوار سر پر ہی آگئے تھے۔ ادھر سے بھی تلواریں کھنچ گئیں۔ دو، ایک ایک ہاتھ چلے ہوں گے۔ تین گنوار ادھر سے زخمی ہو کر گرے۔ ایک سوار اور ادھر گرا۔ گنوار بھاگ نکلے۔ اچھا کہاں جاؤ گے، یہ کچھو ندی اس کے پار کیا ہوتا ہے۔

گنواروں کے جانے کے بعد میں پھر گاڑی میں بیٹھی۔ جس سوار کے زخم آیا تھا اس کے پٹیاں کسی گئیں وہ بھی گاڑی میں میرے ساتھ بٹھایا گیا۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ اب دو سوار ہماری گاڑی کے ادھر ادھر ہیں کچھ سوار آگے ہیں کچھ پیچھے ہیں۔

فیض علی۔ (اپنے ساتھی سے) بھائی کسی طرح لکھنؤ سے نکلنا ہی نہیں ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کے آیا ہوں۔

فضل علی۔ "یہ نہیں کہتے عیش میں پڑے تھے!"

فیض علی "یہ تو کہو گے ہاں!"

فضل علی "کہیں گے کیا تحفہ بھی تو ساتھ ساتھ ہے ذرا بھابی صاحب کو ہم بھی تو دیکھیں"

فیض علی: "آپ سے کیا پردہ ہے۔ دیکھیے"

فضل علی "ڈیرے پر چل کے بامراد دیکھیں گے"

اتنے میں گاڑی ندی کے کنارے پہنچی۔ کنارہ بہت اونچا تھا۔ مجھ کو گاڑی سے اتر کے پیدل چلنا پڑا۔ بڑی مشکل

سے گاڑی دوسرے کنارے تک پہنچی۔ جو زخمی سوار گاڑی پر تھا اس کے زخم گاڑی کی دھکوں سے کھل گئے تھے۔ تمام گاڑی میں خون ہی خون تھا یہ نا بھی اس پار جا کے زخم پھر سے باندھے گئے۔ گاڑی دھوئی گئی پھر میں گاڑی میں سوار ہوئی۔ اب قریب دوپہر کے دن آ گیا تھا مجھے شدت سے بھوک لگی ہوئی تھی گاڑی اسی طرح چل رہی تھی۔ ان لوگوں کا ڈیرا کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ندی سے کوئی چار کوس پر جا کے ایک گاؤں کے پاس ایک باغ تھا۔ اس میں چھولداریاں پڑی ہوئی تھیں گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ لوگ ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ کچھ لوگ کھانا پکا رہے تھے۔ یہاں آ کے ہماری گاڑی رکی ہمارے ساتھ کے سوار دنکو دیکھتے ہی ایک آدمی اس پڑاؤ سے آگے بڑھا اس نے کچھ فضل علی کے کان میں کہا فضل علی کے چہرے سے تشویش کے آثار نمایاں ہونے تھے۔ وہ فیض علی کے پاس گھوڑا بڑھا کے آئے فیض علی سے چپکے چپکے باتیں ہوئیں۔

فیض علی: "اچھا دیکھا جائے گا۔ کھانا تو کھا لو۔

فضل علی: کھانا کھانے کی مہلت نہیں ایسے ہی نکل چلو۔"

فیض علی: "اچھا جب تک چھولداریاں اکھاڑی جاتیں۔ گھوڑوں پر کسے جائیں ہم لوگ کھانا کھا لیں۔"

میں گاڑی سے اتری۔ آم کے درخت کے نیچے دری بچھا دی گئی سالن کی پتیلیاں لا کے رکھی گئیں تھی کی تھی روٹیاں موٹی موٹی تو کر لوں میں آئیں میں فیض علی اور فضل علی نے تین آدمیوں نے مل کے کھانا کھایا۔ کھانا کھاتے وقت اگرچہ تشویش کے آثار تھے۔ مگر ہنسی مذاق ہوتا جاتا تھا۔

جتنی دیر میں ہم لوگوں نے کھانا کھایا چھولداریاں اکھاڑ کے ٹٹوؤں پر لادی گئیں۔ زین کسے گئے۔ آخر قافلہ چل نکلا۔

دو ہی تین کوس گئے ہوں گے کہ بہت سے سوار اور پیدلوں نے آ کر گھیر لیا ادھر بھی سب پہلے سے مستعد تھے دونوں طرف گولیاں چلنے لگیں۔ اس لڑائی میں فیض علی میری گاڑی کے آس پاس رہے۔ میں گاڑی کے اندر بیٹھی دعائیں پڑھ رہی ہوں کلیجہ ہاتھوں اچھل رہا ہے دیکھئے کیا ہوتا ہے کبھی کبھی گاڑی کا پردہ کھول کے دیکھ لیتی ہوں یہ گرا وہ مرا۔ آخر دونوں طرف سے بہت سے زخمی ہوئے۔ ہمارے ساتھ پچاس ساٹھ آدمی تھے۔ راجہ دھیان سنگھ کے آدمی بہت سے تھے ایک پر دس ٹوٹ پڑے۔ بہت سے زخمی ہوئے فضل علی اور فیض علی موقعہ پاکر نکل گئے۔ دس بارہ آدمی اور گرفتار ہوئے۔ انہیں گرفتاروں میں بھی میں تھی۔

(۱۴)

ہم لوگوں کی گرفتاری کے بعد گاڑیبان نے منت سماجت کر کے رہائی حاصل کی۔ زخمی سواروں کو میدان میں ڈال دیا جہاں اور لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ تو اپنی جان لیکے بریلی کیطرف راہی ہوا۔ مردوں کی مشکیں کسی گئیں۔ گڑھی کیطرف روانہ ہوئے۔ گڑھی وہاں سے کوئی پانچ کوس تھی۔ تھوڑی دور جاکے راجہ صاحب اور انکے ساتھ کے اور لوگ ملے۔ راجہ صاحب خود گھوڑے پر سوار تھے ہم لوگ سامنے گئے۔ میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

راجہ: "یہی بی بی صاحبہ لکھنؤ سے آئی ہیں؟"

میں: "(ہاتھ باندھ کے) حضور قصوروار تو ہوں لیکن اگر غور کیجئے تو ایسا قصور بھی نہیں۔ خود ذات شنت جل فریب سے آگاہ نہیں۔ میں کیا جانتی تھی؟"

راجہ: "اب بے قصوری ثابت کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔ قصور آپکا ثابت ہے۔ جو باتیں آپ سے پوچھی جائیں انکا جواب دیجئے"

میں: "جو حکم حاکم"

راجہ: "لکھنؤ میں کہاں مکان ہے؟"

میں: "ٹکسال میں"

راجہ: (آدمیوں کو اشارہ کر کے) "دیکھو تم کھیڑے سے ایک بہل گاڑی بیلو۔ لکھنؤ کی رنڈیاں ہیں ہمارے دیس کی پتریاں نہیں ہیں کہ رات بھر محفل میں ناچیں اور برات کے ساتھ دس دس کوس تک ناچتی چلی جائیں۔"

میں: "حضور کو خدا سلامت رکھے"

آدمی گئے گڑھی سے گاڑی لے آئے مجھے گاڑی پر بٹھایا اور لوگ اسی طرح مشکیں کسے ساتھ ساتھ تھے گڑھی میں پہنچکر وہ لوگ نہیں معلوم کہاں بھیجدیئے گئے۔ میں کوٹ میں بلائی گئی۔ علیحدہ مکان رہنے کو دیا گیا۔ دو آدمی خدمت کو مقرر ہوئے۔ پکا پکایا کھانا پوریاں کچوریاں مٹھائیاں طرح طرح کے اچار کھانیکو۔ لکھنؤ سے چھوٹنے کے بعد آج رات کو کھانا سیر ہو کے کھایا۔ دوسرے دن صبح کو معلوم ہوا کہ اور قیدی لکھنؤ کو روانہ کر دیئے گئے۔ مجھکو رہائی کا حکم ہے مگر ابھی راجہ صاحب رخصت نہیں کرینگے۔ پہر دن چڑھے راجہ صاحب نے بلا بھیجا۔

راجہ: "پچھتاوا ہم نے تمکو رہا کیا۔ فیضو اور فضل علی دونوں بدمعاش نکل گئے اور سب نابکار جو گرفتار ہوئے لکھنؤ پہنچکر

اپنی سزا کو پہنچیں گے۔ بے شک تمہارا کوئی قصور نہیں ہے مگر آئندہ ایسے لوگوں سے نہ ملنا۔ اگر تمہارا جی چاہے چار دن یہاں رہو۔ ہم نے تمہارے گانے کی بہت تعریف سنی ہے۔"

میں (نصیبن کی وہ بات یاد آئی کہ راجہ صاحب کے پاس لکھنؤ کی رنڈی ہے ہو نہ ہو اسی نے میری تعریف کی ہوگی)

"حضور نے کس سے سنا؟"

راجہ: "اچھا یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔"

تھوڑی دیر کے بعد لکھنؤ کی وہ رنڈی طلب ہوئی۔ لکھنؤ کی رنڈی کون؟ خورشید جان۔ خورشید دوڑ کے مجھ سے لپٹ گئی دونوں ملکے رونے لگے۔ آخر راجہ صاحب کے خوف سے فوراً علیحدہ ہو کر سامنے مؤدب بیٹھ گئے۔ ساز ندے طلب ہوئے۔ رہائی کی خبر سنکے میں نے ایک غزل کہہ لی تھی۔ بہت سے شعر تھے جو شعر یاد آتے ہیں سنائے دیتی ہوں۔ ہر ایک شعر پر راجہ صاحب اور حاضرین جلسہ بہت ہی محظوظ تھے۔ بے خودی کا عالم تھا۔ غزل یہ ہے

قیدی الفت صیاد رہا ہوتے ہیں — خوشنوایان چمن زاد رہا ہوتے ہیں

تو کبھی چھوڑے تو تری زلف نہ چھوڑے ہم کو — کوئی ہم سے ستم ایجاد رہا ہوتے ہیں

حسرت ذوق اسیری کہ خفا ہے صیاد — آج ہم بادل ناشاد رہا ہوتے ہیں

خاطر نازک صیاد کو برداشت نہیں — باعث نالہ و فریاد رہا ہوتے ہیں

غم دنیا نہ سہی اور ہزاروں غم ہیں — قید ہستی سے کب آزاد رہا ہوتے ہیں

کیوں نہ فخر آئے ہمیں ناز گرفتاری پر — ہم نوائے لذت بیداد رہا ہوتے ہیں

اے ادا قید محبت سے رہائی معلوم — کب اسیر غم صیاد رہا ہوتے ہیں

مقطع سن کے راجہ صاحب نے پوچھا ادا کس کا تخلص ہے؟

خورشید نے کہا: "خود انہیں کی کہی ہوئی ہے۔" راجہ اور بھی خوش ہوتے۔

راجہ: "اگر ایسا جانتے تو ہم آپ کو ہرگز نہ رہا کرتے۔"

میں: "غزل سے حضور کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اسی کا تو افسوس ہے مگر اب تو حضور حکم دے چکے اور یہ لونڈی آزاد ہو چکی۔"

اس کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔ راجہ صاحب اندر رسوئی کھانے چلے گئے۔ خورشید سے مجھ سے خوب باتیں ہوئیں۔

خورشید: "دیکھو بہن! میرا کوئی قصور نہیں۔ خانم صاحب اور راجہ صاحب سے بہت دنوں سے لاگ ڈانٹ تھی۔ راجہ صاحب نے کئی مرتبہ مجھ کو بلوایا۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ آخر عیش باغ میں میلے ہو رہے تھے وہاں سے زبردستی اٹھا لائے۔ جب سے یہیں ہوں۔ ہر طرح کی میری خاطر ہوتی ہے سب طرح کا آرام ہے۔"

میں: "موئے گنواروں میں خوب تمہارا جی لگتا ہے!"

خورشید: "یہ بات سچ ہے مگر میری طبیعت کو جانتی ہو۔ روز ایک نئے شخص کے پاس جانا بالکل خلاف ہے

وہاں بھی کرنا پڑتا تھا۔ خانم کو جاتی ہو۔ یہاں صرف راجہ صاحب سے سابقہ ہے اور سب میرے حکم کے تابع ہیں۔ دوسرے یہ میرا وطن ہے یہاں کی ہر چیز مجھے اچھی معلوم ہوتی ہے۔

میں: تو تمہارا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہیں ہے؟

خورشید۔ مجھے تو معاف کرو۔ یہاں اچھی طرح ہوں۔ بلکہ تم بھی یہیں رہو۔

میں:۔ یہاں تو نہ رہوں گی۔ مجبوری کی اور بات ہے۔

خورشید:۔ لکھنؤ جاؤ گی؟

میں: نہیں

خورشید:۔ پھر کہاں

میں:۔ جہاں خدا لے جائے۔

خورشید:۔ ابھی کچھ دنوں رہو۔

میں: ہاں ابھی تو ہوں۔

پندرہ بیس دن تک میں گڑھی میں رہی۔ خورشید سے روزانہ ملتی تھی۔ خورشید کا دل وہاں لگا ہوا تھا۔ میرا جی بہت گھبراتا تھا۔ آخر راجہ صاحب سے میں نے عرض کیا۔

میں: حضور نے مجھے حکم رہائی دیا ہے؟

راجہ:۔ ہاں تو پھر کیا جانا چاہتی ہو؟

میں:۔ جی ہاں۔ اب لونڈی کو رخصت کیجئے۔ پھر حاضر ہوں گی۔

راجہ:۔ یہ لکھنؤ کے فقرے ہیں۔ اچھا کہاں جاؤ گی؟

میں:۔ کانپور۔

راجہ:۔ لکھنؤ نہ جاؤ گی؟

میں :- حضور لکھنؤ کیا منہ لے کے جاؤں گی۔ خانم سے کیسی شرمندگی ہوگی، ساتھ والیاں کیا کیا ہنسیں گی۔

اول تو میرا ارادہ لکھنؤ جانے کا نہ تھا۔ دوسرے یہ بھی خیال تھا۔ کہ لکھنؤ جانے کو اگر راجہ صاحب سے کہوں گی تو شاید رہائی نہ ہوگی کیوں کہ وہاں جانے سے خورشید کا حال کھل جاتا۔ شاید خانم کوئی آفت برپا کرتیں۔

راجہ صاحب میرے اس اس ارادے سے بہت خوش ہوئے۔

راجہ :- تو لکھنؤ کبھی نہ جاؤ گی؟

میں :- لکھنؤ میں میرا کون بیٹھا ہے۔ گانے بجانے کا پیشہ ہے۔ جہاں رہونگی کوئی نہ کوئی قدردان نکل ہی آئے گا۔ خانم کی قید میں اب مجھے رہنا منظور نہیں۔ اگر وہاں رہنا ہوتا تو نکل کیوں آتی۔ میں نے راجہ صاحب کو یقین دلایا کہ میں لکھنؤ ہرگز نہ جاؤں گی۔

دوسرے دن راجہ صاحب نے مجھے رخصت کیا۔ دس اشرفیاں انعام دیں۔ ایک دو شالہ دیا، ایک رومال، ایک رتھ مع تین بیل کے۔ غرضکہ مجھے ڈیڑھ دار پتریا بنا دیا ایک گاڑی بان اور دو آدمی میرے ساتھ کئے۔ آناؤ کو روانہ ہوئی۔ وہاں پہنچ کر سالار وکٹیارے کے مکان پر ٹھہری۔ راجہ صاحب کے آدمیوں کو رخصت کیا صرف گاڑی بان رہ گیا۔

سر شام میں اپنی کوٹھری کے سامنے بیٹھی ہوں۔ مسافر آتے جاتے ہیں۔ بھٹیاریاں چلا رہی ہیں۔ میاں مسافر ادھر ادھر۔ مکان جھاڑا ہوا ہے۔ حقہ پانی کو آرام۔ گھوڑے ٹٹو کے لئے نیم کا ساتھ.....

اتنے میں کیا دیکھتی ہوں کہ فیض علی کا سائیس چلا آتا ہے سرائے کے پھاٹک ہی سے اس کی نگاہ مجھ پر پڑی میری اس کی آنکھیں چار ہوئیں وہ میرے پاس چلا آیا۔ باتیں کرنے لگا میں نے فیض علی کا حال پوچھا اس نے کہا ان کو آپ کے آناؤ آنے کی خبر مل گئی ہے آج رات کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے ضرور

آجاویں گے۔

یہ سن کے میرا دل دھڑکنے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ مجھے اب فیض علی کا ساتھ منظور نہ تھا۔ تمت کھیڑے کے واقعہ کے بعد میں سمجھی تھی کہ اب گلو خلاصی ہو گئی۔ اناؤ میں فیض علی جان پر نازل ہو گئے۔ معمولی بات چیت کی۔ اناؤ سے روانگی کا مشورہ ہونے لگا۔ بڑی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ آخر یہ صلاح ٹھہری کہ گاڑی بان کو رخصت کرو۔ سائیس گاڑی ہنکائے گا۔ میں خود گھوڑے کو دیکھ لوں گا۔ پھر یہ ٹھہری کہ گاڑی سلارو بھٹیارے کے پاس چھوڑ دو۔ راتوں رات گنگا کے اس پار اتر چلو۔ اب کیا کر سکتی تھی۔ فیض علی کے بس میں تھی۔ جو انہوں نے سلارو کو لیا! ۔ کنارے لے جا کر دیر تک باتیں کیں۔ کوئی آدھی رات گئے اپنے ساتھ مجھے گھوڑے پر بٹھایا۔ سرائے سے باہر ہوئے۔ پانچ چھ کوس زین کا چلنا۔ رات کا وقت میرا بند بند ٹوٹ گیا۔ مدتوں درد رہا۔ آخر جوں توں کر کے گنگا کے کنارے پہنچے۔ بڑی مشکل سے ناؤ تلاش کی۔ اس پار اترے، فیض علی نے کہا "اب کوئی خوف نہیں ہے۔" صبح ہوتے ہوتے کانپور پہنچ گئے فیض علی نے مجھ کو لاکھنی محال میں اتارا خود مکان کی تلاش میں نکلے۔ تھوڑی دیر کے بعد آ کے کہا "یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں ہے۔ مکان ہم نے ٹھہرا لیا ہے وہاں چلی چلو۔" ڈولی کرایہ کی کی۔

تھوڑی دیر میں ڈولی ایک پختہ عالیشان مکان کے دروازہ پر ٹھہری۔ فیض علی نے ہم کو یہاں اتارا۔ مکان کے اندر گیا دیکھتی ہوں کہ ایک دالان میں صاف کھری چارپائیاں پڑی ہیں۔ ایک چٹائی بچھی ہے اس پر ایک مجھے نفرت ہو گئی۔ مکان کا خرخشہ دیکھ کے دل کو وحشت ہونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد فیض علی نے کہا "اچھا تو میں بازار سے کچھ کھانے کو لے آؤں۔" میں نے کہا "بہتر ہے، مگر ذرا جلدی آنا۔" فیض علی بازار کو گئے میں اسی میں اکیلی بیٹھی ہوں۔

اب سنئے! فیض علی بازار جو گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ نہ آج آتے ہیں نہ کل۔ ایک گھڑی دو گھڑی۔ پہر دو پہر کہاں تک کہوں، دوپہر گذری، شام ہونے کو آئی۔ اناؤ میں سرِ شام کھانا کھایا تھا۔ رات کو گھوڑے پر چلنے کی تکان، نیند کا خمار، صبح سے منہ پہ چلو پانی تک نہیں پڑا۔ ٹکڑا تک نہیں کھایا۔ بھوک کے مارے دم نکلا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں سورج ڈوب گیا۔ اندھیرا ہونے لگا۔ آخر رات ہوگئی۔ یا خدا اب کیا کروں۔ منہ کھول دیا۔ اٹھ بیٹھی۔ اتنا بڑا ڈھنڈار مکان بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ ہیہات خدا کی ذات اور میں اکیلی۔ یہ معلوم ہوتا تھا اب اس کوٹھری سے کوئی نکلا۔ وہ سامنے والے دالان میں کوئی ٹہل رہا ہے۔ کوٹھے پر دھم دھم کی آواز آئی۔ زینے سے کوئی کھٹ کھٹ اترتا چلا آتا ہے۔ دوپہر رات ہوگئی اب تک انگنائی اور دیواروں پہ چاندنی تھی۔ اب چاند بھی چھپ گیا۔ بالکل اندھیرا گھپ ہوگیا۔ آخر میں دوشالے سے منہ لپیٹ کے پڑ رہی ہے پھر کچھ کھٹکا ہوا رات پہاڑ ہوگئی۔ کاٹے نہیں کٹتی ہے۔ آخر جوں توں کرکے صبح ہوئی۔

دوسرے دن صبح کو تو عجیب ہی عالم تھا۔ اب لکھنؤ کی قدر ہوئی۔ دل میں کہتی تھی یا خدا کس مصیبت میں جان پڑی۔ لکھنؤ کا عیش چین اور اپنا کمرہ یاد آتا تھا۔ ادھر ایک آواز دی۔ آدھر آدمی مستعد۔ حقہ، پان، کھانا، پانی جو کچھ ہوا ادھر منہ کیا ادھر سامنے موجود خلاصہ یہ کہ آج بھی صبح سے دوپہر ہوگئی اور فیض علی نہ آئے۔ اس حالت میں اگر کوئی نیک بخت بی بی چار دیواری کی بیٹھنے والی ہوتی تو ضرور ہی گھٹ گھٹ کے مرجاتی۔ میرا ہواؤ کھلا ہوا تو نہ تھا مگر پھر بھی سینکڑوں مردوں میں بیٹھ چکی تھی۔ کانپور نہ سہی لکھنؤ کے تو اکثر گلی کوچوں سے واقف یہاں کی بھی سرا دیکھی تھی، بازار دیکھا تھا۔ اب میری بلا اس خالی مکان میں بیٹھی رہتی چھپ سے کنڈی کھول گلی میں نکل کھڑی ہوئی۔ دس بیس قدم گئی ہوں گی کہ دیکھتی

دیکھتی کیا ہوں کہ ایک شخص سرکاری وردی پہنے، گھوڑے پر سوار، دس پندرہ برقنداز ساتھ۔ ان کے حلقہ میں سیاں فیض علی، ہتھکڑیاں پڑی ہوئی، سامنے سے چلے آتے ہیں۔ یہ ماجرا دیکھتے ہی میں سُن سے ہو گئی۔ وہیں ٹھٹھک گئی۔ ایک پتلی سی گلی ملی۔ اس گلی میں ایک مسجد تھی۔ میں نے دل میں خیال کیا کہ اس سے بہتر خدا کا گھر ہے۔ تھوڑی دیر یہیں جا کے ٹھہرنا چاہیے۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بے دھڑک اندر چلی گئی، یہاں ایک مولوی صاحب سے سامنا ہوا۔ کالے سے تھے، سر منڈا ہوا۔ ایک نیلی تہمت باندھے ہوئے، دھوپ میں ٹہل رہے تھے۔ پہلے تو شاید سمجھے میں طاق بھرنے آئی ہوں، بہت ہی خوش ہوئے۔ جب میں جا کے چپکے صحن کے کنارے پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی تو قریب آ کے پوچھنے لگے "کیوں بی صاحب! آپ کا یہاں کیا کام ہے؟"

میں:۔ مسافر ہوں خدا کا گھر سمجھ کے تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئی ہوں۔ اگر آپ کو ناگوار ہو تو ابھی چلی جاؤں۔

مولوی صاحب اگرچہ بہت ہی بے ڈھنگے تھے مگر میری لگاوٹ اور دلفریب تقریر نے جادو کا اثر کیا۔ بھلا جواب کیا منہ سے نکلتا۔ بکتا بکا ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ میں سمجھ گئی کہ دام فریب میں آ گئے۔

مولوی:۔ (تھوڑی دیر بعد سنبھل کے) اچھا تو آپ کا کہاں سے آنا ہوا؟

میں:۔ جی کہیں سے آنا ہوا مگر بالفعل تو یہیں ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔

مولوی:۔ (بہت ہی گھبرا کے) مسجد میں؟

میں:۔ جی نہیں بلکہ آپ کے حجرے میں۔

مولوی:۔ لاحول ولا قوۃ۔

میں:۔ اُوئی۔ مولوی صاحب! مجھے تو آپ کے سوا۔ اور کوئی نظر نہیں آتا۔

مولوی:۔ جی ہاں۔ تو میں اکیلا رہتا ہوں۔ ابھی سے تو میاں نے کہا۔ مسجد میں آپ

کا کیا کام ہے؟

میں:- یہ کیا خاصیت ہے کہ جہاں آپ رہیں وہاں دوسرا نہیں رہ سکتا؟ مسجد میں ہمارا کچھ کام نہیں - یہ ڈھب کہیں - آپ کا کیا کام ہے؟

مولوی:- میں تو لڑکے پڑھاتا ہوں۔

میں:- آپ کو سبق دوں گی۔

مولوی:- لاحول ولا قوۃ۔

میں:- لاحول ولا قوۃ - یہ آپ ہر دفعہ لاحول کیوں پڑھتے ہیں - یہ کیا شیطان آپ کے پیچھے پھرتا ہے؟

مولوی:- شیطان آدمی کا دشمن ہے - اس سے ہر وقت ڈرنا چاہیے۔

میں:- خدا سے ڈرنا چاہیے، موئے شیطان سے کیا ڈرنا اور یہ کیا آپ نے کہا۔ آدمی ہیں؟

مولوی:- (ذرا بگڑ کے) جی ہاں اور کون ہوں؟

میں:- مجھے تو آپ جن معلوم ہوتے ہیں - اکیلے اس مسجد میں رہتے ہیں - آپ کا دل بھی نہیں گھبراتا ہے۔

مولوی:- پھر کیا کریں؟ ہمیں تو اکیلے کی عادت ہے

میں:- اسی سے تو آپ کے چہرے پر وحشت برستی ہے وہ آپ نے نہیں سنا

ع تنہا منشیں کہ نیم دیوانگی است

مولوی:- اجی وہ کچھ سہی جس حال میں ہم ہیں، خوش ہیں، آپ اپنا مطلب کہیے۔

میں:- مطلب تو کتاب دیکھنے سے حل ہوگا بالفعل زبانی مباحثہ ہے۔

مولوی:- چہ خوش!

میں :- چرا نہ باشد!

میں مولوی صاحب کو خوب جھنجھوڑیاں دیتی مگر اس وقت بھوک کے مارے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

رسوا :- یہ مولوی صاحب سے اس قدر مذاق کی کیا ضرورت تھی ؟

امراؤ :- اے ہے۔ اس کا حال نہ پوچھو بعض آدمیوں کی صورت ہی ایسی ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ ہنسنے کو جی چاہتا ہے۔

رسوا :- جی ہاں جیسے کسی کی منڈی ہوئی کھوپڑی دیکھ کر بعض آدمیوں کی ہتھیلی کھجلاتی ہے۔ چپت لگانے کو جی چاہتا ہے۔

امراؤ :- بس یہی سمجھ لیجئے۔

رسوا :- اچھا تو مولوی صاحب میں ایسی کونسی بات تھی جس سے مذاق کرنے کو جی چاہتا تھا ؟

امراؤ :- کیا کہوں کچھ بیان نہیں ہو سکتا۔ جوان آدمی تھے۔ صورت بھی کچھ بری نہ تھی۔ سانولی رنگت تھی، چہرے پر حونق پن تھا، سر پر لمبے لمبے بال تھے، منہ پر داڑھی تھی مگر کچھ ایسی بے تکے پن کی حد سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی۔ مونچھوں بالکل صفایا تھا۔ تہمت بہت اونچی بندھی ہوئی تھی۔ سر پر چھینٹ کی بڑی سی ٹوپی جو سر کی پوری چوھدی کو ڈھانکے ہوئے تھی۔ بات کرنے کا عجب انداز تھا۔ منہ جلدی سے کھلتا تھا۔ پھر بند ہو جاتا تھا۔ نیچے کا ہونٹ کچھ عجب انداز سے اوپر اٹھ جاتا تھا اور اس کے ساتھ ہی نکہ دار داڑھی کچھ عجب انداز سے ہل جاتی تھی اس کے بعد ناک سے کچھ ہونہ سا نکلتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ کھا رہے ہیں۔ اور باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔ اچھا گا منہ جلدی سے بند کر لیتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کچھ نکل پڑے۔

رسوا :- کیا اتنی کچھ کھا رہے تھے ؟

امراؤ :- جی نہیں جگالی کر رہے تھے ۔

رسوا :- اکثر کٹ ملا کچھ ایسی ہی صورت بنا لیتے ہیں جسے دیکھ کے بے وقوفوں کو ڈر لگتا ہے اور عقل مندوں کو ہنسی آتی ہے ۔ مجھے ایسی صورتیں دیکھنے کا بہت شوق ہے ۔

امراؤ :- اور سنئے ۔ آپ کی گفتگو میں ایک وصف اور بھی تھا وہ یہ کہ اکثر منہ پھیر لیا کرتے تھے ۔

رسوا :- تو یہ عین تمیز داری ہے ۔ اس لئے کہ عند التقریر آپ کے منہ سے تھوک اڑتا ہوگا ۔

امراؤ :- کچھ اور بھی عرض کروں ۔

رسوا :- بس اب معاف کیجئے یہاں تو صبح ہو گئی ۔

امراؤ :- القصہ میں نے جیب سے ایک روپیہ نکالا ۔

مولوی :- (یہ سمجھ کے کہ مجھے نذر دیا جاتا ہے ۔ جلدی سے ہاتھ تو بڑھا دیا ! منہ سے) اس کی کیا ضرورت تھی ۔

میں :- (مسکرا کے) اس کی اشد ضرورت تھی ۔ اس لئے کہ مجھے بھوک لگی ہے کسی سے کچھ کھانے کو تو منگا دیجئے ۔

مولوی :- (اب جھینپے تو یوں باتیں بنانے لگے) میں سمجھا (میں نے دل میں کہا سمجھے کیا خاک سمجھتے تو پتھر کے ہو جاتے) اسی سے تو کہتا ہوں اس کی کیا ضرورت تھی ۔ کیا کھانا یہاں ممکن نہیں ؟

میں :- امکان بالقوۃ یا بالفعل ۔ بالذات یا بالغیر ؟

مولوی :- بالفعل تو ممکن نہیں ۔ میرا ایک شاگرد کھانا لاتا ہوگا ۔ آپ بھی کھائیے

میں :- بالفعل تو ممکن نہیں ، بالذات کی آپ کو توفیق نہیں اور یہاں ضرورت نے اکل میتت کو جواز کا حکم دے دیا ہے۔ لہذا بازار سے کچھ لا دیجئے۔

مولوی :- اک ذرا صبر کیجئے کھانا آتا ہی ہوگا۔

میں :- اب صبر کرنا تکلیف مالا یطاق ہے اور دوسرے میں نے بالتحقیق سنا ہے کہ رمضان شریف صاحب ایک مہینے تمام دنیا میں سیر کرتے ہیں اور گیارہ مہینے اسی مسجد میں معتکف رہتے ہیں۔

مولوی :- اس وقت تو فی نفس الامر کچھ نہیں ہے۔ مگر ایک شاگرد کھانا لے کے آتا ہوگا۔

میں :- اور بالغرض والتسلیم لو کان محالا اگر کھانا آیا بھی تو آپ کی قوت لایموت کے لئے بھی کافی نہ ہوگا۔ میری شرکت اس میں یعنی چہ اور من وجہ کفالت بھی کرے تو الانتظار اشد من الموت کا مصداق ہے۔ تا تریاق از عراق آورده شود.....

مولوی :- آہا۔ آپ تو بہت قابل معلوم ہوتی ہیں۔

میں :- مگر میرے زعم ناقص میں آپ کسی قابل نہیں۔

مولوی :- واقعی ایسا ہی ہے مگر.....

میں :- (بات کاٹ کر) مگر اس لئے کہ یہاں تو آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔ اور آپ لاطائل تقریریں کر رہے ہیں۔

مولوی :- اچھا تو میں ابھی لایا۔

میں :- للہ ذرا جلدی جائیے۔

خدا خدا کر کے مولوی صاحب گئے اور کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد چار خمیری روٹیاں اور ایک مٹی کے پیالے میں تھوڑا سا نیلا شوربا لا کے میرے سامنے

رکھ دیا۔ دیکھ کے جان جل گئی۔ مولوی صاحب کی صورت دیکھنے لگی۔ مولوی صاحب کچھ اور ہی سمجھے۔

مولوی :۔ (فوراً ساڑھے چودہ گنڈے پیسے، کوئی دھیلے کی کوڑیاں چادر کے کونے سے کھول کے سامنے رکھ دئے) سنئے صاحب چار پیسے کی روٹیاں ہیں، پیسہ کا سالن ہے۔ دھیلا بھاجی (روپیہ کا خوردہ) میں گیا۔ آپ کی جمع آپ کے سامنے موجود ہے۔ پہلے گن لیجئے تو کھا لیجئے گا۔

میں نے پھر ایک دفعہ مولوی صاحب کی صورت دیکھی، مگر بھوک بری بلا ہے جلدی جلدی نوالے اٹھانے شروع کئے۔ جب دو چار نوالے کھا چکی تو مولوی صاحب کی طرف مخاطب ہوئی۔

میں :۔ میں نے کہا مولوی صاحب! کیا اس اُجڑے شہر میں یہی کھانے کو ملتا ہے؟

مولوی :۔ تو کیا یہاں لکھنؤ کی طرح محمود کی دکان ہے جہاں پلاؤ زردہ آٹھ پہر تیار رہتا ہے۔

میں :۔ حلوائی کی دوکان تو ہوگی۔

مولوی :۔ حلوائی کی دکان ؟ یہ مسجد کے نیچے ہے۔

میں :۔ تو پھر چار کوس جانا کیا ضرور تھا۔ دوپہر کے بعد آئے اور لے کے کیا آئے۔ موئے کنوں کا راتب۔

مولوی :۔ ایسا تو نہ کہئے، آدمی کھاتے ہیں۔

میں :۔ آپ ایسے آدمی کھاتے ہوں گے۔ باسی خمیری روٹیاں اور نیلا شوربا۔

مولوی :۔ نیلا تو نہیں ہے۔ اچھا تو دہی لا دوں ؟

میں :۔ جی نہیں رہنے دیجئے، معاف کیجئے۔

مولوی:۔ پیسہ کا خیال نہ کیجئے میں اپنے پاس سے لائے دیتا ہوں۔

میں کچھ جواب بھی نہ دینے پائی تھی کہ مولوی صاحب مسجد کے باہر چلے گئے اور ایک آبخورے میں خدا جانے کب کا سڑا، کھٹا دہی اٹھا لائے اور اس طرح سامنے لاکے رکھ دیا گویا آپ نے حاتم کی قبر پر لات مار دی۔

بہر طور میں نے وہ چاروں روٹیاں اگل نگل کے کھائیں اور کوئی بدھنی بھر کے پانی پیا۔ وہ شوربا اور دہی چھوڑ کے یونہی اُٹھ کھڑی ہوئی، پیسے کوڑیاں بھی وہیں پڑے رہنے دئے۔

(میں ہاتھ دھونے آئی تھی۔ مولوی صاحب سمجھے مسجد سے روانہ ہوتی ہے)

مولوی:۔ اور یہ پیسے اور کوڑیاں تو اٹھا لیجئے۔

میں:۔ میری طرف سے مسجد میں چراغ چڑھا دیجئے۔ مُنہ ہاتھ دھوکے اپنی جگہ پر آ بیٹھی۔ مولوی صاحب سے باتیں کرنے لگی۔ کانپور میں مولوی صاحب کی ذات سے مجھے بہت آرام ملا۔ انھیں کی معرفت ایک کمرہ کرایہ پہ لیا۔ نواڑی پلنگ، دری، چاندنی۔ چھپر کھٹ پردے، تانبے کے برتن اور سب ضرورت کا سامان خرید لیا۔ ایک ماما کھانا پکانے کو اور ایک اوپرے کام کو۔ دو اور خدمت گار نوکر رکھ لئے، ٹھاٹھ سے رہنے لگی۔ ا . .

. . . . اب سازندوں کی تلاش ہوئی۔

یوں تو بہت سے آئے مگر کسی کا باج پسند نہ آیا۔ آخر لکھنؤ کا ایک طبلیہ مل گیا۔ یہ خلیفہ جی کے خاندان کا شاگرد تھا۔ اس سے خوب پرگت ملی۔ اسی کی معرفت دو سارنگیے کانپور کے، ذرا سمجھدار تھے، بلوائے طائفہ درست ہوگیا۔ شب کو پہر ڈیڑھ پہر رات گئے اپنے کمرہ پہ گانے بجانے کا چرچا ہونے لگا۔ شہر میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ لکھنؤ سے کوئی رنڈی آئی ہے۔ اکثر مرد آنے لگے۔ شاعری بھی خوب چمکی۔ کوئی دن ایسا ہی کمبخت ہوگا جو کسی جلسہ میں جانا نہ ہوتا ہو۔ مجرے کثرت سے آتے تھے۔ تھوڑے

ہی دنوں میں بہت سا روپیہ کمالیا۔ اگرچہ کانپور کے لوگوں کا رہ روبیہ بول چال پسند نہ تھی۔ بات بات پر لکھنؤ یاد آتا تھا۔ مگر خود مختاری کی زندگی میں کچھ ایسا مزہ ہے کہ واپس جانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ اگر لکھنؤ جاؤں گی تو پھر خانم کی نوچی بن کر رہنا پڑے گا۔ کیونکہ اس پیشہ میں رہ کر خانم سے علیحدہ رہنا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ ایک تو اس سبب سے کہ تمام رنڈیاں خانم کا دباؤ مانتی تھیں۔ اگر میں الگ ہو کے رہتی تو کوئی مجھ سے نہ ملتی۔ دوسرے عمدہ سازندوں کا بہم پہنچنا دشوار تھا۔ ناچ مجرے کا ڈھچر کیوں کر چل سکتا تھا۔ جن سرکاروں میں میری رسائی ہوئی تھی وہ بھی خانم کی وجہ سے تھی۔ اگرچہ میرا شمار گانے والیوں میں تھا۔ مگر لکھنؤ میں اس کام کے کرنے والے بہت سے ہیں۔ اچھے برے کا امتیاز خاص لوگوں کو ہوتا ہے۔ عام لوگوں میں نام بکتا ہے۔ بڑے آدمیوں کی نگاہ اکثر اونچے ہی گھروں پر جاتی ہے۔ اس حالت میں مجھے کون پوچھتا۔ کانپور میں میرے حوصلے سے زیادہ میری قدر دانی ہوتی تھی۔ کسی امیر رئیس کے یہاں کوئی تقریب شادی بیاہ کی نہ ہوتی تھی جس میں میرا بلانا باعث فخر نہ سمجھا جاتا ہو۔ باہر جا کر اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ کیا چیز ہے۔ یہاں ایک صاحب حضرت شارق لکھنوی بہت مشہور ہیں۔ استاد مسلم الثبوت سمجھے جاتے ہیں۔ سینکڑوں آپ کے شاگرد ہیں۔ لکھنؤ میں کوئی ان کا نام بھی نہ جانتا تھا۔ ایک دن کا تذکرہ سنئے: ایک صاحب میرے گھرے پر تشریف لائے۔ اثنائے گفتگو میں شعر و شاعری کو کچھ چرچا نکلا۔ چھوٹتے ہی انھوں نے پوچھا۔ آپ حضرت شارق لکھنوی کو جانتی ہیں اس لئے کہا نہیں۔ کون شارق یہ صاحب ان کے شاگردوں میں تھے۔ فوراً بگڑ گئے۔

وہ صاحب:۔ میں تو سنا تھا آپ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔

میں:۔ جی ہاں، غریب خانہ تو لکھنؤ ہی میں ہے۔

وہ صاحب :۔ بھلا کہیں ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ میں ہوں اور حضرت استاد کو نہ جانیں!

میں :۔ لکھنؤ کے مشہور شاعروں میں کون ایسا ہے، جس کو میں نہ جانتی ہوں۔ استادوں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ان کے نام برآوردہ شاگردوں میں سے بھی کوئی کم ایسا ہوگا جس کا کلام میں نے نہ سنا ہو۔ ان کے نام نامی سے تو مطلع فرمائیے۔ یہ تخلص تو میں نے کبھی سنا نہیں

وہ صاحب :۔ (چیں بہ جبیں ہو کے) نام لینے سے کیا فائدہ۔ تخلص شوق ہے غرب اور شمال سے جنوب تک زبان زد خلائق ہے۔ ہاں ہاں آپ نہیں جانتی نہ جانیں۔

میں :۔ حضور! معاف کیجئے گا میرے نزدیک تو یہ شاعرانہ تعلی ہے۔ مگر آپ کے استاد ہیں، آپ کو ایسا ہی کہنا چاہیئے۔ اچھا تو نام نامی سے تو مطلع فرمائیے ممکن ہے کہ میں نے تخلص نہ سنا ہو۔ نام سے واقف ہوں۔

وہ صاحب :۔ میر ہاشم علی صاحب شارق۔

میں :۔ اس نام سے تو بے شک کان آشنا ہیں (اتنا کہہ کے اب میں فکر کرنے لگی۔ یا الٰہی! یہ کون میر ہاشم علی صاحب ہیں۔ آخر ایک صاحب پر اشتباہ ہوا) آپ کے استاد مرثیہ خوانی بھی تو کرتے ہیں؟

وہ صاحب :۔ جی ہاں! مرثیہ خوانی میں بھی ان کا مثل و نظیر نہیں۔

میں :۔ بجا ارشاد ہوا۔ یعنی میر صاحب اور مرزا صاحب سے بھی بڑھے ہوئے ہیں؟۔

وہ صاحب :۔ انہی صاحبوں کے ہم عصر ہیں۔

میں :۔ بھلا کس کا مرثیہ پڑھتے ہیں؟

وہ صاحب :۔ کسی کا مرثیہ کیوں پڑھنے لگے؟ خود تصنیف فرماتے ہیں۔ ابھی ستائیسویں رجب کو نیا مرثیہ پڑھا تھا۔ عام شہرہ تھا۔

میں :۔ تو آپ کو یاد ہوگا؟

وہ صاحب :۔ مطلع تو نہیں، تلوار کی تعریف میں ایک بند پڑھا تھا۔ وہ مجھے کیا تمام شہر کی زبان زد ہے۔ قلم توڑ دیا ہے۔

میں :۔ ذرا ارشاد کیجئے گا، میں بھی مستفید ہوں۔

وہ صاحب :۔ نکلی غلاف سے تفسیر جوہری۔

میں :۔ سبحان اللہ! اس بند کے تو دور دور شہرے ہیں، پانچ مصرعے مجھ سے سن لیجئے، کیا کلام ہے!

وہ صاحب :۔ (بہت ہی خوش ہو کے) جی ہاں! آپ نے یہ مرثیہ لکھنؤ میں سنا ہوگا۔ وہی تو میں کہتا تھا کہ لکھنؤ میں سنا ہوگا۔ وہی تو میں کہتا تھا کہ لکھنؤ کی رہنے والی اور پھر شعر و سخن کا شوق حضرت شارق کو نہ جانتی ہوں۔ تعجب ہے۔ اچھا اب میں سمجھا یہ مذاق تھا۔

میرے جی میں تو آیا کہ دوں کہ آپ کے اُستاد مر کے بھی جئیں گے تو ایسا بند نہیں کہہ سکتے، مرزا دبیر صاحب مرحوم کا کلام ہے۔ مگر کچھ سمجھ کے چپ ہو رہی۔

رسوا :۔ واقعی آپ نے بڑی عقلمندی کی ورنہ بے چارے کی روزی میں خلل آتا۔ میر ہاشم علی صاحب شارق پر کیا موقوف ہے، اکثر صاحبان کا یہی شعار ہے۔ دوسروں کا کلام باہر جا کے اپنے نام سے پڑھتے ہیں۔ چند ہی روز کا ذکر ہے ایک صاحب میرے ایک دوست کی غزلوں کے مسودے چرا لے گئے۔ حیدرآباد دکن میں سناتے پھرے۔ بڑے بڑے لوگوں سے داد لی۔ مگر سمجھنے والے سمجھ ہی گئے۔ لکھنؤ میں خطوط آئے۔ اصل مصنف سے تذکرہ ہوا۔ وہ ہنس کر چپ ہو رہے۔ اکثر صاحبوں نے لکھنؤ کو ایسا

بدنام کیا ہے کہ اب لفظ لکھنوی اپنے نام یا تخلص کے ساتھ لکھتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ایسے ایسے بزرگ لکھنوی لکھتے ہیں جن کی ہفتاد پشت دیہات میں گزر گئی۔ خود لکھنؤ میں چند روز طالب علمی یا اور کسی سلسلے سے آ کر رہے، چلئے اچھے خاصے لکھنوی بن گئے۔ اگرچہ کچھ ایسی فخر کی بات نہیں مگر جھوٹ سے کیا فائدہ حال

....

امراؤ:۔ جی ہاں، اکثر صاحب اسی طرح لکھنؤ فروشی کر کے اپنا بھلا کرتے ہیں کانپور میں میرا بھی ٹھیک یہی حال تھا۔

اس زمانہ میں ریل تو تھی نہیں اور نہ لکھنؤ سے کوئی باہر جاتا بلکہ شہر کے کاملین "تلاش معیشت" میں یہیں آتے تھے۔ اپنے کمال کی حسب حیثیت داد پاتے تھے دہلی اجڑ کے لکھنؤ آباد ہوا تھا۔

رسوا:۔ فی زمانہ یہی حال دکن کا ہے۔ لکھنؤ اجڑ کے دکن آباد ہوا ہے۔ میں تو گیا نہیں۔ مگر سنا ہے کہ محلے کے محلے لکھنؤ والوں سے آباد ہیں۔

امراؤ:۔ جو صاحب لکھنوی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے کہئے پہلے اپنی زبان کی موچ نکالیں۔

رسوا:۔ کیا خوب بات کہی ہے۔ واقعی روزمرہ تو کسی قدر آ بھی جاتا ہے مگر لہجہ نہیں آتا۔

(۱۵)

اتفاقات زمانہ سے یہ کچھ دور نہیں

یوں بھی ہوتا ہے کہ بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں

بچھڑے ہوئے مل جاتے ہیں اور پھر کب کے بچھڑے ہوئے۔ وہ جن کے ملنے کا سان گمان بھی نہ ہو۔ ایک دن کا واقعہ سنئے: کانپور میں رہتے ہوئے کوئی چھ مہینے گذر گئے ہیں۔ اب شہرت کی یہ منزل پہنچی ہے کہ بازاروں اور گلیوں میں میری گائی ہوئی غزلیں لوگ گاتے پھرتے ہیں۔ شام کو میرے کمرے میں بہت اچھا مجمع رہتا ہے۔ گرمیوں کا دن ہے کوئی دو بجے کا وقت ہوگا، میں اپنے پلنگ پر اکیلی بیٹھی ہوں ماما باورچی خانے میں خراٹے لے رہی ہے۔ ایک خدمت گار کمرے کے باہر بیٹھا پنکھے کی ڈوری کھینچ رہا ہے۔ خس کی ٹٹیاں خشک ہو گئی ہیں۔ میں آدمی کو آواز دیا ہی چاہتی تھی کہ پانی چھڑک دے کہ اتنے میں کمرے کے نیچے کسی نے آکر پوچھا۔ لکھنؤ

سے جو رنڈی آئی ہے اس کا کمرہ یہی ہے؟ درگا بنیا (جس کی دوکان نیچے تھی) نے جواب دیا "ہاں یہی ہے" پھر دریافت کیا "دروازہ کہاں ہے؟" اس نے بتا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک بڑی بی کوئی ستر برس کا سن۔ گوری سی، منہ پر جھریاں پڑی ہوئیں، بال جیسے روئی کا گالا۔ کمر جھکی ہوئی۔ سفید ململ کا دوپٹہ تن زیب کا کرتہ۔ تین سکھ کا پاجامہ بڑے بڑے پائنچوں کا پہنے، ہاتھوں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے، انگلیوں میں انگوٹھیاں، جریب ہاتھ میں۔ ہانپتی کانپتی ہوئی آئیں اور سامنے فرش پر بیٹھ گئیں۔ ایک کالا سا لڑکا کوئی دس بارہ برس کا اُن کے ساتھ تھا، وہ کھڑا رہا۔

بڑی بی:۔ لکھنؤ سے تمہیں آئی ہو؟

میں:۔ جی ہاں۔

اتنا کہہ کے میں پلنگ کے نیچے اتر آئی۔ پاندان آگے کھسکایا۔ آدمی کو حقہ کے لئے آواز دی۔

بڑی بی:۔ ہماری بیگم نے تمہیں یاد کیا ہے۔ لڑکے کی سالگرہ ہے۔ زنانہ جلسہ ہوگا۔ تمہارا مجرا کیا ہے۔

میں:۔ بیگم صاحب مجھ کو کیا جانیں؟

بڑی بی:۔ اے تمام شہر میں تمہارے گانے کی دھوم ہے۔ دوسرے تمہارے بلانے کا یہ بھی ایک سبب ہے کہ بیگم صاحب خود بھی لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔

میں:۔ اور آپ بھی تو لکھنؤ کی ہیں؟

بڑی بی:۔ تم نے کیوں کر جانا؟

میں:۔ کہیں بات چیت کا قرینہ چھپا رہتا ہے۔

بڑی بی:۔ ہاں! میں بھی وہیں کی رہنے والی ہوں۔ اچھا اپنا مجرا تو

بتاؤ ابھی بہت کام پڑا ہے۔ مجھے دیر ہوتی ہے۔

میں :- مجرا تو میرا کھلا ہوا ہے، سب جانتے ہیں پچاس روپیہ لیتی ہوں۔ مگر بیگم صاحبہ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں اور انہوں نے قدر کر کے بلایا ہے تو ان سے کچھ نہ لوں گی۔ جلسہ کب ہے۔

بڑی بی :- آج شام کو۔ اچھا تو یہ روپیہ کھچڑی کا تو لو، باقی وہاں آ کے سمجھ لینا۔

میں :- (روپیہ لے لیا) اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ مگر اس خیال سے کہ بیگم صاحب برا نہ مانیں۔ روپیہ لے لیتی ہوں۔ اچھا اب یہ کہیے کہ مکان کہاں ہے؟

بڑی بی :- مکان تو ذرا دور ہے۔ نواب گنج میں ہے۔ یہ لڑکا شام کو آئیگا اسی کے ساتھ چلی آنا۔ مگر اتنا خیال رہے کہ کوئی مرد ذات تمہارے ملنے والوں میں سے تمہارے ساتھ نہ ہو۔

میں :- اور سازندے؟

بڑی بی :- سازندے، خدمت گار، ان کی مناہی نہیں ہے۔ کوئی اور نہ ہو۔

میں :- جی نہیں، یہاں میرا کون سا ملاقاتی ہے جسے ساتھ لاؤں گی۔ خاطر جمع رکھیے۔

اتنے میں خدمت گار نے حقہ تیار کیا۔ میں نے اشارہ کیا بڑی بی کے سامنے لگا دو۔ بڑی بی مزے لے لے کے حقہ پینے لگیں۔ میں ایک پان پر کتھا چونا لگا کے، ڈلیوں کا چورا ڈبیہ میں پڑا ہوا تھا۔ ایک چٹکی اس کی اور الائچی کے دانے پان دان کے ڈھکنے پہ کچل کے، گلوری بنا کے بڑی بی کو دینے لگی۔

بڑی بی :- ہائے بیٹا! دانت کہاں ہے لاؤں جو پان کھاؤں۔

میں :- آپ کھائیے تو۔ میں نے آپ ہی کے لائق پان بنایا ہے

بڑی بی بیٹھ گئیں، پان لے کے کھایا۔ بہت ہی خوش ہوئیں۔ واہ ہمارے شہر کی تمیزداری۔ اتنا کہہ کے دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہوئیں۔ چلتے چلتے کہہ گئیں ذرا دن سے آجانا۔ گھڑی بھر دن رہے گرہ لگائی جائے گی۔

میں:۔ اگرچہ مجرے کا دستور نہیں ہے۔ مگر خیر بیگم صاحب نے یاد کیا ہے تو میں سویرے سے حاضر ہوکر مبارک باد گاؤں گی۔

واقعی وطن کی قدر باہر جاکے ہوتی ہے۔ کانپور میں سینکڑوں جگہ مجرے ہوئے مگر کہیں جانے کا ایسا اشتیاق ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ جلدی سے شام ہو جائے اور میں روانہ ہوں۔ گرمیوں کا دن پہاڑ ہوتا ہے۔ خدا خدا کرکے اتنا دن کٹا، پانچ بجے لڑکا آموجود ہوا۔ میں پہلے ہی سے بنی ٹھنی تھی ساز ندوں کو بلوا رکھا تھا۔ لڑکے نے ان کو مکان کا پتہ بتا دیا۔ میں سوار ہو کے روانہ ہو گئی۔

بیگم کا مکان شہر سے کوئی گھنٹہ بھر کا راستہ تھا۔ چھ بجے میں وہاں پہنچی۔ نہر کے کنارے ایک باغ تھا جس کے چاروں طرف مینڈھ پر ناگ پھنی اور دوسرے خاردار درخت اس طرح برابر بٹھائے گئے تھے جس سے ایک دیوار سی بن گئی تھی باغ کی قطع بالکل انگریزی تھی۔ تاڑ، کھجور اور طرح طرح کے خوبصورت درخت قرینے سے لگائے گئے تھے۔ روشوں پر سرخی کٹی ہوئی تھی۔ چاروں طرف سبزہ تھا۔ جابجا کنکروں کی پہاڑیاں سی بنی ہوئی تھیں ان پر اقسام کے پہاڑی درخت پتھروں کے اندر سے اُگے معلوم ہوتے تھے۔ پہاڑیوں کے گرداگرد دوب جمائی گئی تھی۔ باغ میں ہر چہار طرف پکے برہے بنے ہوئے تھے۔ ان میں صاف موتی سا پانی بہہ رہا تھا۔ مالی نلوں اور فواروں کے ذریعے سے پانی دے رہے تھے۔ پتوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ دن بھر کی دھوپ کھائے ہوئے پھولوں میں جو اب پانی پہنچا تھا کیسے تروتازہ اور شاداب تھے۔

سالگرہ کی رسم کوٹھی میں ادا ہوئی تھی۔ عورتوں کے گانے کی آواز آئی۔ باہر میں نے مبارک باد گائی۔ پھر آپ ہی آپ شیام کلیاں کی ایک چیز شروع کردی۔ کوئی سننے والا نہ تھا۔ آپ ہی آپ گایا کی۔ پھر چپ ہو رہی۔ بیگم صاحب نے ایک اشرفی اور پانچ روپیہ انعام کے بھیجے۔ تھوڑی دیر میں شام ہو گئی۔ چاند نکل آیا۔ چاندنی پھیل گئی۔ تالاب کے پانی میں ماہتاب کا عکس موجوں سے مل کر عجب کیفیت دکھا رہا تھا۔

باغ کے کنارے پر ایک بہت عالیشان کوٹھی تھی۔ وسط باغ میں ایک پختہ تالاب بنا ہوا تھا۔ اس کے گرد ولایتی پھولوں کے نادے نہایت خوبصورتی سے سجے ہوئے تھے۔ اسی تالاب سے ملا ہوا ایک اونچا چبوترہ تھا۔ اس کے درمیان ایک مختصر سا ہوادار چوبی بنگلہ تھا۔ اس کے ستونوں پر رنگ آمیزی کی ہوئی تھی۔ اس تالاب میں نہر سے پانی گرتا تھا۔ پانی کے گرنے کی آواز سے دل میں ٹھنڈک پہنچتی تھی۔ واقعی عجب عالم تھا۔ شام کا سہانا وقت، ستھری ہوا، رنگ رنگ کے پھولوں میں مہک۔ ایسی فضائیں کبھی نہ دیکھی تھی۔ سہ چبوترے پر سفید چاندنی کا فرش تھا۔ مسند تکیہ لگا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ہم لوگ بٹھائے گئے۔ کوٹھی سے لے کر اس چبوترے تک گلاب کی بیلوں سے ایک چھتا سا بنا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کی راہ سے بیگم صاحبہ تشریف لاتی ہیں۔ سامنے چلمنیں پڑتی ہوئی تھیں۔ چبوترے پر سبز رنگیں روشن ہو گئیں۔ مجھے گانے کا حکم ہوا۔ میں نے کدارے کی ایک چیز شروع کر دی۔ بڑی دیر تک گایا کی۔ اتنے میں ایک مہری ہاتھوں میں دو سبز کنول لئے ہوئے باہر نکلی۔ مسند کے سامنے رکھ دئے۔ سازندوں سے کہا: "تم لوگ وہ سامنے شاگرد پیشہ پر چلے جاؤ۔ کھانا بھیج دیا جائے گا۔ اب یہاں زنانہ ہو گا۔" میں تعظیم کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ انہوں نے مجھ کو قریب بلایا۔ خود مسند پر بیٹھ گئیں۔ مجھے سامنے کا اشارہ کیا۔ میں تسلیم کر کے بیٹھ گئی۔ گانے کے لئے حکم کی منتظر تھی اور بیگم کی صورت غور سے دیکھ رہی تھی۔

۵ خیرہ اٹھی نگاہ تماشہ کرے کوئی
صورت وہ روبرو ہے کہ دیکھا کرے کوئی

پہلے تو وہ باغ اور وہاں کی فضا دیکھ کے مجھے پرستان کا شبہ ہوا تھا۔ مگر اب یقین ہو گیا کہ پری میرے سامنے گاؤ تکیہ سے لگی بیٹھی ہے۔ مانگ نکلی ہوئی ہے۔ چوٹی کمر تک پڑی ہوئی ہے۔ سرخ و سفید رنگت، اونچا ماتھا۔ کھنچی ہوئی بھنویں، بڑی بڑی آنکھیں جیسے گلاب کی پتیاں۔ لمبچوتی ناک، چھوٹا سا دہانہ، پتلے پتلے نازک ہونٹ۔ نقشے بھر میں کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے بہتر میرے خیال میں کوئی چیز آسکتی ہو۔ اس پر اعضا کا تناسب اور سابھراپن کس قدر خوشنما تھا۔ سینکڑوں عورتیں میری نظر سے گزر گئیں مگر میں نے اس بلا کی صورت نہ دیکھی تھی۔ خورشید سے بہت جھجک ملتی تھی مگر کہاں خورشید کہاں وہ۔ خورشید کی صورت میں پھر ڈومنی پنا تھا۔ اس میں یہ امیرانہ رعب، یہ تمکنت، یہ بھاری بھرکم پنا کہاں۔ دوسرے خورشید ان کے سامنے کسی قدر بھدی معلوم ہوتی تھی۔ ان کا کامنی سا نازک چھریرا بدن اس نے کہاں پایا۔ دوسرے اس کی صورت پر آٹھ پہر اداسی برستی تھی۔ جب دیکھو برہ گن بنی تھی۔ بیگم صاحبہ بہت ہی خوش مزاج معلوم ہوتی ہیں۔ بات کرتی ہیں گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ہر بات پر خود بخود ہنسے دیتی ہیں۔ مگر کسی کو مجال کلام نہیں۔ واقعی سادگی میں تکلف اور تمکنت کے ساتھ شوخی انہیں میں دیکھی۔ دولت مندوں کی خوشامد سب کرتے ہیں مگر میں عورت ذات ہو کے کہتی ہوں کہ رنڈیوں کی خوشامد بھی اگر بے غرض کی جائے تو کوئی عیب نہیں۔ لباس اور زیور بھی اسی صورت کے لائق تھا۔ جھین، بسنتی دوپٹہ کندھوں سے ڈھلکا ہوا۔ کیچلی کا شلوکہ، پھنسا پھنسا سرخ گرنٹ کا پائجامہ، کانوں میں صرف یاقوت کے آویزے، ناک میں ہیرے کی کیل، گلے میں سونے کا سادہ طوق ہاتھ میں موتیوں کی سمرنی بازوؤں پر نورتن پاؤں میں سونے کی بیڑیاں چہرے کی خوبصورتی لباس کی سادگی اور زیور کی مناسبت یہ سب چیزیں میری آنکھوں

کے سامنے تھیں اور میں نقل حیرت بنی بیٹھی تھی۔ بغور صورت دیکھ رہی تھی اور میری صورت تو جیسی کچھ ہے وہ اس وقت آپ کے سامنے ہے، مگر یقین ہی کیجئے گا ان کی توجہ بھی کسی اور طرف نہ تھی، مجھی کو دیکھ رہی تھیں۔ دونوں طرف سے نگاہیں لڑی ہوئیں تھیں میرے دل میں بار بار ایک خیال آتا تھا مگر اس کے اظہار کا موقع نہ تھا۔ کہوں تو کیوں کر کہوں۔ ایک چھری لیس پشت کھڑی پنکھا جھل رہی تھی، دو سامنے کھڑی تھیں ایک کے ہاتھ میں چاندی کی لٹیا، دوسری کے پاس خاص دان۔ بڑی دیر تک نہ بیگم صاحبہ نے مجھ سے بات چیت کی اور نہ میں کچھ بول سکی۔ آخر انھوں نے سلسلۂ کلام اس طرح سے شروع کیا۔

بیگم :۔ تمہارا کیا نام ہے؟

میں :۔ (ہاتھ باندھ کے) امراؤ جان۔

بیگم :۔ خاص لکھنؤ میں مکان ہے؟

(یہ سوال کچھ اس رخ سے کیا گیا تھا کہ مجھے جواب دینا مشکل ہوا۔ خصوصاً اس موقع پر اس لئے کہ اگر کہتی ہوں کہ لکھنؤ میں میرا مکان ہے تو ایک مطلب جو میرے دل میں تھا فوت ہو جاتا ہے۔ فیض آباد بتاتی ہوں تو بے محل افشائے راز کا خیال ہے، آخر بہت سوچ سمجھ کے) :۔

میں :۔ جی ہاں پرورش تو لکھنؤ میں پائی ہے۔

(جواب دینے کو دے دیا مگر اس کے ساتھ ہی خیال ہوا کہ اب جو سوال کیا جائیگا تو پھر وہی دقت پیش آئے گی۔ میرا خیال غلط نہ تھا اس لئے کہ فوراً بیگم صاحبہ نے پوچھا) :۔

بیگم :۔ تو کیا پیدائش لکھنؤ کی نہیں ہے؟

(اب حیران ہوں کہ کیا جواب دوں۔ تھوڑی دیر سکوت کیا جیسے کچھ سنا ہی نہ تھا

آخر اس بات کو ٹال کے) :۔

میں :۔ حضور کا دولت خانہ لکھنؤ میں ہے ؟

بیگم :۔ کبھی لکھنؤ میں تھا ۔ اب تو کانپور وطن ہو گیا ۔

میں : میرا بھی یہی ارادہ ہے ۔

بیگم :۔ کیوں ؟

میں :۔ (اس سوال کا جواب دینا بھی دشوار تھا کون قصہ بیان کرتا) اب کیا عرض کروں ۔ بے کار سمع خراشی ہو گی ۔ حال ناگفتہ بہ ہے کچھ ایسے ہی اتفاقات پیش آئے کہ لکھنؤ جانے کو جی نہیں چاہتا ۔

بیگم :۔ چلو اچھا ہے تو ہمارے پاس بھی کبھی کبھی چلی آیا کرو ۔

میں :۔ آنا کیسا ۔ میرا تو ابھی سے جانے کو جی نہیں چاہتا ۔ اول تو آپ کی قدردانی دوسرے یہ باغ ، یہ فضا ۔ ممکن ہے کہ کوئی ایک بار دیکھے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوس نہ ہو ، خصوصاً مجھ ایسی خفقانی مزاج کی عورت کے لئے تو یہاں کی آب و ہوا اکسیر کا خواص رکھتی ہے ۔

بیگم : اے ہے ، تمہیں یہ جنگلہ بہت پسند آیا ۔ نہ آدمی نہ آدم ذات ، ہیہات خدا کی ذات ۔ شہر سے کوسوں دور ۔ چار پیسوں کا سودا منگاؤ تو آدمی صبح کا گیا ہوا شام کو آتا ہے ۔ چھائیں پوئیں شیطان کے کان بہرے ۔ کوئی بیمار ہو تو جب تک حکیم صاحب شہر سے آئیں یہاں آدمی کا کام تمام ہو جائے ۔

میں :۔ حضور اپنی اپنی طبیعت ۔ مجھے تو پسند ہے ۔ میں تو جانتی ہوں کہ اگر یہاں رہوں تو مجھے یہاں کسی چیز کی ضرورت ہی نہ ہو ۔ دوسرے ایسے مقام پر بیمار ہونا کیا ضرور ہے ۔

بیگم :۔ جب میں پہلے پہل آئی تھی تو میرا بھی یہی خیال تھا ۔ کچھ دنوں یہاں رہ کے معلوم ہوا کہ شہر کے رہنے والے ایسے مقام پر نہیں رہ سکتے ۔ شہر میں ہزار طرح کا آرام

ہے اور سب باتوں کو جانے دو۔ جب سے نواب کلکتہ گئے ہیں راتوں کو ڈر کے مارے نیند نہیں آتی۔ یوں تو خدا کے دئے سپاہی، پاسی، خدمت گار اس وقت بھی دس بارہ مرد نوکر ہیں، عورتوں کی گنتی نہیں مگر پھر بھی ڈر لگتا ہے۔ میں دو چار دن اور راہ دیکھتی ہوں اگر نواب جمی جم آئے تو میں شہر میں کوئی مکان لے کے جا رہا ہوں گی۔

میں:۔ قصور معاف آپ کا مزاج وہمی ہے۔ ایسے ایسے وسواس دل میں نہ لایا کیجئے۔ شہر میں جائیے گا تو قدر عافیت کھلے گی، وہ گرمی ہے کہ آدمی پکے جاتے ہیں۔ دوسرے بیماریاں کہ خدا پناہ میں رکھے۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ اتنے میں کھلائی بچے کو لے کے آئی۔ تین برس کا لڑکا تھا، ماشاء اللہ گورا گورا، خوبصورت۔ ایسی پیاری پیاری باتیں کرتا تھا جیسے مینا۔ بیگم نے کھلائی سے لے کے گود میں بٹھا لیا۔ تھوڑی دیر کھلا کدا کے پھر کھلائی کو دینے لگیں کہ میں نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔ بڑی دیر تک لئے رہی اور پیار کیا کی۔ پھر کھلائی کو دے دیا۔

میں:۔ یوں تو شاید نہ آتی مگر میاں کو دیکھنے تو ضروری ہی آؤں گی۔

بیگم:۔ (مسکرا کے) اچھا کسی طرح ہو، آنا ضرور۔

میں:۔ ضرور ضرور حاضر ہوں گی۔ یہ آپ بار بار کیوں فرماتی ہیں۔ میں تو اس قدر حاضر ہوں گی کہ حضور کو دو بھر ہو جاؤں گی۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بیگم نے میرے گانے کی بہت تعریف کی۔ اسی اثنا میں خاصہ زادی نے آکے کھانا نوکھا لو۔

میں:۔ بہت خوب۔

بیگم:۔ مسند سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں بھی ساتھ ہی اٹھی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ مہریوں کو اشارہ کیا، تم یہیں ٹھہرو ہم کھانا کھا کے یہیں بیٹھیں گے۔

میں :- واقعی اس وقت کا سماں تو ایسا ہے کہ ہمانے کو جی نہیں چاہتا مگر حکم حاکم۔

بیگم :- تو کیا کھانا یہیں منگوالیا جائے ؟

میں :- جی نہیں۔ اچھا، کھانا کھا کے چلے آئیں گے۔

بیگم :- (ایک مہری سے) ان کے ساتھ کے آدمیوں کو کھانا دلوادیا ہوگا۔

مہری :- (ہاتھ باندھ کے) حضور دلوا دیا گیا۔

بیگم :- اچھا انہیں رخصت کرو۔ ہم نے دوسرا مجرا معاف کیا امراؤ جان کھانا کھانا کھا کے جاویں گی۔

اس کے بعد بیگم اور ہم دونوں کوٹھی کی طرف چلے ایک مہری آگے آگے فانوس لئے جاتی تھی، چپکے سے میرے کان میں کہا "مجھ کو تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں، مگر آج اس کا موقع نہیں۔ کل تو مجھے فرصت نہ ہوگی، پرسوں تم صبح آنا اور کھانا یہیں کھانا۔"

میں :- مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے۔

بیگم :- اچھا تو آج کچھ نہ کہو، چلو کھانا کھالیں، اس کے بعد تمہارا گانا سنیں گے۔

میں :- پھر سازندوں کو تو حضور نے رخصت کر دیا۔

بیگم :- ہم کو مردوں کے ساتھ گانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میری ایک خواص خوب طبلہ بجاتی ہے اس پر گانا۔

میں :- بہت خوب۔

اب ہم کوٹھی کے پاس پہنچ گئے بہت وسیع کوٹھی تھی اور اس طرح سجی ہوئی تھی شاہی کوٹھیوں کے دیکھنے کے بعد اگر کوئی کوٹھی دیکھی تو یہی دیکھی۔ پہلے برآمدہ ملا اس کے بعد کئی کمروں سے ہو کے گذرے۔ ہر ایک نئے طرز سے سجا ہوا تھا۔ ہر کمرہ، فرش فروش اور شیشہ آلات ایک نئے رنگ اور نئے طرز کا تھا۔ آخر ہم اس کمرے میں پہنچے جہاں دسترخوان چنا ہوا تھا۔ دسترخوان پر دو عورتیں اور بھی منتظر تھیں۔ ان

بیں سے ایک چیٹھی نویس تھی، ایک مصاحب۔ ان دونوں کا لباس بھی بہت ہی زرق برق تھا۔ صورتیں بھی اچھی تھیں

دستر خوان پر کئی قسم کے کھانے پلاؤ، بورانی، مزعفر، متنجن، سفیدہ، شیر برنج، باقر خانیاں، کئی طرح کے سالن، کباب، اچار مربے، مٹھائیاں، دہی، بالائی۔ غرض کہ ہر قسم کی نعمت موجود تھی۔ لکھنؤ سے نکلنے کے بعد آج کھانے کا مزہ آیا۔ بیگم ہر طرح کی چیزیں میرے سامنے رکھتی جاتی تھیں۔ میں اگرچہ کسی قدر تکلف سے کھانا کھاتی تھی، مگر ان کے اصرار نے ضرورت سے زیادہ کھلا دیا۔

بیسن دانی اور تسلہ آیا۔ ہاتھ منہ دھو کے سب نے پان کھائے پھر اسی چبوترے پر جلسہ جما۔ اس جلسہ میں صرف بیگم صاحبہ نہ تھیں۔ چیٹھی نویس، مصاحبین، مغلانیاں، پیش خدمتیں، مہریاں، ماما‌ئیں سب ملا کے کوئی دس بارہ عورتیں تھیں۔

بیگم صاحب نے حکم دیا کہ طبلہ کی جوڑی اور ستار اٹھا لاؤ۔ ایک مصاحب جو طبلہ بجانے میں مشاق تھی طبلہ بجانے لگی۔ خود بیگم صاحبہ ستار چھیڑنے لگیں۔ مجھے گانے کا حکم دیا۔

کھاتے کھاتے دس گیارہ بج چکے تھے۔ جب ہم گانے کو بیٹھے ہیں۔ ٹھیک بارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت وہ باغ جس میں بہت سا روپیہ صرف کر کے جنگل اور پہاڑ کی گھاٹیوں کے نمونے بنائے گئے تھے، عجیب وحشت ناک سماں دکھا رہا تھا۔ ایک طرف چاند اس عالیشان کوٹھی کے ایک گوشے سے تھوڑی دور پر گنجان درختوں کی شاخوں سے نظر آتا تھا مگر اب ڈوبنے ہی کو تھا۔ تاریکی روشنی پر چھائی جاتی تھی جس سے ہر چیز بھیانک معلوم ہونے لگی۔ درخت جتنے اونچے تھے اس سے کہیں بڑے نظر آتے تھے۔ ہوا سن سن چل رہی تھی۔ سرو کے درخت سائیں سائیں

کر رہے تھے۔ اور تو ہر طرف خموشی کا عالم تھا مگر تالاب میں پانی گرنے کی آواز بلند ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پرندہ اپنے آشیانے میں چونک کر ایک بانگ بول دیتا تھا یا شکاری جانوروں کے جھول سے جو چڑیاں اڑ نی تھیں اس سے پتے کھڑک جاتے تھے یا کبھی کوئی مچھلی تالاب میں اچھل پڑتی تھی۔ مینڈک اپنا بے تکا راگ گا رہے تھے۔ جھینگر اس دے رہے تھے۔ سوائے اس چبوترے کے جہاں دس بارہ جوان جوان عورتیں رنگ رنگ کے لباس پہنے اور طرح طرح کے زیور سے آراستہ جلسہ جمانے جلسہ جمانے بیٹھی تھیں اور کوئی آس پاس نہ تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے کنول بجھ گئے تھے صرف دو مردنگوں کی روشنی تھی۔ ان کے بھی شیشے سبز۔ یا تاروں کا عکس جو تالاب کے پانی میں ہلکورے لے رہا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ طلسمات کا عالم تھا۔ وقت اور مقام کی مناسبت سے میں نے سوہنی کی ایک چیز شروع کر دی۔ اس راگنی کے بھیانک سروں نے دلوں پر اپنا پورا اثر کیا تھا۔ سب بہوت بیٹھے تھے۔

مارے خوف کے باغ کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ خصوصاً گنجان درختوں کے نیچے اندھیرا گھپ تھا۔ سب ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے۔ گویا وہ جلسہ اس کی جگہ تھی اور جدھر نگاہ اٹھا کے دیکھو ایک ہو کا عالم تھا۔ اوروں کا کیا ذکر خود میرا کلیجہ دھڑک رہا تھا۔ دل ہی میں کہتی تھی بیگم نے سچ کہا تھا۔ بے شک یہ جگہ رہنے کے لائق نہیں ہے۔ اس اثنا میں گیدڑ کے بولنے کی آواز آئی۔ اس نے اور بھی دلوں کو ہلا دیا۔ اس کے بعد کتے بھونکنے لگے۔ اب تو مارے دہشت کے یہ حال تھا کہ کسی کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اتنے میں بیگم نے گاؤ تکیہ سے ذرا اونچی ہو کے اپنے سامنے کچھ دیکھا اور زور سے ایک چیخ مار کے مسند پر گر پڑیں۔ اور سب عورتیں بھی اسی طرف دیکھنے لگیں۔ میں بھی مڑ کے دیکھنے لگی۔

بیگم صاحب کو میں سمجھ چکی تھی کہ وہمی ہیں۔ مگر اب جو دیکھتی ہوں تو ان کے وہم کو

کی حقیقت نظر آنے لگی۔ سامنے سے دس پندرہ آدمی منہ پر ڈھاٹے باندھے۔ ننگی تلواریں ہاتھ میں دوڑتے چلے آتے ہیں۔ عورتوں کے چلانے سے بیگم کے نوکر چاکر، خدمت گار سب اسی طرف کو چلے۔ کوئی نہتا کسی کے ہاتھ میں لاٹھی۔ مگر ڈاکو زیادہ تھے اور یہاں آدمی کم تھے کئی تو راستہ سے فرار ہوگئے۔ پانچ چار آدمی چبوترے تک پہنچ ہی گئے انہوں نے آکر عورتوں کو بیچ میں کر لیا اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو کے کھڑے ہوگئے۔ عورتوں میں سے کسی کو ہوش نہ تھا۔ سب غش کی حالت میں بے دم پڑی تھیں۔ ایک میں خدا جانے کیا پتھر کا دل تھا کہ بیٹھی رہی۔ مارے ہول کے دم نکلا جاتا تھا۔ یااللہ دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

بیگم کے آدمیوں میں سے جن کے پاس حربے تھے وہ آگے بڑھنے ہی کو تھے کہ سرفراز نامی ایک سپاہی نے روکا۔

سرفراز:۔ (اپنے ساتھیوں سے) ٹھہرو۔ ابھی جلدی نہ کرو۔ پہلے ہمیں ان لوگوں کا عندیہ معلوم کر لینے دو۔ (ڈاکوؤں سے) تم لوگ کس ارادے سے آئے ہو؟

ایک ڈاکو:۔ جس ارادے سے آئے ہیں تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔

سرفراز:۔ وہی میں پوچھتا ہوں۔ جان کے خواہاں ہو یا مال کے؟

دوسرا ڈاکو:۔ ہمیں جان سے کوئی غرض نہیں۔ کوئی باپ مارے کا بیر ہے؟ ہاں جس ارادے سے آتے ہیں اس میں تم مزاحم ہوگے تو دیکھا جائے گا۔

سرفراز: (کسی قدر سخت ہو کے) تو کیا بہو بیٹیوں کی آبرو لوگے۔ اگر یہ مقصد ہو۔

سرفراز پوری بات بھی ختم نہ کرنے پایا تھا۔ کسی نے ڈاکوؤں کی طرف سے کہا:۔

کوئی ڈاکو:۔ نا صاحب۔ کسی کی بہو بیٹیوں سے کیا واسطہ۔ کیا ہمارے نہیں ہیں؟ عورتوں کے کوئی ہاتھ لگا سکتا ہے۔

اس آواز پر مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔

سرفراز :۔ (خوش ہو کے) تو پھر بہن تو میں پوچھتا ہوں۔ اچھا تو بھائیو ہم ابھی تمہیں کمروں کی کنجیاں منگائے دیتے ہیں اور جو عورتیں وہاں ہیں ان کو یہاں بلوائے لیتے ہیں۔ گھر کی مالک بیگم یہیں ہیں۔ تم شوق سے کوٹھی میں جو جی چاہے اٹھالے جاؤ۔ رہا عورتوں کا زیور وہ بھی اتروا دیتے ہیں۔ ہمارا مالک کچھ اس سے غریب نہ ہو جائیگا خدا کے حکم سے لاکھوں روپیہ بنک گھر میں جمع ہے۔ علاقہ سے جو روپیہ آتا ہے اس کا ذکر نہیں۔

ڈاکو :۔ اس سے بہتر کیا ہے۔ مگر دیکھو اس میں دغا نہ ہو۔

سرفراز :۔ سپاہی کے پوت دغا نہیں دیتے، خاطر جمع رکھو۔

وہی ڈاکو جس کی آواز میں نے پہچانی تھی آگے بڑھا۔ "واہ کیا کہنا، مردوں کا قول ہی تو ہے۔ اچھا کنجیاں؟"

اتنا کہنا تھا کہ میرے اس کے نگاہیں چار ہوئیں۔ میں نے تو پہچان لیا، بولنے کا قصد کیا۔ مگر دل میں ایسی دہشت سمائی ہوئی تھی کہ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی کہ اتنے میں خود اس نے آگے بڑھ کے کہا۔ "بھابی! تم یہاں کہاں؟"

میں :۔ جب سے تمہارے بھائی قید ہو گئے یہیں ہوں۔

فضل علی :۔ یہاں کس کے پاس؟

میں :۔ رہتی تو شہر میں ہوں مگر یہاں میری ایک بہن بیگم صاحب کے پاس نوکر ہیں ان سے ملنے آئی تھی۔

فضل علی :۔ تمہاری بہن کہاں ہیں؟

میں :۔ یہیں ہیں۔ جب سے تم لوگوں کے آنے کا ہنگامہ ہوا بےچاری غش میں پڑی ہیں، میری طرح تو بیسوا نہیں۔ بےچاری پردہ نشیں ہیں۔ جوانی میں رانڈ ہو گئیں۔ جب سے امیر رئیسوں کی نوکریاں کرتی پھرتی ہیں۔

فضل علی:۔ (اپنے ساتھیوں سے) یہاں سے ایک پیسہ کی چیز لینا تو میرے نزدیک حرام ہے۔ ورنہ اس معاملہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

ایک ڈاکو:۔ یہ کیا؟ پھر آئے کیوں تھے؟

فضل علی:۔ جس ارادے سے آئے تمہیں معلوم ہے مگر کسی کا کچھ خیال بھی ہے؟ مجھ سے تو نہیں ہو سکتا کہ فیض بھائی کی آشنا اور اس کی بہن کا اسباب لوٹوں یا جس سرکار سے ان لوگوں کا توسل ہو وہاں دست درازی کروں۔ اگر وہ قید میں سنے گا تو کیا کہے گا؟..

اس بات پر ڈاکوؤں کے آپس میں بہت جھگڑا ہونے لگا۔ مگر سب فضل علی کا دباؤ مانتے تھے کوئی دم نہ مار سکتا تھا پھر بھی خالی ہاتھ جانا کچھ ایسی سہل بات نہ تھی۔ سب ڈاکو غل مچاتے تھے:" فاقوں مرتے ہیں ایک موقع ملا بھی تو اسے ہمارا جمعدار چھوڑے دیتے ہیں۔ آخر پیٹ کہاں سے پالیں؟"

جب فضل علی اپنے گروہ سے نکل کے الگ کھڑے ہوئے تو ان کے ساتھ ہی ساتھ ایک اور سیاہ فام شخص یہ کہتا ہوا نکلا:۔

وہ شخص:۔ کہاں صاحب! میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ غور سے جو دیکھتی ہوں، معلوم ہوا کہ فیض علی کا سائیس ہے۔ میں نے اُسے بلایا علیحدہ لے جاکے باتیں کیں۔ وہ اشرفی اور روپیہ جو بیگم صاحب نے انعام دئے تھے چپکے سے اُسے دے دئے۔

فضل علی:۔ (سرفراز خاں سے) بھائی میں تمہارے ساتھ ہوں اب تم جانو اور یہ لوگ۔

سرفراز:۔ میں ان لوگوں کو ابھی راضی کئے دیتا ہوں مگر یہاں سے چلو۔ عورتیں پریشان ہو رہی ہیں۔ سرکار غش میں پڑی ہیں۔ ذرا ان کو ہوش میں آنے دو۔ ہم تم لوگوں کو خوش کر دیں گے۔

ڈاکو وہاں سے چلے گئے۔ بیگم صاحبہ ابھی تک بے ہوش پڑی تھیں دانت بیٹھ گئے۔ میں تالاب سے ہاتھ میں پانی لائی۔ ان کے منہ پر چھینٹے دیے۔ بڑی مشکل سے ہوش میں آئیں۔ میں نے کہا سنبھل کے بیٹھئے۔ خدا کے فضل سے وہ آفت ٹل گئی۔ خاطر جمع رکھئے اور عورتوں کو بھی پانی چھڑک کر اٹھایا۔ سب اٹھ اٹھ کے بیٹھیں جب اطمینان ہو گیا تو میں نے کل قصہ بیان کیا۔ بیگم صاحبہ بہت خوش ہوئیں۔ سرفراز نماں کو بلا بھیجا۔

سرفراز:۔ سرکار کچھ دے دیجئے۔ بغیر اس کے کام نہ چلے گا۔ اس وقت نہ امراؤ جان یہاں ہوتیں نہ یہ آفت ٹلتی۔

میں نے اس بات کا جواب کچھ نہ دیا۔ اس لئے کہ میں سمجھ گئی کہ اس وقت یہ راز کی بات ان کے منہ سے نکل گئی ہے۔ اس موقعہ پہ ایسی باتوں کا اظہار ان کی شان کے خلاف ہے۔

میں:۔ جی نہیں میں نے کیا کیا، یہ بھی اتفاق تھا۔

مختصر یہ کہ بیگم نے صندوقچہ منگایا پانچ سو نقد اور پانچ سو کا سونے چاندی کا زیور دے کے انہیں ٹالا۔ سب کی جان میں جان آئی۔ بیگم کا اس وقت کا کہنا مجھے آج تک یاد ہے۔

بیگم:۔ کیوں امراؤ جان! باغ میں رہنے کا مزہ دیکھا؟

میں:۔ حضور سچ کہتی تھیں

اب صبح کے تین بج گئے تھے۔ سب لوگ اٹھ اٹھ کے کوٹھی میں گئے۔ ان لوگوں کے ساتھ میں بھی اٹھی۔ کوٹھی کے برآمدے میں ایک پلنگ میرے لئے بچھوا دیا گیا۔ نیند کسے آتی ہے۔ رات بھر جاگ رہی، صبح ہوتے سب سو گئے، میری آنکھ بھی لگ گئی۔ ابھی مند بھر کے سونے نہ پائی تھی کہ میرے خدمت گار سواری لے کے آگئے، مجھے جگوایا۔ میں آنکھیں ملتی ہوئی باہر گئی۔

خدمت گار:۔ آپ تو خوب یہاں آئیں۔ رات بھر ہم لوگ راہ دیکھا کئے۔

میں:۔ کیوں کر آتی۔ سواری کو تو رخصت کر دیا تھا۔

خدمت گار:۔ آپ تو خوب یہاں آئیں۔ رات بھر ہم لوگ راہ دیکھا کئے۔

میں:۔ کیوں کر آتی۔ سواری کو تو رخصت کر دیا تھا۔

خدمت گار:۔ اچھا تو اب چلئے لکھنؤ سے لوگ آپ کے پاس آئے ہیں۔

میں سمجھ گئی۔ ہوں نہ ہوں، بوا حسینی اور گوہر مرزا ہوں گے، آخر پتہ لگا لیا نہ۔

میں:۔ اچھا چلتی ہوں۔ سواری لائے ہو؟

خدمت گار:۔ حاضر ہے۔

جب میں نے جانے کا قصد کیا، دو ایک عورتیں اور جاگ چکی تھیں۔ مجھ کو روکا کہ بیگم صاحبہ سے مل کے جائیے گا۔ میں نے کہا اس وقت کام ہے۔ بیگم صاحبہ خدا جانے کب سو کے اٹھیں گی ایسا ہی ہے تو پھر آؤں گی۔

(١٦)

گھر پہ جو آگے دیکھتی ہوں، بوا حسینی اور میاں گوہر مرزا بیٹھے ہوئے ہیں۔ بوا حسینی میرے گلے سے لپٹ گئیں، رونے لگیں۔ میں بھی رونے لگی۔

بوا حسینی:- اللہ بیٹی! کیا سخت دل کر لیا۔ تمہیں کسی کی محبت ہی نہیں؟

میں بجائے خود شرمندہ تھی۔ جواب کیا دیتی۔ جھوٹ موٹ رونے لگی۔

معمولی گفتگو کے بعد بوا حسینی نے اسی دن لکھنؤ چلنے کا ارادہ کر لیا۔ میں نے لاکھ لاکھ اصرار کیا کہ ٹھہر جاؤ۔ انہوں نے نہ مانا۔ زیادہ عجلت کی وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب بیمار تھے۔ بوا حسینی کو دم بھر کہیں کا ٹھہرنا شاق تھا۔ ایسی ہی میری محبت تھی جو چلی بھی آئی تھی۔ نہ دن کا پندرہ سے اسباب وغیرہ کے خرید نے اور مکان کے کرائے اور نوکروں چاکروں کے حساب کرنے میں تمام ہوا۔ پوری شکرم کرایہ پر کر لی تھی ضروری اسباب اس پہ لاد لیا اور فضول سامان نوکروں کو دے دیا۔ دوسرے دن لکھنؤ پہنچ گئی۔ پھر وہی آب و دانہ ہے۔ وہی

مکان وہی کمرہ وہی آدمی سے

دستِ جنوں کی سیر میں بہلا ہوا تھا دل
زنداں میں لائے پھر مجھے احباب گھیر کے

(۱۷)

دیکھیے، پہنچے کہاں تک شورشِ دل کا اثر
سرِ صحرِ وحشت کا یہ شعلہ ہے بھڑکایا ہُوا

نواب ملک کشور کی سرکار میں سوز خوانی کا سلسلہ انتزاع سلطنت کے زمانہ تک رہا۔ اسی اثنا میں شہزادے مرزا سکندر حشمت عرف جرنیل صاحب کے مجرائیوں میں میرا بھی اسم ہوگیا تھا۔ جناب عالیہ اور جرنیل صاحب کلکتہ چلے گئے۔ وہ تعلق منقطع ہوگیا۔

جس زمانہ میں باغی فوج نے مرزا برجیس قدر کو مسندِ ریاست پر بٹھایا میں بہ لحاظ قدامت اور اس وجہ سے بھی کہ میرا نام شاہی محلات میں اکثر کی زبان پر تھا، مبارک باد دینے کے لئے طلب ہوئی۔ شہر میں ایک اندھیر تھا۔ آج اس کا گھر لٹا، کل وہ گرفتار ہُوا۔ پرسوں اس کے گولی لگی۔ چاروں طرف

قیامت کا سامان نظر آتا تھا۔ سید قطب الدین نامی ایک صاحب افسران فوج میں تھے ان کا تعین درِ دولت پر تھا۔ میرے حال پر بہت عنایت کرتے تھے اس لئے اکثر وہیں رہنا پڑتا تھا۔ مجرے کے لئے بھی وقت بے وقت طلب ہو جاتی تھی

اس چند روزہ حکومت کے زمانہ میں برجیس قدر کی گیارہویں سال کی سالگرہ کا جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ اس جلسہ میں کشمیریوں نے یہ غزل گائی تھی ؎

غیرت مہتاب، ہے برجیس قدر
گوہر نایاب ہے برجیس قدر

میں نے ایک غزل اس موقع کے لئے تصنیف کی تھی اس کا مطلع یہ ہے ؎

دل ہزاروں کے تری بھولی ادائیں لیں گی
حسرتیں چاہنے والوں کی بلائیں لیں گی

رسوا:۔ امراؤ جان! تم نے مطلع تو قیامت ہی کا کہا ہے اور کوئی شعر یاد ہو تو پڑھو۔

امراؤ:۔ گیارہ شعر کہے تھے مگر آپ کے سر کی قسم، سوا اس مطلع کے اور کوئی شعر یاد نہیں، وہ زمانہ ایسی آفت کا تھا۔ نگوڑی دن رات جان دھڑکا میں رہتی تھی۔ غزل ایک پرچہ پر لکھی تھی جس دن کہ بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی ہیں وہ پرچہ میرے پان دان میں تھا۔ پھر جب وہاں سے نکلنا ہوا ہول جول میں پان دان کیا جوتیاں اور دوپٹے تک چھوٹ گئے۔

رسوا:۔ بھلا کچھ یاد ہے کس دن بیگم صاحب قیصر باغ سے نکلی تھیں؟

امراؤ:۔ دن تو یاد نہیں، ہزاری روزے کے دوسرے یا تیسرے دن۔

رسوا:۔ ہاں تمہیں یاد رہا۔ رجب کی انتیسویں تاریخ تھی۔ بھلا فصل

کونسی تھی؟۔

امراؤ:۔ اخیر جاڑے تھے۔ نوروز کے چار پانچ دن باقی رہے ہوں گے۔

رسوا:۔ بالکل درست ہے۔ مارچ کی سولھویں تاریخ تھی اچھا تم بیگم صاحب کے ساتھ قیصر باغ سے نکلیں۔

امراؤ:۔ جی ہاں۔ بونڈی تک ہمراہ گئی۔ راستہ میں نمک حرام اور بزدل افسران فوج کے غمزے اور بیگم صاحب کی خوشامد عمر بھر نہ بھولے گی۔ ایک صاحب کہتے ہیں " لو صاحب ان کے راج میں ہم پیدل چلیں۔ دوسرے صاحب فرماتے ہیں " بھلا کھانے کا تو انتظام درست ہوتا " تیسرے صاحب افیون کو پیٹ رہے تھے۔ چوتھے اپنی جان کو رو رہے ہیں کہ حقہ وقت پر نہیں ملتا۔ جب بہرائچ سے انگریزی فوج نے بونڈی پر حملہ کیا ہے۔ اس میں سید قطب الدین مارے گئے۔ بیگم صاحب نیپال کی طرف روانہ ہوئیں۔ میں اپنی جان بچا کے فیض آباد چلی گئی

رسوا:۔ سنا ہے بونڈی میں چار دن کے لئے خوب چہل پہل ہو گئی تھی۔

امراؤ:۔ آپ نے سنا ہے میں نے ان آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لکھنؤ کے بھاگے ہوئے سب وہیں جمع ہو گئے تھے۔ بونڈی کا بازار لکھنؤ کا چوک معلوم ہوتا تھا۔

رسوا:۔ اچھا اس قصہ سے مجھ کو زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔ یہ کہئے کہ وہ مال جو آپ نے میاں فیضو سے لیا تھا اس کا کیا حشر ہوا؟

امراؤ:۔ (ایک آہ سرد بھر کے) اے ہے، یہ نہ پوچھئے۔

رسوا:۔ غدر میں سب لٹ گیا؟

امراؤ:۔ غدر میں لٹ جاتا تو اتنا افسوس نہ ہوتا۔

رسوا:۔ پھر کیا ہوا؟

امراؤ:۔ سارا قصہ دہرانا پڑیگا۔ جس دن شب کو میں فیضو کے ساتھ بھاگنے والی تھی میں نے کل زیور اور اشرفیاں ایک پٹاری میں بند کیں اوپر سے خوب کپڑا لپیٹ دیا۔

خانم کے مکان کے پچھواڑے ایک میر صاحب رہتے تھے۔ امام باڑے کے کوٹھے کی دیوار پر چڑھ جاؤ تو ان کے مکان کا سامنا ہو جاتا۔ میں اکثر چارپائی لگا کے اس دیوار کو چڑھ جایا کرتی تھی اور میر صاحب کی بہن سے باتیں کرتی تھی

وہ زیور کی پٹاری میں نے ان کی بہن کے پاس پھینک دی اور ان سے ہاتھ جوڑ کے کہا اس کو حفاظت سے رکھنا انہوں نے فیض آباد سے آنے کے بعد وہ پٹاری طرح گودڑ میں لپیٹی ہوئی میرے حوالے کر دی۔ غدر میں تمام دنیا کے گھر لٹے۔ اگر کہہ دیتیں کہ لٹ گئی تو میں ان کا کیا کر لیتی۔ مگر واہ ری بیوی! ایک حبہ تک نقصان نہیں ہوا۔ ایسے ہی لوگوں سے زمین و آسمان تھما ہوا ہے نہیں تو کب کی قیامت آجاتی۔

رسوا:۔ بھلا کتنے کا مال ہوگا؟

امراؤ:۔ کوئی دس پندرہ ہزار کا مال تھا۔

رسوا:۔ اور اب کیا ہوا۔

امراؤ:۔ کیا ہوا۔ جس راہ آیا تھا اسی راہ گیا۔

رسوا:۔ مگر لوگ تو مشہور کرتے ہیں کہ تمہارا ایک حبہ بھی غدر میں نہیں لٹا سب مال تمہارے پاس ہے۔

امراؤ:۔ اگر مال ہوتا تو ان حالوں میں رہتی۔۔۔۔ جیسی اب رہتی ہوں۔

رسوا:۔ لوگ کہتے ہیں تم نے اپنا ٹھگل نکالا ہے۔ اگر نہیں ہے تو خرچ کہاں سے چلتا ہے۔ اب بھی کچھ برے حالوں نہیں رہتیں۔ دو آدمی نوکر ہیں۔ خوش خوراک

اور خوش پوشاک بھی ہو۔

امراؤ:۔ خدا رزاق ہے۔ جو جس کا خرچ ہے وہ اس کو ضرور ملتا ہے۔ پاس مال کا تو ایک حبہ بھی نہیں رہا۔

رسوا:۔ اچھا! تو پھر ہوا۔

امراؤ:۔ اب کیا بتاؤں ایک مہربان......

رسوا:۔ میں سمجھ گیا یہ گوہر مرزا صاحب کی حرکت ہوگی۔

امراؤ:۔ میں اپنے منہ سے نہیں کہتی شاید آپ کا قیاس غلط ہو۔

رسوا:۔ بے شک، تمہارے عالی ظرف ہونے میں کوئی شبہہ نہیں۔ دیکھئے، وہ چین کر رہے ہیں اور تمہیں پوچھتے تک نہیں۔

امراؤ:۔ مرزا صاحب! ونڈ ہی سے رسم رہا رہا: نہ رہا نہ رہا۔ اب وہ مجھے کیوں پوچھیں؟ ؎

مدت ہوئی کہ ترک ملاقات ہوگئی

رسوا:۔ اب کبھی تشریف بھی لاتے ہیں؟

امراؤ:۔ وہ کاہے کو تشریف لائیں گے؟ میں اکثر جایا کرتی ہوں۔ ان کی بیوی سے محبت ہوگئی ہے۔ ابھی چار دن ہوئے لڑکے کی دودھ بڑھائی کی تھی تو بلا بھیجا تھا۔

رسوا:۔ جب بھی کچھ دے ہی آئی ہوگی۔

امراؤ:۔ جی نہیں۔ میں کس قابل ہوں جو کسی کو کچھ دوں گی۔

رسوا:۔ تو وہ مال گوہر مرزا صاحب کے کتنے لگا؟

امراؤ:۔ مرزا صاحب! مال کی کوئی حقیقت نہیں ہے، ہاتھوں کا میل ہے فقط بات رہ جاتی ہے۔ اب بھی اپنے پیدا کرنے والے کے قربان جاؤں، کبھی

خنگی بھو کی نہیں رہتی۔ آپ ایسے قدر دانوں کو خدا سلامت رکھے۔ مجھے کسی بات کی تکلیف نہیں ہے۔

رسوا:۔ اس میں کیا شک۔ وہ تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں، اب بھی سو سے اچھی ہزار سے اچھی۔ واللہ یہ تمہاری نیت کا ثمرہ ہے۔ خدا نے زیارت سے بھی مشرف کیا۔

امراؤ:۔ جی ہاں مولا نے سب مرادیں پوری کیں۔ اب یہ تمنا ہے کہ مجھے کربلا پھر بلا بھیجیں۔ میری مٹی عزیز ہو جائے۔ مرزا صاحب! میں اس ارادے سے گئی تھی کہ پھر کے نہ آؤں گی۔ مگر خدا جانے کیا ہوا تھا کہ لکھنؤ سر پر سوار ہو گیا۔ مگر اب کی اگر خدا نے چاہا اور جانا ہو گیا۔ تو پھر نہ آؤں گی۔

(۱۸)

سن چکے حال تباہی کا مری اور سنو
اب تمہیں کچھ مری تقریر مزا دیتی ہے

بونڈی سے بیگم صاحب اور برجیس قدر نیپال کو روانہ ہوئے۔ سید قطب الدین لڑائی میں مارے جا چکے تھے۔ میں بہ ہزار مشکل فیض آباد آئی۔ پہلے سرائیں اتری پھر توپ لیڈر کے پاس ایک کمرہ کرایہ کو لے لیا تھا۔ میراثی رکھ لئے۔ گانا بجانا شروع کر دیا۔

فیض آباد میں رہتے ہوئے اب مجھے چھ مہینے گذر چکے ہیں۔ وہاں کی آب و ہوا طبیعت کے بہت موافق ہے، دل لگا ہوا ہے۔ آٹھویں دسویں کوئی نہ کوئی مجرا آ جاتا ہے۔ اسی پر بسر ہے۔ تمام شہر میں میرے گانے کی دھوم ہے۔ جہاں مجرا ہوتا ہے ہزاروں آدمی ٹوٹ پڑتے ہیں میرے کمرے کے نیچے لوگ تعریفیں کرتے ہوئے نکلتے ہیں

میں دل میں خوش ہوتی ہوں۔ کبھی کبھی خواب و خیال کی طرح بچپن کی باتیں یاد آجاتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی دل میں ایک جوش سا پیدا ہوتا ہے۔ مگر انتزاع سلطنت غدر، بے جیس غدر، یہ سب سانحے آنکھوں کے سامنے گزر چکے ہیں کلیجہ پتھر کا ہو گیا ہے ماں باپ کے تصور کیا تھی یہ خیال آتا ہے خدا جانے اب کوئی زندہ بھی ہو یا نہ ہو۔ اور اگر ہو تو ان کو مجھ سے کیا مطلب وہ اور عالم میں ہوں گے میں اور عالم میں ہوں۔ خون کا جوش سہی مگر کوئی غیرت دار آدمی مجھ سے ملنا گوارا نہ کرے گا۔ اب ان سے ملنے کی کوشش کرنا ان کو رنج دینا ہے۔" گھر کا خیال آتے ہی وہ باتیں دل میں آتی تھیں۔ پھر طبیعت اور طرف متوجہ ہو جاتی تھی۔

لکھنؤ کی یاد اکثر ستاتی تھی مگر جب انقلاب کا خیال آتا تھا دل بھر جاتا تھا۔ اب وہاں کون ہے، کس کے لئے جاؤں۔ خانم جیتی ہیں تو کیا ہوا۔ ان سے اب کیوں کرنے لگی۔ وہی اگلی حکومت جتائیں گی۔ مجھے اب ان کی قید میں رہنا کسی طرح منظور نہ تھا۔ جو مال میر صاحب کی بہن کے پاس امانت تھا وہ اب کیا ملے گا تمام لکھنؤ لٹ گیا۔ میر صاحب کا گھر بھی لٹ گیا ہوگا۔ اس کا اب خیال ہی بیکار ہے اگر نہیں لٹا تو ابھی اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرے ہاتھ گلے جو کچھ موجود ہے وہ کیا کم ہے

ایک دن میں کمرے پر بیٹھی ہوں۔ ایک صاحب شریفانہ صورت ادھیڑ سے، تشریف لائے، میں نے پان بنا کے دیا۔ حقہ بھروا دیا۔ حالات دریافت کرنے پر معلوم ہوا بہو بیگم صاحبہ کے عزیزوں سے ہیں۔ وثیقہ پاتے ہیں میں نے باتوں باتوں میں منبرہ کی روشنی کی تمہید اٹھا کے پرانے ملازموں کا ذکر چھیڑا۔

میں:۔ اگلے نوکروں میں اب کون کون رہ گیا ہے؟

نواب صاحب:۔ اکثر مر گئے۔ نئے نئے نوکر ہیں۔ اب وہ کارخانہ ہی نہیں رہا

بالکل نیا انتظام ہے۔

میں: اگلے نوکروں میں ایک بڈھے جمعدار تھے۔

نواب:۔ ہاں تھے مگر تم انہیں کیا جانو۔

میں:۔ غدر سے پہلے میں ایک مرتبہ محرم میں فیض آباد آئی تھی۔ مقبرے پر روشنی دیکھنے گئی تھی۔ انہوں نے میری بڑی خاطر کی تھی۔

نواب:۔ وہی جمعدار نا، جن کی ایک لڑکی نکل گئی تھی؟

میں:۔ مجھے کیا معلوم (دل میں) ہائے افسانہ اب تک مشہور ہے۔

نواب:۔ یوں تو کئی جمعدار تھے اور اب بھی ہیں مگر روشنی وغیرہ کا انتظام غدر سے پہلے وہی کرتے تھے۔

میں:۔ ایک لڑکا بھی ان کا تھا۔

نواب:۔ تم نے لڑکے کو کہاں دیکھا؟

میں:۔ اس دن ان کے ساتھ ایسی بھی شکل ملتے کم دیکھی ہے بن کے میں پہچان گئی تھی۔

نواب:۔ جمعدار غدر سے پہلے ہی مر گئے، وہی لڑکا ان کی جگہ نوکر ہے۔

اس کے بعد بات ٹالنے کے لئے میں نے اور کچھ حالات ادھر ادھر کے پوچھے۔ نواب صاحب نے سوز پڑھنے کی فرمائش کی۔ میں نے دو سوز سنائے۔ بہت محظوظ ہوئے۔ رات کچھ زیادہ آگئی تھی گھر تشریف لے گئے۔

باپ کے مرنے کا حال سن کے مجھے بہت رنج ہوا۔ اس دن رات بھر رویا کی دوسرے دن بے اختیار جی چاہا بھائی کو جا کے دیکھ آؤں۔ دو دن کے بعد مجرا آگیا۔ اس کی تیاری کرنے لگی۔ جہاں کا مجرا آیا تھا وہاں گئی۔ محلہ کا نام یاد

ہیں۔ مکان کے پاس ایک بہت بڑا پرانا املی کا درخت تھا۔ اس کے نیچے نمگیرہ تنا گیا تھا۔ گرد قناتیں تھیں بہت بڑا مجمع۔ مگر لوگ کچھ ایسے ہی ویسے تھے۔ قناتوں کے پیچھے اور سامنے کھپریلوں میں عورتیں تھیں پہلا مجرا کوئی نو بجے شروع ہوا، بارہ بجے تک رہا۔ اس مقام کو دیکھ کے دہشت سی ہوتی تھی۔ دل امڈا چلا آتا تھا کہ یہیں میرا مکان ہے۔ یہ املی کا درخت وہی ہے جس کے نیچے میں کھیلا کرتی تھیں۔ جو لوگ محفل میں شریک تھے ان میں سے بعض آدمی ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ان کو میں نے کہیں دیکھا ہے۔ شبہ مٹانے کے لئے میں قناتوں کے باہر نکلی۔ گھروں کی قطع کچھ اور ہو گئی تھی اس سے خیال ہوا شاید یہ وہ جگہ نہ ہو۔ ایک مکان کے دروازے کو غور سے دیکھا کی۔ دل کو یقین ہو گیا تھا کہ یہی میرا مکان ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مکان میں گھسی چلی جاؤں۔ ماں کے قدموں پر گروں۔ وہ گلے لگا لیں گی۔ مگر جرأت نہ ہوتی تھی۔ اس لئے کہ میں جانتی ہوں دیہات میں رنڈیوں سے پرہیز کرتے ہیں دوسرے باپ بھائی کی عزت کا خیال تھا۔ نواب صاحب کی زبانی معلوم ہو چکا تھا کہ جمعدار کی لڑکی کا نکل جانا لوگوں کو معلوم ہے۔ پھر جی کڑھتا تھا ہائے کیا غضب ہے صرف ایک دیوار کی آڑ ہے۔ ادھر میری اماں بیٹھی ہوں گی اور میں یہاں ان کے لئے تڑپ رہی ہوں۔ اک نظر صورت دیکھنا بھی ممکن نہیں۔ کیا مجبوری ہے!! اسی ادھیڑبن میں تھی کہ ایک عورت نے آکے پوچھا۔ "تم لکھنؤ سے آئی ہو؟"

میں:۔ ہاں (اب تو میرا کلیجہ ہاتھوں اچھلنے لگا)۔

عورت:۔ اچھا تو ادھر چلی آؤ۔ تمہیں کوئی بلاتا ہے۔

میں: اچھا، کہہ کے اس کے ساتھ چلی۔ ایک ایک پاؤں گویا سو سو من کا ہو گیا تھا۔ قدم رکھتی تھی۔ کہیں اور پڑتا تھا کہیں۔

وہ عورت اُس مکان کے دروازے پر مجھ کو لے گئی جسے میں اپنا مکان سمجھے ہوئے تھی۔ اس مکان کی ڈیوڑھی میں مجھ کو بٹھا دیا۔ اندر کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے دو تین عورتیں آکے کھڑی ہوئیں۔

ایک :۔ لکھنؤ سے تمہیں آئی ہو؟

میں :۔ جی ہاں۔

دوسری :۔ تمہارا نام کیا ہے؟

میں :۔ (جی میں تو آیا کہ کہہ دوں مگر دل کو تھام کے) امراؤ جان۔

پہلی :۔ تمہارا وطن خاص لکھنؤ ہے۔

میں :۔ (اب مجھ سے ضبط نہ ہوسکا۔ آنسو نکل پڑے) اصلی وطن تو یہی ہے جہاں کھڑی ہوں۔

پہلی :۔ تو کیا بنگلے کی رہنے والی ہو؟

میں :۔ (آنکھوں سے آنسو برابر جاری تھے بمشکل جواب دیا) جی ہاں۔

دوسری :۔ کیا تم ذات کی پتریا ہو؟

میں :۔ ذات کی پتریا تو نہیں ہوں تقدیر کا لکھا پورا کر رہی ہوں۔

پہلی :۔ (خود رو کے) اچھا تو روتی کیوں ہو؟ آخر کہو تم کون ہو؟

میں :۔ (آنسو پونچھ کے) کیا بتاؤں کون ہوں کچھ کہتے بن نہیں پڑتا۔ اتنی باتیں میں نے بہت دل سنبھال کے کی تھیں، اب بالکل تاب ضبط نہ تھی۔ سینے میں دم رکنے لگا تھا۔

اتنے میں دو عورتیں پردے کے باہر نکلیں۔ ایک کے ہاتھ میں چراغ تھا۔ اس نے میرے منہ کو ہاتھ سے تھام کے کان کی لو کے پاس غور سے دیکھا اور یہ کہہ کے دوسری کو دکھایا اور کہا، "کیوں ہم نہ کہتے تھے وہی ہے!!"

دوسری :- ہائے ایری امیرن!

یہ کہہ کے لپٹ گئی ہم دونوں، ماں بیٹیاں چیخیں مار مار کے رونے لگیں ہچکیاں بندھ گئیں۔ آخر دو عورتوں نے آکے چھڑایا۔ اس کے بعد میں نے اپنا سارا قصہ دہرایا۔ باقی رات ہم دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ صبح ہوتے ہی رخصت ہوئی۔ ماں نے چلتے وقت جس حسرت بھری نگاہ سے مجھے دیکھا تھا وہ نگاہ مرتے دم تک

....

.... نہ بھولے گی۔ مگر مجبوری۔ روز روشن نہ ہونے پایا تھا کہ سوار ہو کر اپنے کمرے پر چلی آئی۔ دوسرے مجرا صبح کو ہوتا مگر میں نے گھر پر آکے کل روپیہ مجرے کا واپس دیا اور بیماری کا بہانا کہلا بھیجا۔ دولھا کے باپ نے آدھا روپیہ پھیر دیا۔ اس دن، دن بھر جو میرا حال رہا خدا ہی پر خوب روشن ہے۔ کمرے کے دروازے بند کر کے دن بھر پڑی رویا کی۔

دوسرے دن شام کو، کوئی آدھی گھڑی رات گئے۔ ایک جوان سا آدمی سانولی رنگت کرتی ہیں بائیس کا سن، پگڑی باندھے، سپاہیوں کی ایسی وردی پہنے میرے کمرے پر آیا۔ میں نے حقہ بھروا دیا۔ پان دان میں پان نہ تھے، ماما کو بلا کے چپکے سے کہا "پان لے آؤ" اتفاق سے اور کوئی بھی اس وقت نہ تھا۔ کمرے میں ہم اور وہ ہے۔

جوان :- کل تمہیں مجرے کو گئی تھیں؟ (یہ اس تیور سے کہا کہ میں جھجک گئی)

میں :- ہاں۔

اتنا کہہ کے اس کے چہرے کی طرف جو دیکھا یہ معلوم ہوتا تھا جیسے آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔

جوان :۔ (سرنیچا کرکے) خوب گھرانے کا نام روشن کیا ۔

میں :۔ (اب سمجھی کہ یہ کون شخص ہے) اس کو تو خدا ہی جانتا ہے ۔

جوان :۔ ہم تو سمجھے تھے کہ تم مرگئیں مگر تم اب تک زندہ ہو ۔

میں :۔ بے غیرت زندگی تھی نہ مری ۔ خدا کہیں جلد موت دے ۔

جوان :۔ بیشک اس زندگی سے موت لاکھ درجہ بہتر تھی ۔ تمہیں تو چلو بھر پانی میں ڈوب مرنا تھا ۔ کچھ کھا کے سو رہتیں ۔

میں :۔ خود اتنی سمجھ نہ تھی ، نہ آج تک کسی نے یہ نیک صلاح دی ۔

جوان :۔ اگر ایسی ہی غیرت دار ہوتیں تو اس شہر میں کبھی نہ آتیں اور آئی بھی تھیں تو اس محلہ میں مجرے کو نہ آنا تھا جہاں کی رہنے والی تھیں ۔

میں :۔ ہاں اتنی خطا ضرور ہوئی مگر مجھے کیا معلوم تھا ؟

جوان :۔ اچھا اب تو معلوم ہوگیا ۔

میں :۔ اب کیا ہوتا ہے ۔

جوان :۔ (بہت ہی غصے ہو کے) اب کیا ہوتا ہے ! ۔ اب کیا ہوتا ہے ۔ اب (چھری کمر سے نکال کے مجھ پر جھپٹا ۔ دونوں ہاتھ پکڑ کے گلے پر چھری رکھ دی) یہ ہوتا ہے ....

.... اتنے میں ماما بازار سے پان لے کے آئی ۔ اس نے جو یہ حال دیکھا لگی چیخنے "ارے دوڑو ، بیوی کو کوئی مارے ڈالتا ہے ۔

جوان :۔ (چھری گلے سے ہٹا کے ، ہاتھ چھوڑ دیئے) عورت کو کیا ماریں ! اور عورت بھی کون ؟ بڑی ...... ؟

اتنا کہہ کے دھاڑیں مار مار رونے لگا ۔

میں پہلے رو رہی تھی ، جب اس نے گلے پر چھری رکھی تھی ، جان کے خوف

سے ایک دھچکا سا کلیجہ پر پہنچا تھا۔ اُس سے دم بخود ہو گئی تھی۔ جب وہ چھوڑ کر رونے لگا میں بھی رونے لگی۔

امانی: دو ایک چیخیں ماری تھیں۔ جب اس نے یہ حال دیکھا، کچھ چپ سی ہو رہی۔ ادھر میں نے اشارے سے منع کیا۔ ایک کنارے کھڑی ہو گئی۔

(جب دونوں خوب رو دھو چکے)

جوان:۔ (ہاتھ جوڑ کے) اچھا تو اس شہر سے کہیں چلی جاؤ۔

میں:۔ کل چلی جاؤں گی، مگر ایک مرتبہ ماں کو اور دیکھ لیتی۔

جوان:۔ بس۔ اب دل سے دور رکھو، معاف کرو۔ کل اماں نے تمہیں گھر پر بلا لیا۔ میں نہ ہُوا، نہیں تو اسی وقت وارا نیارا ہو جاتا۔ محلہ بھر میں چرچے ہو رہے ہیں۔

میں:۔ تم نے دیکھ لیا۔ جان سے تو میں ڈرتی نہیں مگر ہائے تمہاری جان کا خیال ہے۔ تم اپنے بچوں پر سلامت رہو۔ خیر اگر جیتے رہے تو کبھی نہ کبھی خیر و عافیت سن ہی لیا کریں گے۔

جوان:۔ برائے خدا کسی سے ہمارا ذکر نہ کرنا۔

میں:۔ اچھا۔

" وہ جوان تو اٹھ کے چلا گیا۔ میں اپنے غم میں مبتلا تھی۔ ماماؤں نے اور جان کھانا شروع کی " یہ کون تھے جو "

میں:۔ رنڈی کے مکان پر ہزاروں آدمی آتے ہیں۔ تو کوئی تھے تمہیں کیا بہر طور ماما کو ٹال دیا۔ رات کی رات سو رہی۔ صبح کو اُٹھ کے لکھنؤ کے چلنے کی تیاری کی۔ شاموں شام شکرم کرایہ کر کے روانہ ہو گئی۔

(۱۹)

لکھنؤ میں آ کر خانم کے مکان پر اتری۔ وہی چوک، وہی کمرہ، وہی ہم پیشا۔ اگلے آنے والوں میں سے کچھ لوگ کلکتہ چلے گئے تھے، کچھ اور شہروں میں نکل گئے۔ شہر میں نیا انتظام، نئے قانون جاری تھے۔ آصف الدولہ کے امام باڑے میں قلعہ تھا۔ چاروں طرف دھس بنے ہوئے تھے۔ جا بجا چوڑی چوڑی سڑکیں نکل رہی تھیں۔ گلیوں میں کھرنجے بنائے جاتے تھے۔ نالے نالیاں صاف کی جاتی تھیں۔ غرض کہ لکھنؤ اب اور ہی کچھ ہو گیا تھا۔

میں دو چار مہینے خانم کے مکان پر رہی۔ اس کے بعد، بہ لطائف الحیل، ایک علیحدہ کمرہ لے کر رہنا شروع کیا۔ زمانے کے انقلاب کے ساتھ خانم کی طبیعت بھی کچھ بدل گئی تھی۔ مزاج میں ایک قسم کی بے پروائی سی پیدا ہو گئی تھی۔ جو رنڈیاں نکل کے علیحدہ ہو گئی تھیں ان کا تو ذکر کیا، جو ساتھ رہتی تھیں ان کے روپے پیسے سے کوئی واسطہ غرض نہ تھی۔ میرا علیحدہ ہو جانا بھی کچھ ان کے مزاج

کے خلاف نہ گزرا۔ دوسرے تیسرے دن میں جاتی تھی۔ سلام کرکے چلی آتی تھی۔ اسی زمانہ میں نواب محمود علی خان صاحب سے مجھ سے تپاک بڑھا۔ پہلے کچھ دنوں تشریف لایا کئے۔ پھر نوکر رکھا۔ اسکے بعد مجھے پابند کرنا چاہا۔ بھلا مجھ سے کب ہو سکتا کہ لکھنؤ میں رہوں اور قدیم ملنے والوں سے ملاقات ترک کر دوں۔ جب میں نے نواب کی طبیعت کا یہ رنگ دیکھا، ترک تعلق کرنا چاہا۔ نواب صاحب نے عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا کہ مجھ سے نکاح ہے۔ عجب آفت میں جان پھنسی، مقدمے کی پیروی میں ہزاروں روپیہ صرف ہوئے۔ عدالت ابتدائی میں فیصلہ نواب صاحب کے موافق ہوا۔ اب مجھے روپوش ہونا پڑا۔ مدتوں چھپی چھپی پھری۔ وکیل کی معرفت اپیل کی۔ اپیل میں نواب صاحب ہارے۔ نواب صاحب نے عدالت عالیہ میں اپیل کی یہاں بھی ہارے۔ اب ناجائز دھمکیاں دینا شروع کیں: مار ڈالوں گا، ناک کاٹ ڈالوں گا۔ اس زمانہ میں مجھ کو جان کی حفاظت کے لئے دس بارہ آدمی لٹھ بند نوکر رکھنا پڑے۔ جہاں جاتی ہوں آدمی تنیس کے ساتھ ہیں۔ ناک میں دم ہو گیا۔ آخر میں نے فوجداری میں مچلکے کا دعویٰ کیا۔ گواہوں سے ثابت کرا دیا گیا نواب شک بے شک درپے آزار ہیں۔ حاکم نے نواب صاحب سے مچلکہ لے لیا۔ اب جا کے جان چھوٹی۔ چھ برس تک ان مقدموں میں پھنسی رہی۔ خدا خدا کر کے نجات ہوئی۔

جس زمانہ میں نواب صاحب سے مقدمہ لڑ رہا تھا، ایک صاحب اکبر علی خاں نامی مختار پیشہ چلتے پرزے، آفت کے پرکالے، ناجائز کارروائیوں میں مشاق جعلسازی میں استاد۔ جھوٹے مقدمات بنانے میں وحید عصر، عدالت کو دھوکا دینے میں یگانۂ زمانہ۔ میری طرف سے پیروکار تھے۔ ان کی وجہ سے عدالتی کاموں میں بہت مدد ملی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے عدالت سے سر بر ہنہ ہوتی۔ اگرچہ سچا واقعہ یہ ہے کہ نواب صاحب سے اور مجھ سے نکاح نہ تھا مگر عدالتوں میں اکثر سچی بات کے

نے بھی جھوٹے گواہ پیش کرنا ہوتے ہیں۔ فریق ثانی کی طرف سے بالکل جھوٹا دعوی تھا۔ لیکن مقدمہ اس سلیقہ سے بنایا گیا تھا کہ کوئی صورت مفر کی نہ تھی۔ نکاح کے ثبوت میں دو مولوی پیش کئے گئے تھے جن کے ماتھوں پر گھٹے پڑے تھے، بڑے بڑے عمامے سر پہ، عبائیں زیب دوش، ہاتھوں میں تسبیحیں، پاؤں میں کفشیں، بات بات میں قال اللہ تعالیٰ قال الرسول۔ ان کی صورت دیکھ کے حاکم عدالت کیا، کسی نیک نیت آدمی کو کذب و دروغ کا شبہہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ایک بزرگ ناگہ کے وکیل بنے تھے اور ایک منکوحہ کے مگر پھر حق حق ہے اور ناحق ناحق۔ جرح میں اکھڑ گئے۔ نواب کے اور گواہ ان سے زیادہ بگڑے اور ان ہی کی گواہی کی وجہ سے نواب اپیل ہار گئے۔ فوجداری میں میری طرف سے جو گواہ پیش کئے گئے تھے وہ سب اکبر علی کے بنائے ہوئے تھے، بالکل نہ بگڑے۔

اکبر علی خاں کی آمد و رفت میرے مکان پر بہت زمانہ تک رہی۔ انہوں نے میرے ساتھ پورا حق دوستی کا ادا کیا۔ ایک حبہ نہیں لیا بلکہ اپنے پاس سے بہت کچھ صرف کیا۔ واقعی ان کو میرے ساتھ ایک قسم کی محبت تھی۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ برے آدمی کی بالکل برے نہیں ہوتے کسی نہ کسی سے بھلے ضرور ہو جاتے ہیں۔ اگلے زمانے کے چوروں کی نسبت آپ نے سنا ہوگا کہ جب کسی سے دوستی کر لیتے تھے تو اس کا پورا نباہ کرتے تھے۔ بغیر کسی قدر بھلائی کے زندگی بسر نہیں ہو سکتی۔ جو شخص سب سے برا ہو وہ کسی کا ہو کے رہے گا۔ جب تک نواب سے مقدمہ ہوتا رہا، میں کسی اجنبی شخص کو اپنے پاس نہ آنے دیتی تھی، مبادا اس کا بھیجا ہوا خفیہ خبر لینے آیا ہو اور کسی طرح کا نقصان پہونچائے۔ اکبر علی خاں کچہری سے پلٹ کے یہیں آتے تھے۔ شام کو یہیں نماز پڑھتے تھے۔ گھر سے کھانا آتا تھا۔ ہر چند میں نے اصرار کیا کہ مکان سے کھانا منگانے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر انہوں نے نہ مانا۔ آخر مجبور ہو کے چپ ہو رہی۔ میرے گھر کے کھانے سے انکار بھی نہ تھا۔ میں بھی انہیں کے ساتھ

کھانا کماتی تھی - اس زمانہ میں، میں بھی نماز کی پابند ہو گئی تھی - اکبر علی خاں کو تعزیہ داری سے عشق تھا - رمضان اور محرم میں وہ اس قدر نیک کام کرتے تھے جس سے ان کے سال بھر کے گناہوں کی تلافی ہو جاتی تھی - یہ صحیح ہو یا غلط مگر ان کا اعتقاد یہی تھا -

رسوا :- یہ معاملہ ایمان کا ہے، اس لئے مجھے اتنا کہہ لینے دیجئے کہ یہ اعتقاد صحیح نہیں ہے -

امراؤ :- میرے نزدیک بھی ایسا ہی ہے -

رسوا :- عقل مندوں نے گناہ کی دو قسمیں کی ہیں - ایک وہ جن کا اثر اپنی ہی ذات تک رہتا ہے اور دوسرے وہ جن کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے میری رائے ناقص میں پہلی قسم کے گناہ صغیرہ اور دوسری قسم کے گناہ کبیرہ ہیں (اگرچہ اور لوگوں کی رائے اس کے خلاف ہو) جن گناہوں کا اثر دوسروں تک پہنچتا ہے ان کی بخشش وہی لوگ کر سکتے ہیں جن پر اس کا برا اثر پڑا ہو - تم نے خواجہ حافظ کا وہ شعر سنا ہوگا ؎

می خور و مصحف بسوز و آتش اندر کعبہ زن
ساکن بت خانہ باش و مردم آزاری مکن

امراؤ جان ! یاد رکھو - مردم آزاری بہت ہی بری چیز ہے اس کی بخشش کہیں نہیں ہے، اور اگر اس کی بخشش ہو تو معاذ اللہ خدا کی خدائی بے کار ہے -

امراؤ :- میرا تو بال بال میاں گنہگار ہے - مگر اس سے میں بھی کانپتی ہوں -

رسوا :- مگر تم نے دل آزاری بہت کی ہوگی -

امراؤ :- اس کی کوئی سزا نہ ہونی چاہیئے - ہم نے جس قسم کی دل آزاری کی اس میں ایک طرح کی لذت ہے جو اس دل آزاری کا معاوضہ ہو جاتا ہے -

رسوا: ۔ کیا خوب!

امراؤ: ۔ فرض کیجیے ایک صاحب نے ہم کو میلے تماشے میں دیکھ لیا۔ مرنے لگے کوڑی پاس نہیں۔ ہم بے لیے مل سکتے نہیں۔ ان کا دل دکھتا ہے۔ پھر اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔ دوسرے صاحب ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ روپیہ بھی دیتے ہیں۔ ہم ایک اور شخص کے پابند ہیں یا ان سے ملنا نہیں چاہتے۔ اپنا دل ان کی جان پر بنی ہے۔ پھر! ہماری بلا سے۔ بعض سے بعض صاحب ہمارے پاس اس طرح کے آتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں چاہو۔ ہم نہیں چاہتے، اجارہ ہے؟ اس سے ان کو صدمہ پہنچتا ہے، پھر ہماری پاپوش سے۔

رسوا: ۔ یہ سب گولی مارنے کے لائق ہیں مگر برائے خدا کہیں مجھے ان میں سے کسی میں شمار نہ کر لیجیے گا۔

امراؤ: ۔ خدا نہ کرے! آپ خوش باشوں میں ہیں نہ آپ کسی کو چاہتے ہیں نہ کوئی آپ کو چاہتا ہے اور پھر آپ سب کو چاہتے ہیں اور سب آپ کو۔

رسوا: ۔ یہ کیا کہا؟ ایک بات ہے، ہنسی بھی ہے کہیں ایسا ہو سکتا ہے؟

امراؤ: ۔ میں منطق تو زیادہ پڑھی نہیں مگر ہو سکتا ہے جب ایک بات کے دو پیرائے ہوں۔ ایک، چاہنا عقل مندی کے ساتھ ہوتا ہے اور ایک بے وقوفی کے ساتھ۔

رسوا: ۔ اس کی مثال؟

امراؤ: ۔ پہلے کی مثال جیسے آپ مجھ کو چاہتے ہیں، میں آپ کو۔

رسوا: ۔ خیر میرے چاہنے کا حال تو میرا دل ہی جانتا ہے۔ اور آپ کے چاہنے کا حال آپ کے اقرار سے معلوم ہو گیا۔ آگے چلیے دوسری مثال۔

امراؤ: ۔ خیر نہیں چاہتے تو میرا برا چاہتے ہوں گے دوسرے کی مثال

بنئے جیسے فرہاد، رس الٰی۔

رسوا:۔ نہیں اس مثال میں آپ نے غلطی کی اور کوئی مثال دیجئے۔

امراؤ:۔ اچھا جیسے قیس لیلیٰ کو چاہتا تھا۔

رسوا:۔ آپ بھی کیا دقیانوسی خیال ڈھونڈھ کے لائی ہیں۔

امراؤ:۔ اچھا .... لیلیٰ ....

رسوا:۔ (بات کاٹ کے) اس مثال سے معاف کیجئے۔ اس موقع پر مجھ کو ایک شعر یاد آتا ہے سن لیجئے ؎

کیا کہوں تجھ سے محبت وہ بلا ہے ہمدم
ہم کو عبرت نہ ہوئی غیر کے مر جانے سے

امراؤ:۔ ہاں وہ کلکتہ والا معاملہ

رسوا:۔ اتنی دور کہاں پہنچیں؟ کیا لکھنؤ میں ایسے نہیں رہتے

امراؤ:۔ دنیا خالی نہیں ہے۔

رسوا:۔ ہاں میں نے سنا تھا، آپ اکبر علی خاں کے گھر بیٹھ گئی تھیں؟

امراؤ:۔ مجھ سے سن لیجئے۔ جس زمانے میں نواب عدالت ابتدائی سے جیت گئے تھے اور میں روپوش ہوئی ہوں اس زمانہ میں اکبر علی خاں مجھے اپنے مکان لے گئے تھے۔ کئی برس رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس زمانہ میں تین آدمی اس دھوکے میں تھے کہ میں اکبر علی خاں کے گھر بیٹھ گئی۔ ایک تو خود اکبر علی۔ دوسرے ان کی بیوی، تیسرے کا نام نہ بتاؤں گی۔

رسوا:۔ میں بتا دوں؟

امراؤ:۔ گوہر مرزا؟

رسوا:۔ جی نہیں۔

امراؤ:۔ تو پھر اور کون؟ بتا دیجئے۔

رسوا:۔ آپ بتائیے۔

امراؤ:۔ اپنے فقرے کسی اور کو دیجئے۔

رسوا:۔ فقرہ کیسا۔ میں بھی ایک پرچے پر لکھ کے رکھے دیتا ہوں۔ پھر آپ بتائیے۔

امراؤ:۔ بہتر۔

رسوا:۔ پرچہ لکھ کے رکھ دیا۔ اب کہیے۔

امراؤ:۔ تیسرے میں خود۔

رسوا:۔ پرچے میں لکھا تھا "آپ خود"

امراؤ:۔ واہ مرزا صاحب! خوب پہچانا۔

رسوا:۔ آپ کی عنایت ہے۔ ہاں تو کیا گذری؟

امراؤ:۔ گذری کیا سنیے:۔

اول تو انہوں نے مجھے ایک چھوٹے سے مکان میں لے جا کے اتارا۔ جو ان کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ کھڑکی درمیان میں تھی۔ ہوا کچا سا مکان ایک چھوٹی سی دلینیہ آگے چھپر ایک اور چھپر سامنے پڑا ہوا۔ اس میں دو چولہے بنے ہوئے۔ یہ کیا ہے؟ باورچی خانہ۔ اور سب خانے بھی ایسے ہی سمجھ لیجئے۔ اسی مکان میں بھی رہوں اور میاں کے بے تکلف دوست بھی آیا جایا کریں۔ ان میں سے ایک صاحب رئیس موضع شیخ افضل حسین۔ چھوٹتے ہی بھوجی کہنے لگے۔ ان کے بے تکے پن نے ناک میں دم کر دیا۔ پانوں کی فرمائش سے تنگ ہو گئی۔ ہر سنے "بھوجی، پان نہ کھلاؤ گی؟"

ایک دن دو دن، آخر مروت کہاں تک؟ انتہا یہ کہ پان دان میں نے آن

کے آگے سرکا دیا۔ اس دن سے میں خود دست بردار ہوگئی۔ انہوں نے قبضہ کرلیا جیسے کوئی مال موروثی پر قبضہ کرتا ہے۔ پان اس بدتمیزی سے کھاتے تھے کہ دیکھنے والوں کو خواہ مخواہ نفرت ہو جائے۔ کتھے چونے کی کلیوں میں انگلیاں پڑ رہی ہیں۔ زبان سے چاٹ رہے ہیں۔ میں نے جب یہ قرینہ دیکھا۔ چکنی کے چورے اور الائچی پر لبسر کرنے لگی۔ اس میں بھی وہ ساجھا لگائے تھے۔ ایک اور صاحب واجد علی نامی اکثر خصوصاً کھانے کے وقت تشریف لاتے تھے۔ اب یاد نہیں کہ اکبر علی خاں کے برادر نسبتی تھے، ان کے مذاق میں فحش حدِ اعتدال سے زیادہ تھا۔

ان دونوں صاحبوں کے سوا اکبر علی خاں صاحب کے بے تکلف احباب بہت سے تھے جن میں سے اکثر کو مقدمہ بازی کا شوق تھا۔ رات دن قانون چھٹا کرتا تھا۔ مگر جب مرزا صاحب تشریف لے جاتے تو اک ذرا امن ہو جاتی تھی۔

اس مکان سے چند روز کے بعد میری طبیعت حد سے زیادہ اکتا گئی۔ قریب تھا کہ کہیں اور رہنے کا بندوبست کروں کہ ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ اکبر علی خاں کسی مقدمے میں فیض آباد گئے۔ افضل علی اپنے گاؤں۔ اتفاق سے مکان میں کوئی نہیں۔ دروازے کی کنڈی بند کرلی ہے۔ میں اکیلی بیٹھی ہوں کہ اتنے میں کھڑکی جو زنانے مکان کی دیوار میں تھی کھلی اور اکبر علی خاں کی بیوی اندر چلی آئیں۔ مجھے خواہی نخواہی سلام کرنا پڑا۔ انگنائی میں تختوں کا چوکا بچھا تھا۔ اسی کے پاس میرا پلنگ لگا تھا۔ پہلے بڑی دیر تک چپکی کھڑی رہیں آخر میں نے کہا "اللہ بیٹھ جائیے۔" بارے بیٹھ گئیں۔

میں :۔ ہم غریبوں پر کیا عنایت تھی۔ آج ادھر کہاں تشریف آوری ہوئی۔

بیوی :۔ تم کو میرا آنا ناگوار ہو تو چلی جاؤں گی۔

میں :- جی نہیں، آپ کا گھر ہے۔ مجھے ایسا حکم ہو تو مناسب بھی ہے۔

بیوی :- نے، کہاں باتیں نہ بناؤ اگر میرا گھر ہے تو تمہارا بھی گھر ہے اور سچ پوچھو تو نہ میرا نہ تمہارا۔ گھر تو گھر والے کا ہے۔

میں :- جی نہیں! خدا رکھے آپ کے گھر والے کو۔ ان کا بھی ہے اور آپ کا بھی۔

بیوی :- تم اکیلی بیٹھی رہتی ہو۔ آخر ہم بھی آدمی ہیں۔ ادھر کیوں نہیں چلی آتیں۔ ہاں، میاں کا حکم نہ ہوگا۔

میں :- میاں کے حکم کی تو کچھ ایسی تابع نہیں ہوں۔ ہاں آپ کی اجازت کی ضرورت تھی وہ حاصل ہو گئی۔ اب حاضر ہوں گی۔

بیوی :- اچھا تو چلو۔

میں :- چلئے۔

مکان میں جا کے جو دیکھتی ہوں، خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ تانبے کے مٹکے، دیگ، گگرے، پتیلیاں، لوٹے۔ نواڑی کے پلنگ، سہری، تختوں کی چوکیاں، فرش فروش، مگر کسی بات کا قرینہ نہیں۔ انگنائی میں جا بجا کوڑا پڑا ہوا، باورچی خانہ میں سامنے بوا امیرن کھانا پکا رہی ہیں۔ مکھیاں بھن بھن کر رہی ہیں۔ تختوں کے چوکے پر پیک کے چکتے پڑے ہوئے۔ بیوی کے پلنگ پر سنوں گرد۔ اماسن نے پان دان لا کے بیوی کے سامنے رکھ دیا۔ کتھے چونے کے دھبوں میں سارا پان دان چھپا ہوا تھا۔ دیکھ کے میرا تو جی مالش کرنے لگا۔

بیوی نے پان لگا کے دیا۔ میں نے جھٹکی میں دبا لیا باتیں کرنے لگی۔ اسی اثنا میں محلہ کی ایک بڑھیا آ نکلی۔ زمین پر پھسکڑا مار کے بیٹھ گئی۔ بیوی سے (میری طرف) اشارہ کر کے پوچھا: "یہ کون ہیں؟"

بیوی :۔ اب تمہیں کیا بتاؤں۔

میں چپکی رہی اور بڑھیا (اکبر علی خاں کی بیوی سے) "اوئی! جیسے میں جانتی نہیں"۔

میں :۔ بڑی بی۔ پھر جانتی ہو تو اس کا پوچھنا کیا۔

بڑھیا: ۔اوئی بی۔ تم سے میں بات نہیں کرتی۔ میں تو اپنی بہو صاحب سے پوچھتی ہوں۔ میرا منہ تم سے بات کرنے کے لائق نہیں۔ تم بڑی آدمی ہو۔

(میں بڑھیا کا منہ دیکھ کے چپ ہو رہی)

بیوی :۔ اوئی بڑھیا! ذرا سی بات میں جھاڑ کا کانٹا ہو گئی۔

بڑھیا: ۔(بیوی سے) تم تو اس طرح بات چھپاتی ہو، جیسے ہم دشمن ہیں۔ اے، ہم تو ان کی بھلائی کے لئے بات کرتے ہیں۔ یہ ہمیں سے الٹے بگڑتی ہیں۔

بیوی :۔ لے بس، اپنی خیر خواہی رہنے دو۔ بوا تم کسی کے گھر کی اجارہ دار ہو۔

بڑھیا :۔ ہمارا اجارہ کیوں ہونے لگا۔ اب جو نئی نئی آتی جائیں گی ان کا اجارہ ہوتا جائے گا۔

(بڑھیا کی اس بات پر مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ منہ پھیر کے ہنسنے لگی)۔

بیوی :۔ کیوں نہیں۔ اے تم میری سوت ہو (میری طرف مخاطب ہو کے) لے سن لو، خاں صاحب کی پہلی بیوی یہی ہیں۔ لو بیوی، تم اصل میں ان کی سوت ہو۔ میں تو ان کے بعد آئی ہوں۔

بڑھیا :۔ ہوں، اپنے ہوتے سوتوں کی، مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں

منہ در منہ گالیاں دیتی ہو۔ موئی کسبیوں، خانگیوں کی صحبت میں اور کیا سیکھو گی؟
یہی تو سیکھو گی۔

تو۔ اتنے دن مجھے آئے ہوئے، بڑی بیگم صاحب (اکبر علی خاں کی والدہ)
نے آدھی بات مجھے نہیں کہی۔ بہو صاحب گن ونتی ایسی ہیں کہ محلہ کی بڑھیوں
کو گالیاں دیتی ہیں۔

بیوی:۔ (غصہ ہو کر) میں نے تم سے کہہ دیا۔ لڈن کی ماں تم آج سے میرے
پاس نہ آنا۔ وہیں بڑی بیگم کے پاس جا کے بیٹھا کرو۔

(مجھے بہت غصہ تھا مگر میں نے دیکھا کہ بے تکی عورت ہے۔ اس کے منہ
کون لگے۔ ضبط کر کے چپکی ہو رہی)۔

بڑھیا:۔ ہماری بلا آتی ہے۔

بیوی:۔ موئی کی شامتیں آئی ہیں۔ یہ بلا بو غمہ کیا بک رہی ہے؟

بڑھیا:۔ تو کیا تمہارے دبیل ہیں۔ کچھ کسی کے لینے دینے میں نہیں۔ گھڑی
بھر نکل آتے تھے، تم ہم سے ہم تم سے بات کرتے تھے۔ نہ آئیں گے۔

بیوی:۔ ہرگز نہ آنا۔

بڑھیا:۔ اس ضد پہ تو ضرور آئیں گے۔ دیکھیں تو تم ہمارا کیا بناتی ہو۔

بیوی:۔ آؤ گی تو اتنی جوتیاں لگائیں گے کہ سر میں ایک بال نہ رہے گا۔

بڑھیا:۔ کیا تاقت، کیا مجال، منہ جلاؤ۔ جوتیاں ماریں گی بچاری۔

بیوی:۔ لے اٹھو، یہاں سے ٹلو۔ نہیں تو لیتی ہوں ہاتھ میں جوتی۔

بڑھیا:۔ (ایک ٹھٹھا لگا کر) آج تو ہم جوتیاں کھا ہی کے جائیں گے۔
مارو۔ بڑے باپ کی بیٹی ہو۔

(باپ کے نام پہ بیوی کو غصہ آگیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ تھرتھر کانپنے

گئیں)۔

بیوی:۔ دور ہو یہاں سے، کہتی ہوں۔

بڑھیا:۔ اب تو ہم جوتیاں کھا ہی کے جائیں گے۔

بیوی:۔ (مجھ سے مخاطب ہو کے) دیکھو یہ مجھے ضد دلا رہی ہے۔ بے مارے موئی کو نہ چھوڑوں گی۔

میں:۔ بیگم! جانے بھی دیجئے۔ موئی بے تکی ہے۔

بڑھیا:۔ (مجھ سے) تو کچھ نہ بولنا۔ ماں زادی۔ تجھے تو کچا ہی کھا جاؤں گی۔

بیوی:۔ (جوتی پیر سے لے کر) ایک۔ دو۔ تین۔ اب راضی ہوئیں؟

میں:۔ بیگم، جانے دیجئے (ہاتھ سے جوتی چھین لی)

بیوی:۔ نہیں تم نہ بولو۔ موئی کا کچومر نکال ڈالوں گی۔

بڑھیا:۔ اور مارو۔

بیوی نے دوسرے پیر سے جوتی اتار کر پانچ چار اور لگائیں۔ اب تو بڑھیا نے زمین پر پاؤں پھیلا دئے اور زمین پر دوہتڑ مارنا شروع کئے "ہے ہے! ہے ہے مجھے جوتیاں ماریں! اب تو دل ٹھنڈا ہوا۔ سوت کی جلن مجھ پر اتاری۔ ہائے مار، ہائے مار"! چلا چلا کے دوہائی دینا شروع کی۔ باورچی خانے سے بوا امیرن اٹھ کے دوڑیں۔ بڑی بیگم صاحب اپنے دالان سے چلی آئیں۔ ایک آفت برپا ہو گئی بڑی بیگم صاحب کو آتے دیکھ کر اور بھی دوہتڑ مارنا شروع کئے "اس بڑھاپے میں مجھے جوتیاں کھلوائیں۔

بیگم صاحب:۔ لے مجھے کیا معلوم کہ تم پر جوتیاں پڑ رہی ہیں، نہیں تو آکے بچا لیتی۔ آخر بات کیا ہوئی؟

بڑھیا:۔ (میری طرف اشارہ کر کے) اس مال زادی نے مار کھلوائی۔ ارے اس نے مار کھلوائی۔

(میں ٹھگ ماری سی ہو گئی۔ بیگم صاحب سے مجھ سے اس وقت۔ امنا ہوا۔ کچھ کہتے نہیں بن پڑتی)۔

بیوی:۔ پھر ان کا نام لئے جاتی ہے۔

بڑھیا:۔ ہم تو نام لیں گے۔ تم کیا کرتی ہو۔

بیگم:۔ آخر ہوا کیا تھا؟

بڑھیا:۔ مجھ نگوڑ ماری نے اتنا پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ لے بھلا، کیا گناہ کیا؟

بیوی:۔ تم تو کہتی تھیں میں جانتی ہوں۔ پھر پوچھنے سے کیا مطلب تھا؟

بڑھیا:۔ کیا مطلب تھا۔ اچھا مطلب بتا دوں گی۔ تو ہی جو اپنا عوض نہ لے لوں۔ تم نے مارا تو ہے۔

بیگم:۔ چل شفقتل، تو کیا بدلا لے گی۔ ذرا کسی بھلاوے پر نہ بھولنا۔

بڑھیا:۔ میں تم سے کچھ نہیں کہتی۔ تم جو چاہے کہہ لو، تمہارا حق ہے۔

بیگم:۔ تیرے والی کی ایسی تیسی، نکل یہاں سے۔

بڑھیا:۔ لو یہ بھی نکالتی ہوئی آئیں۔ اچھا جاتے ہیں۔ (یہ کہہ کے بڑھیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ لہنگا جھاڑ جھوڑ بڑبڑاتی ہوئی "بڑی نکالنے والی۔ جانے ہیں، جاتے ہیں دیکھیں تو کیوں کر نہیں آنے دیتیں۔")

بیگم صاحب:۔ (بہو سے) آخر تم اس موئی چڑیل کے منہ کیوں لگیں؟

بیوی:۔ اماں جان! آپ کے سر کی قسم میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ تو آپ ہی جیسے کوئی کھری کھاٹ پر سے سو کے آئی تھی۔ سینکڑوں باتیں تو ان

بے چاری کو سنا کے رکھ دیا۔

بیگم صاحب میرے ذکر پر کچھ ناک بھوں چڑھا کے چپکی ہو گئیں۔ مجھ کو اس بڑھیا کی بات تو ناگوار نہیں ہوئی کیوں کہ میں اسے دیوانی سمجھے ہوئے تھی۔ مگر ہاں بیگم صاحب کی بے اعتنائی سے سخت صدمہ ہوا۔ وہ ابھی وہیں کھڑی تھیں کہ میں اٹھ کے کھڑکی کے پاس چلی آئی اور اپنے مکان میں آ بیٹھی۔

بیگم صاحب:۔ (میرے چلے آنے کے بعد بہو سے) او بی بیٹا! تم نے تو اس بڑھیا نگوڑی کو خواہ مخواہ پیٹ ڈالا اور پھر موئی ایک شفتل بازاری کے لئے۔ آخر تمہیں اس کی یہ چک لینا کیا ضرور تھی۔

امیرن:۔ اچھا اس کو جانے دیجئے، جیسی اس نے بدزبانی کی تھی۔ اپنی سزا کو پہنچی۔ یہ پوچھئے کہ کسی خانگیوں سے میل جول کیسا اور بھی وہ جس سے میاں سے آشنائی ہو۔ ابھی وہ لاکے سر پہ بٹھا دیتے تو کیسی ماتامت ڈالتی اور خود فرض کر کے جا کے بلا لائیں۔

بیگم:۔ (امیرن سے) اس کی مجال تھی گھر میں لے آتا۔ ہم نہیں بیٹھے ہیں؟ باہر جس کا جی چاہے آئے، گھر میں کسی کا کیا کام ہے؟ اے لو۔ ان سے (اکبر علی خاں کے باپ) برسوں حسین باندی سے ملاقات رہی۔ اس نے کیسی منتیں کیں۔ میں نے نہیں حامی بھری۔ لو امیرن! جب یہ سوچی کہ آج کو جہاں طرح گھڑی تڑی چلی آئی کل میاں گھر میں بٹھائیں گے، تو یہ چھاتی پر مونگ کون دلوائے گا۔ اپنی پت اپنے ہاتھ ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیوں کو اپنے آگم اندیشے کا خیال نہیں۔

امیرن:۔ سچ ہے بیگم صاحب! اول تو سونڈے بیر بیٹھنے والوں کا گھر گرہستیوں میں کام ہی کیا ہے؟ اگلے لوگ کہتے تھے:۔ ایک درجہ مرد کو گھر میں بلا لے مگر بد عورتوں کو نہ بلائے۔

بیگم :- بوا! بات یہ ہے کہ مرزا اگر چلا بھی آئے گا تو کیا وہ عورتوں میں گھس کے بیٹھے گا۔ کل کی بات ہے، بھاگڑ کے دنوں میں برسوں حسین خاں جمادار گھر ہی چھپے رہے۔ پھر بوا ایک گھر کا رہنا سہنا۔ مگر مجال ہے۔ انہوں نے میرا آنچل تک دیکھا ہو، بات سنی ہو۔ دن دن بھر صحنچی میں گھٹی بیٹھی رہتی تھی۔ ماما اصیلوں سے اشاروں میں باتیں کرتی تھیں۔

امیرن :- ایک تو یہ کہ تم جنک کی کمانے والی بیوی کی صاحبزادی۔ جب ایسوں کے پاس بیٹھو گی کہاں تک بچاؤ ہوگا۔ کہیں اس نے کھیتے چولے کی کلہیوں میں ہاتھ ڈال دیا۔ تمہاری آنکھ بچا کے کٹوری میں پانی پی لیا۔ دوسرے موئی اٹھاہیاں ان کا اتبار (اعتبار) کیا؟ سینکڑوں عارضے میں بھری ہوتی ہیں۔ ان کی تو پرچھائیوں سے بچنا چاہیئے۔

بیگم صاحب :- ایک بات۔ سبھی باتوں ۔۔۔۔۔۔ کا بر اثر ہونا چاہیئے۔۔ پرچھانواں، نانگھن، ٹونے ٹوٹکے، بوا کون کہے ان کو تو سمجھ نہیں، اور جو کچھ کھلا ہی دے۔ مرزا محمد علی کی بہو کو سوت نے جونک کھلا دی۔ دین دنیا سے جاتی رہی۔ نہ آل کی نہ اولاد کی۔

امیرن :- جی ہاں۔ اے لو۔ کیا میں جانتی نہیں؟

بیگم :- بوا یہ سوتاپے کا رشتہ ایسا ہے کہ اس میں الگ تھلگ رہے اچھا یوں تو الگ تھلگ رہنے پر بھی جان نہیں بچتی۔ مجھی کو دیکھو۔ اس موئی ٹکے کی کہاری نے کیا کوئی بات اٹھا رکھی۔ دعا، تعویذ، گنڈے کیسے کیسے نقش میرے سرہانے سے نکلتے تھے۔

امیرن :- پھر اس کو اپنے گھر میں کیوں آنے دیا؟

بیگم :- اے بوا! نوکر تھی۔ میں کیا جانتی تھی کہ اس سے میاں سے لگا لگا ہے

جس دن معلوم ہو گیا، میاں نے کھڑے نکال دیا۔

امیرن:۔ مگر بیگم! ایک بات کہوں، خدا لگتی۔ آپ کی خدمت بہت کی۔

بیگم:۔ یہ خوب کہی، میاں کو چھینا تھا۔ اب کیا اس سے بھی گئی گذری۔ اس بڑھیا کو کیا سمجھتی ہو؟ اس سے بھی گئی گذری۔ اس بڑھیا کو کیا سمجھتی ہو؟ اس سے بھی کسی زمانے میں، میاں سے تھی۔

امیرن:۔ (قہقہہ لگا کر) ہئیں بیگم صاحب۔

بیگم:۔ کیا میں جھوٹ کہوں گی؟ جب ہی تو وہ دہرائی تھی کہ اپنا عوض لے لوں گی۔

امیرن:۔ بہو صاحب! تو پھر آپ کو نہیں چاہیئے تھا سسرے کے حرم کو اتنی جوتیاں"

بیگم:۔ بوا! ان لوگوں کو یہ لحاظ کہاں؟ سچ کہوں، مجھے بھی یہ بات ناگوار ہوئی۔ ان کے منہ پر کہتی ہوں: آج کو موئی نکھائی کے چلتے اسسرے کی حرم کے جوتیاں ماریں۔ کل ساس کو ماریں گی۔

امیرن:۔ ہئیں خدا نہ کرے۔ مگر ہاں، بات کہنے ہی میں آتی ہے۔

ان دونوں بڑھیوں نے بہو صاحب۔ بچاری کو ایسے کونچے دیے کہ آخر بچاری چیخیں مار مار کے رونے لگی۔ میرا یہ حال تھا کہ انگاروں پر لوٹ رہی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ دونوں بڑھیوں کا منہ نوچ لوں۔

رسوا:۔ بائیں بائیں! یہ غصہ! ؎

روکیے گا ذرا طبیعت کو

کہیں ایسا نہ ہو کہ خفت ہو

امراؤ:۔ مرزا صاحب! غصے کی بات ہی تھی۔ ایک انسان کو اتنا ذلیل سمجھنا انسانیت سے بعید ہے۔

انسان کو اتنا ذلیل سمجھنا انسانیت سے بعید ہے۔

رسوا:۔ میرے نزدیک تو کوئی بات نہ تھی جس پر آپ کو اتنا غصہ آیا۔ وہ دونوں بڑھیاں سچ کہتی تھیں۔ اور لاڈن کی ماں بھی بچاری ناحق پٹی۔ حق تو یوں ہے۔ کہ اب آپ چاہے برا مانیں چاہے بھلا۔

امراؤ:۔ واہ مرزا صاحب آپ خوب انصاف کرتے ہیں۔

رسوا:۔ جی ہاں، میرے نزدیک انصاف یہی ہے اس معاملہ میں آپ بھی ایک معاملہ میں آپ بھی ایک حد تک بے قصور تھیں۔ سارا قصور اکبر علی کی بیوی کا تھا۔

امراؤ:۔ ان بے چاری کا کیا قصور تھا؟

رسوا:۔ ایسا قصور تھا کہ اگر میری بیوی ایسا کرتی تو خیر گ ڈولی بلوا کے میکے بھجوا دیتا اور چھ مہینے تک صورت نہ دیکھتا۔ اچھا ایک بات پوچھتے ہیں۔ اکبر علی خاں نے جب یہ واردات سنی تو کیا کہا؟

امراؤ:۔ لاڈن کی ماں پر خوب بگڑے، خوب چلائے کہہ دیا خبردار! یہ ڈائن ہمارے گھر میں نہ آنے پائے۔ کئی مہینے تک اس کا آنا جانا موقوف رہا۔ جب بڑے خاں صاحب آئے تو وہ پھر آنے لگی۔ یہ قصہ ان کے آگے چھیڑا گیا تھا وہ الٹے اکبر علی خاں کی بیوی پر خفا ہوئے۔

رسوا:۔ بڈھے کی عقل بیچ تھی؟

امراؤ:۔ صحیح تھی یا سٹھیا گئے تھے، ذرا لاڈن کی ماں پاؤں دبایا کرتی تھی اس اسی سے اس کی پرچک لیتے تھے کیوں نہ پرچک لیتے۔ لاڈن کی ماں ان کی پرانی آشنا بھی۔

رسوا:۔ پھر آپ ہی قائل ہو جیے، یہ عین۔ ضد اری تھی۔ اچھا اب ایک بات تو بتا دیجیے۔ لاڈن کی ماں جوانی میں کوئی رنڈی تھی، یا گھر گرہست؟ اور بڑا امیرن

کون تھیں؟

امراؤ:۔ لڈن کی ماں موئی ڈھینی تھی، جوانی میں خراب ہوگئی تھی۔ بوا امیرن ایک دیہاتی عورت تھی، ان کا مکان سنڈیلہ کے ضلع میں تھا۔ ایک جوان بیٹا تھا وہ بھی بڑے خان صاحب کے پاس نوکر تھا۔ ایک لڑکی تھی وہ کہیں باہر بیاہی ہوئی تھی

رسوا:۔ بوا امیرن سے اور بڑے خاں صاحب سے تو کوئی تعلق نہ تھا۔

امراؤ:۔ ۔ خدا کو جواب دینا ہے۔ امیرن بڑی نیک عورت تھی۔ سارا محلہ کہتا تھا کہ وہ جوانی میں رانڈ ہو کر میرے یہاں نوکری کو آئی تھی۔ اس دن سے کسی نے اس کو بدراہ نہیں دیکھا۔

رسوا:۔ پورے واقعات آپ کے بیان سے مجھ کو معلوم ہوگئے۔ اور پوچھئے آپ کیا پوچھتی ہیں؟

امراؤ:۔ تو کیا کوئی مقدمہ آپ فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں؟

رسوا:۔ بہت بڑا مقدمہ ہے۔

بات یہ ہے کہ عورتیں تین قسم کی ہوتی ہیں (۱) نیک بختیں (۲) خرابیں (۳) بازاریاں۔ اور دوسری قسم کی عورتیں بھی دو طرح کی ہوتیں ہیں۔ ایک تو وہ جو چوری چھپے عیب کرتی ہیں۔ دوسری وہ جو کھلم کھلا بدکاری پر اتارو ہو جاتی ہیں۔ نیک بختوں کے ساتھ مرد وہ عورتیں مل سکتی ہیں جو بدنام نہ ہوگئی ہوں کیا تمہیں سمجھ نہیں ہے کہ وہ بے چاریاں جو تمام عمر چہار دیواریوں میں قید رہتی ہیں۔ ہزار ہا قسم کی مصیبتیں اٹھاتی ہیں؟ اچھے وقت کے تو سب ساتھی ہوتے ہیں مگر برے وقت میں یہ بے چاریاں ساتھ دیتی ہیں۔

جس زمانہ میں ان کے شوہر جوان ہوتے ہیں۔ دولت پاس ہوتی ہے تو اکثر باہر والیاں مزے اڑاتی ہیں۔ مگر مفلسی اور بڑھاپے کے زمانے میں کوئی پرسان حال نہیں

ہوتا۔ ان وقتوں میں وہی طرح طرح کی تکلیفیں اٹھاتی ہیں اور بچوں کی جان کو دبر کرتی ہیں۔ پھر کیا اہنیں اس کا کوئی فخر نہ ہوگا؟ یہی فخر اس کا باعث ہوتا ہے کہ وہ خراب عورتوں کو بہت ہی بُری نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ انہتا کا ذلیل سمجھتی ہیں۔ توبہ استغفار سے خدا گناہ معاف کر دیتا ہے مگر یہ عورتیں کبھی نہیں معاف کرتیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ گھر کی عورت کیسی خوب صورت، خوب سیرت اور خوش سلیقہ کیوں نہ ہو، بے وقوف مرد بازاریوں پر جو ان سے صورت اور دوسری صفتوں میں بدرجہا بدتر ہیں۔ فریفتہ ہو کر انہیں عارضی طور سے یا مدت العمر کے لئے ترک کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کو گمان کیا بلکہ یقین ہے کہ یہ کسی نہ کسی قسم کا جادو ٹونا ایسا کر دیتی ہیں جس سے مرد کی عقل میں فتور آجاتا ہے۔ یہ بھی ان کی ایک قسم کی نیکی ہے۔ اس لئے کہ وہ اس حال میں اپنے مردوں کو الزام نہیں دیتیں بلکہ بدکار عورتوں ہی کو مجرم ٹھہراتی ہیں۔ اس سے زیادہ ان کی محبت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟

امراؤ:۔ یہ تو سب صحیح ہے مگر مرد کیوں ایسے بے وقوف بن جاتے ہیں۔

رسوا:۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے مزاج میں جذبات پسندی ہے۔ ایک حالت میں زندگی بسر کرنے سے خواہ وہ کیسی ہی عمدہ کیوں نہ ہو طبیعت اکتا جاتی ہے وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کا تغیر اس کی حالت زندگی میں پیدا ہو۔ شاہد ان بازاری کے ساتھ معاشرت کرنے میں ایک قسم کی نئی لذت ملتی ہے جو کبھی اس کے خیال میں نہ تھی۔ یہاں کبھی ایک ہی کے تعارف پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ جدت کی تلاش میں روز نئے گھروں پر پہنچتا ہے اور نئے گھر دیکھتا پھرتا ہے۔

امراؤ:۔ مگر سب مرد ایسے نہیں ہیں۔

رسوا:۔ ہاں! اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن معاشرت کے قانون نے اس مرد کو معیوب قرار دیا ہے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے اس کے عزیز و اقارب، دوست، احباب ملامت

کرتے ہیں۔ اس خوف سے اکثر جراءت نہیں ہوتی مگر جب اخوان الشیاطین کی صحبت میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا ہے وہ طرح طرح کی لذتوں کا ذکر کر کے ایک عجیب قسم کا شوق ان کی طبیعت میں پیدا کر دیتے ہیں۔ اس لئے وہ خوف ان کے دل سے نکل جاتا ہے۔ آپ کو اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوا ہوگا کہ جو لوگ پہلے پہل رنڈی کے مکان پر جاتے ہیں ان کو اخفائے راز کا کس قدر خیال ہوتا ہے۔ کوئی دیکھتا نہ ہو۔ کوئی سن نہ لے۔ دو آدمیوں کے سامنے تو بولنے کا کیا ذکر، تخلیہ میں بھی منہ سے بات نہیں نکلتی مگر رفتہ رفتہ یہ حالت تو بالکل زائل ہو جاتی ہے۔ خلاصہ یہ کہ چند ہی روز میں پورے بے غیرت ہو جایا کرتے ہیں۔ پھر کیا ہے، دن دھاڑے سرچوک رنڈیوں کے کمروں پر کھٹ کھٹ کر کے چڑھے جاتے ہیں۔ گاڑی میں کھڑکیاں کھول کر ساتھ بیٹھ کر سیر کرنا۔ ہاتھ میں ہاتھ لے کے میلے تماشوں میں لئے پھرنا ان سب باتوں کو فخر سمجھنے لگتے ہیں۔

امراؤ:- یہ تو صحیح ہے مگر شہروں میں ان باتوں کو چنداں معیوب نہیں سمجھتے۔

رسوا:- خصوصاً دہلی اور لکھنؤ میں، یہی ان شہروں کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوا۔ دیہات اور قصبات میں ایسے شریر لوگوں کی صحبت کم ملتی ہے جو نوجوانوں کو ان بدکاریوں پر آمادہ کریں۔ دوسرے وہاں کی رنڈیوں کو اس قدر اقتدار حاصل نہیں ہے اس لئے وہ رؤسا اور زمینداروں کی مطیع فرمان ہوتی ہیں اور بہت ڈرتی ہیں۔ کیوں کہ ان کا آزوقہ بلکہ زندگی ان کے دست قدرت میں ہے اس لئے ان کی اولاد سے بہت چھپے چوری ملتی ہیں اور شہروں میں آزادی ہے کون کس کا دباؤ مانتا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے۔

امراؤ:- مگر دیہاتی جب بگڑتے ہیں تو حد سے زیادہ بگڑ جاتے ہیں۔ مثلاً میاں ارشاد علی خاں کا واقعہ آپ سن چکے ہیں۔

رسوا:- اس کا یہ سبب ہے کہ وہ ان لذتوں سے بالکل نابلد ہوتے ہیں جب
کو اس کا چسکا پڑتا ہے تو وہ اس کی حد سے زیادہ قدر کرتے ہیں اور اہل شہر
کچھ نہ کچھ آگاہ ہوتے ہیں اور اس لئے ان کو زیادہ شغف اور انہماک
سا ہوتا۔

(۲۰)

رسوا :۔ ہاں ! وہ آپ کی لوچی کیا ہوئی ؟ اے ہے بھلا سا نام ہے۔

امراؤ :۔ آبادی۔

رسوا :۔ آبادی کی صورت تو اچھی کتنی۔ میں نے اس وقت دیکھا تھا ج

اس کا سن بارہ برس کا تھا۔ جوانی میں تو اور نکھر گئی ہوگی۔

امراؤ :۔ مرزا صاحب آپ کو خوب یاد ہے۔

رسوا :۔ یاد کو کیا چاہیے، واقع میں بہت قطع دار عورت ہوگی۔ ہم ک

اسی نظر سے دیکھتے تھے کہ کبھی تو جوان ہوگی۔

امراؤ :۔ تو یہ کہیے آپ بھی بی آبادی کے امیدواروں میں تھے۔

رسوا :۔ سنو امراؤ جان ! میری ایک بات یاد رکھنا۔ جہاں کوئی حسین عور

نظر پڑے مجھے ضرور یاد کر لینا۔ اگر ممکن ہو تو امیدواروں میں نام لکھوا دینا اور جو

نخواستہ) میں مر جاؤں تو میرے نام پر فاتحہ دے دینا۔

رسوا:۔ اپنا نام امیدواروں میں اور میرا نام اس کی بہن کے امیدواروں میں لکھوا
۔ بشرطیکہ شرعاً ممنوع نہ ہو۔

امراؤ:۔ کیا خوب! شرع کو کہاں دخل دیا ہے۔

رسوا:۔ شرع کا دخل کہاں نہیں ہے۔ خصوصاً ہماری شرع جس میں کوئی
فروگذاشت نہیں کی گئی ہے۔

امراؤ:۔ سیدھی سی ایک بات کیوں نہیں کہہ دیتے ؎

شرعاً تو جانتے ہیں عرفاً درست ہے

رسوا:۔ یہ اور موقعوں پر کہا جاتا ہے۔ امراؤ جان میری زندگی کا ایک
اصول ہے۔ نیک بخت عورت کو میں اپنی ماں بہن کے برابر سمجھتا ہوں، خواہ وہ
کسی قوم و ملت کی کیوں نہ ہوں اور ایسی حرکتوں سے مجھے سخت صدمہ پہنچتا ہے
جو اس کی پارسائی میں خلل انداز ہوں۔ جو لوگ اس کو ورغلانے یا بدکار بنانے
کی کوشش کرتے ہیں میری رائے میں تو ایل گولی مار دینے کے ہیں مگر فیاض عورتوں کے فیض سے مستفید ہونا
میرے نزدیک کوئی گناہ نہیں

امراؤ:۔ سبحان اللہ۔

رسوا:۔ میر اب اس فضول بات کو رہنے دیجئے۔

...ی جان:۔ کا حال کہئے۔

امراؤ:۔ مرزا صاحب! اگر آپ اس کو جوانی کے عالم میں دیکھتے تو یہ شعر ضرور آپ کی زبان پر ہوتا ؎

ہوتے ہی عدو تو اور ہی کچھ ہوگئے اے دل کہاں کی پاکبازی ہم بھی اب نیت بدلتے ہیں

جوان ہو کے اس نے وہ صورت شکل نکالی تھی کہ سو پچاس رنڈیوں میں ایک تھی۔

رسوا:۔ اب کیا ہوا خدا کے لئے جلدی کہئے۔ مرچ شہر چلی گئی۔ آخر آفت کیا
آئی جو آپ ایسی مایوسی کے کلمات کہتی ہیں۔

امراؤ:۔ ہم سے گئی جہاں سے گئی۔

رسوا:۔ آخر ہے اب کہاں؟

امراؤ:۔ اسپتال میں ہے اور کہاں ہے۔

رسوا:۔ یہ کہیے گل جوانی شگفت۔

امراؤ:۔ جی ماشاء اللہ سے خوب پھولی پھلی۔ صورت بگڑ گئی۔ رنگت اڑ
ہو گئی۔ غرضکہ سڑ کرم ہو گئے۔ اب جان کے لالے پڑے ہیں۔

رسوا:۔ یہ ہوا کیا تھا؟۔

امراؤ:۔ اے ہونا کیا تھا، موئی لونڈے گھری، سفلی چھچھوری! میں نے
چاہا کہ آدمی بنے مگر نہ بنی۔ میں نے کیا نہیں کیا؟ استانی جی کو نوکر رکھا۔ تعلیم د
شروع کیا مگر اس کا دیدہ ایسی باتوں میں کب لگتا تھا۔ جب سے جوان ہوئی میں
کمرہ علیحدہ کر دیا تھا۔ شہر کے چند ذات شریف آ کے بیٹھنے لگے۔ دن رات گانم گ
دھینگا مشتی، جوتم جاتا۔ ایک آفت برپا رہتی تھی۔ ناک میں دم ہو گیا تھا۔ کسی ب
نہیں، جو آیا وارد۔ میں نے مارا پیٹا۔ سمجھایا مگر وہ کب سنتی تھی۔ بچپنے ہی سے ا
کی نگاہ بد تھی۔ اس زمانے میں بوا حسینی کا نواسہ جمن آیا کرتا تھا۔ اس سے ک
کرتی تھی۔ ....

.... میں نے یہ خیال کیا۔ بچہ ہے کھیلنے دو۔ آخر کچھ
باتیں آنکھ سے دیکھیں کہ جمن کی آمدورفت موقوف ہوئی۔ ایک صاحب میرے پاس ت
لایا کرتے تھے۔ ذرا خوش گلو تھے۔ میں گوارا کرتی تھی۔ ان سے چھیڑ چھاڑ شرو
وہ شریف خاندان تو تھے مگر طبیعت پاجی تھی۔ نہ میرا لحاظ کیا۔ نہ اپنی حیثیت دیکھ
ایک دن سرِ شام کیا دیکھتی ہوں۔ ڈیوڑھی میں، بی آبادی سے باتیں ہو رہی ہیں

چھٹن صاحب:۔ اری میں تو تیری صورت کا عاشق ہوں۔ ہائے آبادی کیا ک

امراؤ جان سے ڈرتا ہوں۔

آبادی:۔ ٹھو، ایسی باتیں مجھ سے نہ کیا کرو۔ ڈر کا ہے کا؟

چھٹن:۔ نے آبادی کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ ظالم کیا پیاری پیاری صورت ہے۔

آبادی:۔ پھر نہیں کیا؟

چھٹن:۔ (ایک بوسہ لے کے) ہیں کیا؟ جان جاتی ہے۔ ڈرتے ہیں۔

آبادی:۔ موئے چار آنے تو دئے نہیں جاتے، مرتے ہیں۔ ہمیں مرتے سب کو دیکھا، جنازہ کسی کا بھی نہیں دیکھا۔

چھٹن:۔ چار آنے! جان حاضر ہے۔

آبادی:۔ نگوڑی جان کو میں لے کے کیا کروں گی۔

چھٹن:۔ تمہاری جان کسی کام ہی کی نہیں!

آبادی:۔ لے اب باتیں نہ بناؤ۔ چونی جیب میں پڑی ہے تو دیتے جاؤ!

چھٹن:۔ واللہ! ماں کی تنخواہ نہیں بٹی۔ پرسوں ضرور ضرور لیتا آؤں گا۔

آبادی:۔ اچھا تو اب جان چھوڑو، جاؤ۔

چھٹن:۔ اچھا تو ایک بوسہ تو اور دے دو۔

آبادی:۔ کو چھٹن نے گلے لگایا۔ آبادی نے ان کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کہیں اتفاق سے تین پیسے جیب میں پڑے ہوئے تھے۔ نکال لئے۔

چھٹن:۔ تمہیں ہمارے سر کی قسم یہ پیسے نہ لینا۔ باجی نے رنگ کی پڑیاں اور مسی منگائی ہے۔

آبادی:۔ تمہارے سر کی قسم۔ میں تو نہ دوں گی۔

چھٹن:۔ آخر کیا کرو گی؟ پرسوں چونی لے لینا

آبادی:۔ واہ! خاگینہ لیں گے

چھٹن :۔ تین پیسے کا خاگینہ ؟ اچھا ایک پیسہ لے لو۔

آبادی :۔ تین پیسے کا خاگینہ کچھ بہت ہوا ؟ نگوڑا بہت دن سے جی چاہتا ہے بیوی لینے نہیں دیتیں۔ کہتی ہیں، پیٹ میں درد ہوگا۔ میں تو ایک دن چھپا کے ایک آنہ کا خاگینہ کھا گئی۔ کچھ بھی نہیں ہوا۔

میں نے دل میں کہا "کیوں نہ ہو موئی کال کی ماری بلانوش۔ ہم تو ذرا سا بھی کھا لیں تو بدہضمی ہو جائے۔"

رسوا :۔ کیا اسے کال میں لیا تھا ؟

امراؤ :۔ جی ہاں! ایک روپیہ کو ماں بیچ گئی تھی۔ تین دن کی فاقے سے تھی۔ میں نے روٹی کھلائی اور ایک روپیہ دیا۔ مرزا صاحب مجھے بڑا ترس معلوم ہوا۔ میں نے تو کہا تھا میرے پاس رہ، مگر نہ رہی۔

رسوا :۔ کمبخت کبھی پھر بھی آئی تھی ؟

امراؤ :۔ جی، کئی دفعہ آئی۔ لڑکی کو دیکھ کے بہت خوش ہوئی۔ مجھ کو دعائیں دیتی تھی، سال میں دو ایک مرتبہ آجایا کرتی۔ مجھ سے بھی جو کچھ ہو سکتا تھا سلوک کرتی تھی۔ اب کئی برس سے نہیں آئی۔ خدا جانے مر گئی یا جیتی ہے۔

رسوا :۔ ذات کیا تھی ؟

امراؤ :۔ پاسن۔

رسوا :۔ اچھا تو وہ قصہ تو رہ گیا۔ چھٹن نے چونی دی یا نہیں دی۔

امراؤ :۔ میری جانے بلا۔ چھٹن کے جانے کے بعد میں نے موئی کو خوب کچلا۔ پیسے چھین کے چوک میں اچھال دیے۔

میرے کمرے کے برابر ایک اور چھوٹا سا کمرہ تھا کوئی دو روپے مہینہ کرائے کا۔ اس میں ایک رنڈی آ کے رہی تھی۔ حسنا۔ ابھی جوان تھی۔ اس کی اور آبادی کی بڑی گت

خوب بلی۔ دن بھر دیہیں بیٹھی رہا کرتی تھی ساری خصلتیں حسنا کی اس نے اختیار کر لیں۔

جیسی وہ رنڈی تھی ویسے ہی اس کے آشنا۔ ایک آیا، پاؤ بھر پوریاں بغل کی نے چلا آتا ہے۔ دوسرا پچاس آم دو آنے سینکڑہ کے لیتا آیا۔ کسی سے دو گز ٹینوں کی فرمائش ہے۔ کسی سے مخملی دوٹ کا چونگا ہے۔ میلے تماشے میں دو چار گرگے ساتھ ہیں۔ بڑے بڑے صافے بندھے ہوئے، کف دار کرتے یا انگرکھے، بانس چست، کوئی دھوتی باندھے ہے کوئی چست گھٹنا ڈانٹے ہے۔ ہاتھ میں لٹھ ہے، گلے میں ہار پڑے ہوئے۔ بی حسنا ٹھمک ٹھمک ان کے ساتھ چل رہی ہیں۔ ہرن والی سرا میں ایک بوتل ٹھرے کی اڑی۔ وہاں سے چلے تو جھومتے، لڑکھڑاتے، ناچتے گاتے۔ بی حسنا ابھی اس کی بغل میں تھیں ابھی اس کے گلے میں ہاتھ۔ سرراہ گالم گلوچ، دھول دھپا، جوتم جاتا ہو رہا ہے۔ اس حالت میں دو ایک نو رستے ہی میں گر پڑے۔ تین چار میلے تک پہنچے وہاں چرس پر دم پڑے۔ ان میں سے جو کوئی ہوشیار تھا اس نے بی حسنا کو گانٹھ لیا اور یاروں کو دھتا بتائی، اپنے گھر لے گیا۔ انہیں کے کمرے پر آ کے ٹھہرا اور یار جب میلے سے پلٹ کے آئے۔ کمرے کے نیچے کھڑے چیخ رہے ہیں اور گالیاں دے رہے ہیں اور ڈھیلے مار رہے ہیں۔ بی حسنا اول تو کمرے میں نہیں اور ہیں بھی تو بولیں کیوں۔ اتنے میں کوئی برق انداز چلا آیا۔ اس نے مجمع خلاف کو برہم کیا۔ سب اپنے اپنے گھر کو چلے گئے۔

بس یہی انداز آبادی بھی چاہتی تھی۔ بھلا میں اس کی کب روادار ہوتی۔ آخر حسین علی میرے پاس ایک نواب صاحب آیا کرتے تھے ان کے خدمت گار کا نام تھا اسکے ساتھ نکل گئی۔ اس کے گھر جا کر بیٹھ رہی۔ وہاں اس کی جورو نے قیامت برپا کی گھر سے نکل گئی۔ میاں حسین علی ان پر لٹو تھے۔ بیوی کے نکل جانے کی انہیں کوئی پرواہ نہ ہوئی۔ مگر مشکل یہ درپیش ہوئی کہ اب کھانا کون پکا دے۔ بی آبادی

کو چولھا پھونکنا پڑا۔ یہ اس کی کب عادی تھیں۔ بہرطور چند روز یوں گزرے یہیں ایک بچہ جنیں۔ خدا جانے حسین علی کا تھا یا کسی اور کا دو مہینہ کا ہو کے وہ بچہ جاتا رہا۔ ادھر حسین علی کی جورو نے روٹی کپڑے کا دعویٰ کیا۔ ڈیڑھ روپیہ مہینہ کی ڈگری ہو گئی۔ تین روپیہ نواب دیتے تھے، ڈیڑھ روپیہ میں کیا ہوتا۔ اوپر کی آمدنی پہ بسر تھی۔ اس میں بھی کچھ نہ چلی۔ بی آبادی کسی قدر چٹوری بھی تھیں۔ آخر میاں حسین علی کے گھر سے نکل کے محلہ کے ایک لڑکے کے ساتھ بھاگ گئیں۔ اس کی ماں پٹھانی کٹنی، بڑے مشہوروں میں تھی۔ جہاں دو چار لقندریاں اور رہتی تھیں وہیں ان کا ٹھکانا ہو گیا۔ بی پٹھانی کی روزی میں کسی قدر اور وسعت ہوئی۔ تنے برائے نام رہ گئے۔ میاں تنے کے ایک پیر بھائی میاں سعادت، پٹھانی کو جل دے کے لے اڑے۔ یہ اپنی ماں کے پاس لے گئے۔ ان کی والدہ کو مرغیوں سے شوق تھا۔ مکان کے پاس ایک تکیہ تھا وہاں مرغیاں چرا کرتی تھیں۔ بی آبادی ان کی حفاظت پہ متعین ہوئیں۔ میاں سعادت کسی کارخانے میں کام کرتے تھے۔ دن بھر وہاں چلے جاتے تھے۔ یہ مرغیاں ہنکایا کرتی تھیں۔ وہاں انہوں نے محمد بخش، کلو کنجڑن کے لڑکے سے راہ و رسم پیدا کی بلکہ سعادت کی ماں نے یہ معاملہ دیکھ بھی لیا بیٹے سے کہا اس نے خوب جوتے مارے۔ میاں محمد بخش کے ایک اور یار تھے، میاں امیر۔ نواب امیر مرزا کے خدمتگاروں میں نوکر تھے۔ یہ فن تماش بینی میں طاق تھے۔ وہ اڑا لے گئے۔ انہوں نے ایک مکان میں لے جا کے رکھا۔ یہاں اور یاروں کا مجمع بھی رہتا تھا۔ بی آبادی سب کی دل جوئی میں مصروف رہتی تھیں۔ اس زمانے میں نہیں معلوم کس کی برکت سے خوب پھلیں پھولیں۔ اب میاں امیر کے کس کام کی تھیں۔ اس نے اٹھا کے اسپتال میں پھکوا دیا۔ بالفعل وہیں تشریف رکھتی ہیں اگر آپ فرمائیے تو بلوا دی جائیں۔

رسوا:- مجھے تو معاف ہی کیجئے۔

(۲۱)

ہاتھ آئی مراد منہ مانگی
دل نے پائی مراد منہ مانگی

رجب کی نوچندی تھی۔ کچھ بیٹھے بیٹھے جی میں آئی چلو درگاہ چلیں۔ زیارت ہی کریں۔ سرشام سوار ہو کے پہنچے۔ بڑا مجمع تھا۔ پہلے تو ہیں مردانی درگاہ کے صحن میں ادھر ادھر ٹہلا کی۔ پھر جا کے شمعیں جلائیں۔ حاضری چڑھائی۔ ایک صاحب مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ انہیں سنا۔ پھر ایک مولوی صاحب آئے انہوں نے حدیث پڑھی۔ اس کے بعد ماتم ہوا۔ اب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلنے لگے۔ میں نے بھی زیارت رخصتی پڑھ کے واپسی کا ارادہ کیا دروازے تک پہنچ کے جی میں آیا زنانی درگاہ میں ہوتی چلوں۔ نوحہ خوانی کی شہرت اور نواب ملک کشور کی سرکار سے توسل کی وجہ سے اکثر عورتیں مجھ کو جانتی تھیں۔ میں نے خیال کیا کہ دو چار مل ہی جائنگی

اسی بہانے سے ملاقاتیں ہو جائیں گی۔ سوار ہو کے چو پہلے پر پردہ ڈال کے زنانی درگاہ کے دروازے پر پہنچی۔ محلدار نے آکر سواری اتروائی۔ اندر گئی، میرا خیال غلط نہ تھا۔ اکثر عورتوں سے سامنا ہوا۔ شکوے شکایتیں، غدر کے حالات، ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ بڑی دیر ہو گئی۔ میں واپس آنے ہی کو تھی کہ اتنے میں دیکھتی کیا ہوں داہنی طرف کی صحنچی سے کانپور والی بیگم صاحب نکلی چلی آتی ہیں۔ بڑے ٹھاٹھ ہیں، تولواں جوڑا پہنے ہوئے چار پانچ مہریاں ساتھ ہیں۔ ایک پائنچے سنبھالے ہوئے ہے ایک کے ہاتھ میں پنکھا ہے، ایک لوٹیا خاص دان لئے ہے۔ ایک کے پاس سینی میں تبرکات ہیں۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی دوڑیں۔ کندھے پر ہاتھ رکھ دیے۔

بیگم:۔ اللہ امراؤ! تم تو بڑی بے مروت ہو۔ کانپور سے جو غائب ہوئیں تو آج ملی ہو، وہ بھی اتفاق سے۔

میں:۔ کیا کہوں جس دن آپ کے باغ میں رات کو رہی تھی اسی دن صبح کو لکھنؤ سے لوگ آگئے مجھے پکڑ کے لکھنؤ لے گئے۔ پھر بھاگڑ ہوئی۔ خدا جانے کہاں کہاں ماری ماری پھری۔ نہ مجھے آپ کا پتہ تھا، نہ آپ کو میرا حال معلوم تھا۔

بیگم:۔ خیر اب تو ہم تم دونوں لکھنؤ میں ہیں۔

میں:۔ لکھنؤ کیا؟ اس وقت تو ایک ہی مقام پر ہیں۔

بیگم:۔ اس کی سند نہیں۔ تمہیں تو میرے مکان پر آنا ہوگا۔

میں:۔ سر آنکھوں سے، مگر آپ رہتی کہاں ہیں؟

بیگم:۔ چوپٹیوں پہ نواب صاحب کو کون نہیں جانتا۔

میں:۔ پوچھنے ہی کو تھی کہ کون نواب صاحب اتنے میں ایک مہری بول اٹھی نواب محمد تقی خاں کا مکان کون نہیں جانتا۔

میں:۔ آنے کو تو آؤں گی اگر نواب صاحب کے خلاف نہ ہو۔

بیگم :- نہیں وہ اس طبیعت کے آدمی نہیں ہیں اور پھر تمہارے واسطے میں نے اس رات کا حال رتی رتی ان سے کہا تھا۔ انہوں نے تو خود کانپور میں کئی مرتبہ ڈھنڈوایا اکثر پوچھتے رہتے ہیں۔

میں :- اچھا تو ضرور آؤں گی۔

بیگم :- کب آؤ گی؟ وعدہ کرو۔

میں :- اب کی جمعرات کو حاضر ہوں گی۔

بیگم :- آؤ ہی۔ یہ جمعرات کی ارواح تم کب سے ہو گئیں؟ ابھی تو پورے آٹھ دن ہیں۔ ادھر ہی کیوں نہیں آتیں؟

میں :- اچھا تو اگلی پیر کو آؤں گی؟

بیگم :- اتوار کو آؤ۔ نواب بھی گھر میں ہوں گے پیر کے دن شاید کسی انگریز سے ملنے جائیں۔

میں :- مناسب ہے۔ اتوار کو سہی۔

بیگم :- کس وقت آؤ گی؟

میں :- جس وقت کہیے۔ مجھے گھر پہ کوئی کام نہیں۔ ہر وقت برابر ہے۔

بیگم :- تم کہاں رہتی ہو؟

میں :- چوک میں سید حسن خاں کے پھاٹک کے پاس۔

بیگم :- اچھا تو میں مہری کو بھیج دوں گی، اسی کے ساتھ چلی آنا۔

میں :- بہت اچھا۔

بیگم :- اچھا تو خدا حافظ۔

میں :- اچھا ہاں۔ یہ تو کہیے صاحب زادہ کیسا ہے؟

بیگم :- شکر۔ ماشاءاللہ۔ اچھا ہے۔ لو اب تم نے یاد کیا۔

میں :- کیا کہوں، باتوں میں کیسی بھولی۔ اور بھولی کیا، جب چاہتی تھی پوچھوں ایک نہ ایک بات نکل آتی تھی۔

بیگم :- اب تو سلامتی سے ذرا ہوش سنبھالا ہے۔ اچھا کسی دن اسے بھی دیکھ لینا۔

میں :- رات کی نیند حرام۔ لے، اب کچھ نہ کہئے۔ خدا حافظ۔

بیگم :- خدا حافظ۔ دیکھوں ضرور آنا۔

میں :- ایسی بات ہے۔

اتنے میں مہری نے دیکھا کہ باتوں کا سلسلہ پھر چلا، کہنے لگی "بیگم صاحب چلئے دیر سے کہار غل مچا رہے ہیں۔ سواری لگی ہے۔

(۲۲)

ہر چند بہت غور کیا ہم نے شب و روز
دنیا کا طلسمات سمجھ میں نہیں آتا

میں خانم سے علیحدہ ہو گئی تھی مگر جب تک وہ جیتی رہیں اپنا سرپرست سمجھا کی اور سچ یہ ہے کہ انہیں بھی مجھ سے محبت تھی۔ ان کے پاس اس قدر دولت تھی کہ طبیعت غنی ہو گئی تھی۔ سن جو زیادہ ہو گیا تھا تو دنیا کی طرف سے ان کی طبیعت پھر گئی تھی۔ اب ان کو کسی کی کمائی سے کچھ مطلب نہ تھا۔ مگر محبت اسی طرح کرتی تھیں۔ وہ اپنے جیتے جی کسی نوچی کو اپنے سے جدا نہ کرتی تھیں۔ مجھ سے تو ان کو خاص محبت تھی۔ بسم اللہ نے ان کو بہت آزار دئے اس لئے انہیں نفرت سی اس سے ہو گئی تھی لیکن پھر اولاد تھی۔ خورشید جان بھی غدر کے بعد آ گئی تھیں۔ وہ خانم کے پاس رہتی تھیں۔ امیر جان نے علیحدہ کمرہ لے لیا تھا مگر وہ بھی آتی جاتی رہتی تھیں۔

جو کمرہ خانم نے مجھے دیا تھا وہ ان کی زندگی بھر مجھ سے خالی نہیں کرایا گیا۔ میرا اسباب ابھی میں بند رہتا تھا۔ میرا قفل لگا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔

جب جی چاہتا تھا وہیں جا کے رہی تھی۔ سال بھر کہیں رہوں مگر محرم میں تعزیہ داری وہیں کرتی تھی۔ میرے نام کا تعزیہ خانم مرتے دم تک رکھا کیں

جمعرات کو بیگم سے ملاقات ہوئی تھی جمعہ کو آدمی آیا کہ خانم صاحب کی طبیعت کچھ علیل ہے۔ تمہیں یاد کرتی ہیں۔ میں فوراً سوار ہو کر گئی۔ انہیں دیکھ کر گھر پر واپس آنے کا ارادہ کیا کہ جی میں آیا کہ ایک بھاری جوڑا نکالتی بنتی چلوں۔ کمرہ کھولا، دیکھا کمرے میں چاروں طرف جالے لگے ہیں۔ پلنگ پر منوں گرد پڑی ہے، فرش فروش الٹا پڑا ہے، ادھر اُدھر کوڑا پڑا ہے۔ یہ حال دیکھ کے مجھے اپنے گلے دن یاد آئے۔ اللہ ایک دن وہ تھا کہ یہ کمرہ ہر وقت کیسا سجا سجایا رہتا تھا۔ دن میں چار مرتبہ جھاڑو ہوتی تھی، بچھونے جھاڑے جاتے تھے۔ گرد کا نام نہ تھا۔ تنکا تک کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔ یا اب یہ حال ہے کہ دم بھر بیٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہی پلنگ جس پر میں سوتی تھی اب اس پر قدم رکھتے ہوئے کراہیت معلوم ہوتی تھی۔ آدمی ساتھ تھا۔ میں نے اس سے کہا ذرا جالے تو لے لے۔" وہ ایک سینٹھا کہیں سے ڈھونڈھ کے اُٹھا لایا، جالے لینے لگا۔ اتنی دیر میں، میں نے اپنے ہاتھ سے دری الٹی۔ آدمی نے اور میں نے مل کے دری بچھائی۔ چاندنی کو ٹھیک کیا۔ جب فرش درست ہو گیا تو میں نے پلنگ کے بچھونے اٹھوا کے جھڑوا دیے۔ کوٹھری میں سے سنگار دان۔ پان دان۔ اگال دان اٹھا لائی۔ سب چیزیں اپنے اپنے قرینے سے لگا دیں، جس طرح کسی زمانے میں لگی رہتی تھیں۔ خود پلنگ سے تکیہ لگا کے بیٹھی۔ آدمی کے پاس خاصدان تھا پان لے کے کھایا۔ آئینہ سامنے لگا کے منہ دیکھنے لگی۔ اگلا زمانہ یاد آ گیا۔

شباب کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ اس زمانے کے قدردانوں کا تصور بندھ گیا۔ گوہر مرزا کی شرارت، راشد علی کی حماقت۔ فیضو کی محبت، سلطان صاحب کی صورت غرضکہ جو جو صاحب اس کمرے میں آئے تھے مع اپنے اپنے خصوصیات کے میرے پیش نظر تھے۔ وہ کمرہ اس وقت فانوس خیال بن گیا تھا۔ ایک تصویر آنکھ کے سامنے آتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی، پھر دوسری سامنے آتی تھی۔۔۔ .... جب کل صورتیں نظر سے گزر گئیں تو یہ دورہ از سرِ نو پھر شروع ہوا۔ پھر وہی صورتیں ایک دوسرے کے بعد پیش آئیں۔ پہلے تو ایسے دورے جلد جلد ہوئے۔ اب ذرا توقف ہونے لگا اب مجھ کو ہر تصویر پر زیادہ تردد و فکر کرنے کا موقع ملا۔ جو واقعات جس شخص کے متعلق تھے ان پر تفصیلی نظر پڑنے لگی۔ پہلے جب دماغ کو چکر ہوا تھا تو صرف چند ہی تصویریں نظر آتی تھیں۔ اب ہر تصویر سے بہت سی نکلیں اور فانوس خیال کی وسعت بڑھنے لگی۔ تمام زندگی میں جو کچھ دیکھا سب نگاہ کے سامنے تھا۔ اس اثنا میں ایک مرتبہ سلطان صاحب کا پھر خیال آیا تو اس کے ساتھ ہی پہلے مجرے کا تمام جلسہ جس میں سلطان صاحب کو دیکھا اور دوسرے دن ان کے خدمت گار کا آنا، پھر ان کا خود تشریف لانا، مزے مزے کی باتیں، شعر و سخن کا چرچا، خاں صاحب کا مخل صحبت ہونا۔ بدزبانی کرنا، سلطان کا تپنچہ مارنا، خاں صاحب کا گر پڑنا، شمشیر خاں کی جاں نثاری کوتوال کا آنا۔ خاں صاحب کا گھر بھجوایا جانا سلطان صاحب کا نہ آنا، محفل میں ان کو دیکھنا لڑکے کے ہاتھ رقعہ بھیجنا۔ پھر از سرِ نو رسم ہونا۔ نواز گنج کے جلسے یہ سب واقعات اس طرح سے معلوم ہوتے تھے جیسے کل ہوئے ہیں۔ یہ دورے برابر چل رہے تھے مگر جب پہلے مجرے کے بعد سلطان صاحب کے آدمی کا پیام لے کے آنا یاد آتا تھا۔

طبیعت کچھ رک سی جاتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس موقع پر کچھ چھوڑ جاتا ہے اتنے میں آدمی نے زور سے ایک چیخ ماری۔

آدمی:۔ بیوی! دیکھئے وہ کنکھجورا آپ کے دوپٹے پر چڑھا جاتا ہے۔

میں۔ اوچی کہہ کے اٹھی جلدی سے دوپٹہ اتار کے پھینک دیا۔ الگ جا کھڑی ہوئی۔ آدمی نے دوپٹہ اٹھا کے جھاڑا۔ کنکھجورا پٹ سے گرا اور پلنگ کے سرہانے پائے کے نیچے گھس گیا۔ آدمی نے پلنگ کا پایا اٹھایا اب جو دیکھتا ہے تو پائے کے نیچے پانچ اشرفیاں برابر بچھی ہوئی ہیں۔

آدمی:۔ (بہت ہی متعجب ہوکے) ہائیں۔ اے لیجئے۔ یہ کیا ہے؟

میں:۔ (دل میں) اہاہ۔ یہ وہ اشرفیاں ہیں (آدمی سے) اشرفیاں ہیں

آدمی:۔ واہ اشرفیاں یہاں کہاں سے آئیں؟

میں:۔ (ہنس کے) وہ کنکھجورا اشرفیاں بن گیا۔ اچھا اٹھا لو۔

آدمی پہلے تو ذرا جھجکا پھر پانچوں اشرفیاں مجھے اٹھا کے حوالہ کیں۔

رسوا:۔ تو کیا خانم کا مکان غدر میں نہیں لٹا؟

امراؤ:۔ لٹا کیوں نہیں؟ مگر فرض کر لیجئے کہ میرے پلنگ کا پایا کسی نے اٹھا کے نہیں دیکھا۔

رسوا:۔ ممکن ہے۔

(۲۲)

کسی طرح سے ہو تسکین شوق، کیسا رشک؟
ملیں گے آج ہم ان سے، رقیب سے مل کے

اتوار کے دن ۸ بجے صبح کو بیگم صاحب کی مہری نینس اور کہارے کے
ہر پہ سنز اول ہوگئی۔ میں ابھی سو کے اٹھی تھی۔ اچھی طرح حقہ بھی نہ پینے
ی تھی کہ اس نے جلدی مچانا شروع کر دی۔ میں سمجھی تھی کھانا وانا کھا
جانا ہوگا۔ مہری نے کہا بیگم صاحب نے اپنے سر کی قسم دی ہے کہ کھانا ہیں
کے کھانا۔ میں نے پوچھا "نواب صاحب گھر پہ ہیں؟" اس نے کہا "نہیں، صبح
اٹھ کے گاؤں کو سدھارے ہیں۔" میں نے پوچھا "کب تک آئیں گے؟" مہری
کہا "اب آئیں تو شام کو آئیں۔" مجھے بیگم سے بہت سی باتیں کرنا تھیں۔ اسی لئے
را اٹھ بیٹھی۔ ہاتھ منہ دھو کے، کنگھی چوٹی کر، کپڑے پہن ایک ماما کو ساتھ

لے کے روانہ ہو گئی۔

جا کے جو دیکھا بیگم صاحب منتظر بیٹھی ہیں۔ میرے جانے کے ساتھ ہی دستر خوان بچھا۔ بہت تکلف کا کھانا تھا۔ پراٹھے، قورمہ، کئی طرح کا سالن، بالائی، چینی چاول کا خشکہ، نورتن چٹنی، سیب کا مربہ، حلوا سوہن کھانا کھ کے چپکے سے میرے کان میں:۔

بیگم:۔ کیوں وہ کریم کے گھر کی ارہر کی دال اور جوار کی روٹیاں بھی یاد ہیں۔

میں:۔ چپ بھی رہو، کوئی سن نہ لے۔

بیگم:۔ سن لے گا تو کیا ہوگا، کیا کوئی جانتا نہیں، نواب کی ماں (خدا جنت نصیب کرے) انے مجھے نواب کے لئے مول لیا تھا۔

میں:۔ برائے خدا چپ رہو، کہیں علیحدہ چلو تو باتیں ہوں گی۔

کھانا کھا کے ہاتھ منہ دھویا، پان کھایا۔ مہری نے حقہ لا کے لگایا۔ بیگم نے سب کو بہانے سے ٹال دیا۔

میں:۔ بارے تم نے مجھے پہچان لیا۔

بیگم:۔ جب تمہیں پہلے پہل کانپور میں دیکھا تھا، اسی دن پہچان لیا تھا پہلے تو بڑی دیر تک اُلجھن سی ہی رہی، دل میں کہتی تھی میں نے انہیں کہیں دیکھا ہے مگر کہاں دیکھا ہے؟ یہ کچھ یاد نہیں آتا۔ چاروں طرف خیال دوڑاتی تھی کچھ سمجھ ہی نہیں آتا تھا اتنے میں کریمن مہری پہ نظر پڑی۔ کریمن کے نام پر موئے ڈاکو کریم کا نام آ گیا۔ دل نے کہا کہ اوہو ہو، انہیں کریم کے مکان پر دیکھا تھا۔

میں:۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ بڑی دیر تک غور کیا کی۔ میری ساتھ والی

دیں ایک خورشید ہے، اس کی صورت تم سے بہت ملتی ہے۔ جب میں خورشید کو دیکھتی تھی تم
تم یاد آجاتی تھیں۔

بیگم :۔ اب میرا حال سنو:۔

میں جب تم سے جدا ہو کے نواب صاحب کی ماں نواب عمدۃ النساء بیگم صاحب
مانتہ بکی ہوں تمہیں یاد ہوگا، میرا سن کوئی بارہ برس کا ہوگا۔ نواب کو سولھواں
برس تھا۔ نواب کے ابا جان کانپور میں رہتے تھے۔ بیگم صاحب سے ان سے نا
اتفاقی رہتی تھی۔ نواب صاحب کے ابا جان نے نواب کی شادی اپنی بہن کی
لڑکی کے ساتھ ٹھہرائی تھی۔ ان کا مکان دہلی میں تھا۔ بیگم صاحب کو وہاں
شادی ان کے بھائی کی لڑکی کے ساتھ ہو۔ میاں بیوی میں پہلے ہی سے نااتفاقی
تھی۔ اس بات سے اور ضدیں بڑھیں۔ ابھی یہ جھگڑا طے نہ ہوا تھا کہ نواب کے
دشمنوں کی طبیعت کچھ ناساز تھی۔ حکیموں نے تجویز کیا کہ بہت جلد شادی کر دینا
چاہئے، ورنہ جنون ہو جائے گا۔ شادی ہو جانا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اتنے میں میں پہنچ
گئی۔ بیگم صاحب نے مجھے خرید لیا۔

نواب صاحب مجھ پر مائل ہو گئے اور ایسے مائل ہوئے کہ دونوں جگہ کی شادی
کھلم کھلا انکار کر دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ بیگم صاحب
نے انتقال کیا اور اس کے چند ہی سال بعد بڑے نواب بھی مر گئے۔ ماں باپ دونوں صاحب
مراد تھے۔ یہی ایک اکلوتے لڑکے تھے۔ کل دولت انہیں کو ملی۔

نواب صاحب کو خدا سلامت رکھے جن کی بدولت بیگم صاحب بنی ہوئی ہوں
عیش کرتی ہوں۔ نواب مجھے اس طرح چاہتے ہیں جیسے کوئی اپنے سہرے جلوے کی
بیوی کو چاہتا ہو۔ میری ظاہر میں تو کسی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہیں دیکھا یوں
پھر اپنے دوست آشناؤں میں جو کچھ چاہتے ہوں کرتے ہوں۔ آخر مرد ذات ہیں۔

مجھ میں ان کے پیچھے تو پھرتی نہیں۔

خدا نے سب آرزوئیں میری پوری کیں۔ اولاد کی ہوس تھی، خدا کے صدقے سے اولاد بھی ہے۔ اب اگر آرزو ہے تو یہ ہے کہ خدا بچی کو پروان چڑھائے۔ بہو بیاہ کے لاؤں اور ایک پوتا کھلاؤں۔ پھر چاہے مر جاؤں۔ نواب کے ہاتھوں مٹی عزیز ہو جائے۔ اب تم اپنا حال کہو۔

جب رام دیئی یہ باتیں کر رہی تھی مجھے اپنی قسمت پر افسوس آرہا تھا اور دل ہی دل میں کہتی تھی تقدیر ہو تو ایسی ہو۔ ایک میری پھوٹی تقدیر۔ بکی بھی تو کہاں؟ رنڈی کے گھر میں۔

اس کے بعد میں نے اپنا مختصر حال کہہ سنایا۔ جس سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ میں دن بھر وہیں رہی۔ جب تخلیہ کی باتیں ہو چکیں تو نوکروں کو آواز دی۔ طبلہ کی جوڑیاں، ستار، طنبورہ یہ سب سامان منگایا۔ گانے بجانے کا جلسہ ہوا۔

جب ہم دونوں اکیلے تھے تو وہ رام دیئی تھیں اور میں امیرن سب لوگوں کے سامنے، پھر وہ بیگم صاحب ہو گئیں اور میں امراؤ جان۔ تین چار گھنٹے تک گانا بجانا ہوتا رہا۔ بیگم بھی کسی قدر ستار بجالیتی تھیں۔ جب میں گا چکتی تھی تو ستار کی وہ کوئی گت چھیڑ دیتی تھیں۔ ایک مغلانی کا گلا بہت اچھا تھا۔ اس کو گوایا۔ سر شام تک بڑے لطف کی صحبت رہی۔

(۲۴)

ہاں اے نگاہِ شوق مناسب ہے احتیاط
ایسا نہ ہو کہ بزم میں چرچا کرے کوئی

قریب شام، محل میں نواب صاحب کی آمد آمد کا غل ہوا، وہ بے تکلفی کی صحبت برہم ہوگئی۔ طبلے کی جوڑی، ستار، طنبورہ، سب چیزیں ہٹادی گئیں چھپنے والیاں اٹھ اٹھ کے پردے میں جانے لگیں اور سب لوگ اپنے اپنے قرینے سے ہوگئے۔ میں بھی بیگم سے الگ ہٹ کے مقطع بن کے بیٹھ گئی۔ جس دالان میں ہم لوگ بیٹھے تھے وہاں سے دروازہ کا سامنا تھا۔ پردہ پڑا ہوا تھا۔ نواب کے انتظار میں اس پردے کی طرف نگاہیں لگی ہوئی تھیں۔ میں بھی اسی طرف دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں کسی خدمت گار نے چلا کے کہا "نواب صاحب آتے ہیں" چند لمحہ کے بعد مہری نے پردہ اٹھا کے کہا "بسم اللہ الرحمان الرحیم" نواب اندر داخل ہوئے۔

میں :- (صورت دیکھتے ہی، دل میں) وہی! تو ہیں (سلطان صاحب) اے ہے،
کس موقع پر سامنا ہوا ہے۔ نواب کی نگاہ مجھ پر پڑی، پہلے تو کچھ جھجکے، پھر بغور
میری طرف دیکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں بھی انہیں کی طرف دیکھ رہی تھی ؎

میں دیکھتا ہوں جوان کی طرف تو حیرت ہے
مری نگاہ کا وہ اضطراب دیکھتے ہیں

اب نواب والاں کے قریب پہنچ گئے اور میری ہی طرف دیکھتے جاتے تھے کہ۔
بیگم :- اوہی نواب، دیکھتے کیا ہو؟ وہی ہیں امراؤ جان جو کانپور......
(انجان بن کے) ہاں میں نے تم سے انہیں کا تذکرہ کیا تھا۔
اب فرش کے قریب پہنچ گئے۔ سب تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے۔ نواب
مسند پر بیگم کے پہلو میں۔ ایک طرف ذرا سرک کے، بیٹھ گئے۔
اب شام ہو گئی تھی۔ مہری نے دو کنول سفید روشن کر کے سامنے رکھے۔ بیگم
پان بنانے لگیں۔ اس عرصہ میں نواب نے آنکھ بچا کے میری طرف دیکھا، میں نے کنکھیوں
سے انہیں دیکھا۔ اب نہ وہ کچھ کہہ سکتے ہیں نہ میں بول سکتی ہوں، منہ سے بولنے
کا موقع نہ تھا۔ مگر اس وقت آنکھیں زبان کا کام دے رہی تھیں۔ شکوے شکایت
رمز و کنایہ، سب اشاروں میں ہو گیا۔
نواب :- (کسی قدر اجنبیت سے) امراؤ جان صاحب! واقعی ہم تو آپ
کے بہت ہی ممنون ہیں۔ واقعی کانپور میں اس شب کو تمہاری وجہ سے ہمارا گھر
لٹنے سے بچ گیا۔
میں :- یہ آپ کیوں مجھے کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں ایک اتفاقی امر تھا۔
نواب :- خیر جو کچھ ہو وجہ تمہاری تھی۔ خیر اسباب تو وہاں کچھ نہ تھا۔
مگر ایک بڑی خیریت ہو گئی تمام ضروری کاغذات کوٹھی میں موجود تھے۔

میں :- یہ حضور ان دنوں جنگل میں عورتوں کو چھوڑ کے کہاں گئے تھے۔

نواب :- کیا کہوں ایسی ہی مجبوری تھی۔ لکھنؤ کی جائداد بادشاہ نے ضبط کر لی تھی۔ لاٹ صاحب کے پاس کلکتہ جانا ضرور تھا۔ ایسی عجلت میں گیا تھا کہ نہ کچھ سامان کیا، نہ لیا نہ دیا۔ صرف شمشیر خاں اور ایک آدمی اور ساتھ لے کے چلا گیا۔

میں :- نہ کوٹھی ایسے جنگلوں میں ہے کہ جو واردات نہ ہو۔ تعجب ہے۔

نواب :- سوائے اس واقعہ کے اور کوئی واردات کبھی نہیں ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ غدر ہونے کو تھا۔ بدمعاشوں نے سر اٹھایا تھا۔ ملک میں اندھیرا مچا تھا۔

اس کے بعد اور ادھر ادھر کی باتیں ہوا کیں۔ پھر دسترخوان بچھا سب نے ساتھ مل کے کھانا کھایا۔ جب حُقّہ پان سے فراغت ہو چکی تو نواب نے گانے کی فرمائش کی۔ میں نے یہ غزل شروع کی ؎

مرتے مرتے نہ قضا یاد آئی	اسی کافر کی ادا یاد آئی
تم کو الفت نہ ادا یاد آئی	یاد آئی تو جفا یاد آئی
ہجر کی رات گزر ہی جاتی	کیوں تری زلفِ رسا یاد آئی
تم جدائی میں بہت یاد آئے	موت تم سے بھی سوا یاد آئی
لذتِ معصیتِ عشق نہ پوچھ	خلد میں بھی یہ بلا یاد آئی
چارہ گر زہر منگا دے تھوڑا	لے مجھے اپنی دوا یاد آئی

اور شعر یاد نہیں، مقطع یہ ہے :-

کیا غزل کوئی کہے ہے۔۔۔۔۔
آج کیوں بادِ صبا یاد آئی

برسات کے دن ہیں، پانی جھما جھم برس رہا ہے۔ آموں کی فصل ہے

میرے کمرے میں مجمع ہے۔ بسم اللہ جان، امیر جان، بیگاں جان۔ خورشید جان۔ رنڈیوں میں۔ نواب بین صاحب، نواب چھبن صاحب، گوہر مرزا، عاشق حسین، تفضیل حسین، امجد علی، اکبر علی خاں مردوں میں۔ یہ سب صاحب موجود ہیں۔ گانا ہو رہا ہے۔ اتنے میں :-

بسم اللہ :- بھئی ہوگا۔ گانا تو روز ہُوا کرتا ہے۔ اس وقت تو کڑھائی چڑھاؤ۔ کچھ پکوان پکواؤ۔ دیکھو کیا مینہ برس رہا ہے۔

میں :- اونہہ، بازار سے جو جی چاہے منگوالو۔

خورشید :- بازار سے منگوالو، یہ خوب کہی۔ اپنے ہاتھ کے پکانے میں مزا ہی اور ہے۔

امیر :- بہن! تمہیں ہنڈیا ٹھونکنے کا مزا ہے، ہم نے نہ تو کبھی پکایا ہے نہ پکانے کی قدر جانتے ہیں۔

بیگا :- تو پھر وہی بازار کی ٹھہری۔

میں :- اے ہے باجی، کیا بھوکی ہو؟

بیگانہ :- میں تو بھوکی نہیں ہوں، بسم اللہ سے پوچھو۔ انہوں نے صلاح دی تھی۔

بسم اللہ :- بھئی کچھ نہ کچھ تو آج ہونا چاہیئے۔

میں : بتاؤں! چلو بخشی کے تالاب چلیں۔

بسم اللہ :- ہاں بھئی، کیا بات کہی ہے۔

خورشید :- خوب سیر ہوگی۔

بیگا :- ہم بھی چلیں گے۔

میں :- اچھا تو سامان کرو۔

بات کرتے ہیں تین گاڑیاں کرایہ پر آگئیں۔ کھانے پکانے کا سامان گاڑیوں پر لدوا یا گیا۔ دو چھولداریاں نواب ہیں صاحب کے گھر سے آگئیں۔ سب گاڑیوں پر سوار ہو کے روانہ ہو گئے۔

گومتی پار پہنچ کے گانا شروع ہوا۔ اس دن بیگا جان کا گانا۔ ؎

جھولا کن ڈارو رے امریاں

کیا کیا تانیں لی ہیں کہ دل پسا جاتا تھا۔

شہر سے نکل کے جنگل کا سماں قابل دید تھا۔ جدھر نگاہ جاتی ہے .... سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے، بادل چاروں طرف گھرے ہوئے ہیں۔ مینہ برس رہا ہے.................، درختوں کے پتوں سے پانی ٹپک رہا ہے، نالے ندیاں بھری ہوئی ہیں، مور ناچ رہے ہیں کوئل کوک رہی ہے۔ بات کہتے ہیں تالاب پر پہنچ گئے۔ بارہ دری میں فرش کیا گیا۔ چولہے بن گئے۔ کڑاھیاں چڑھ گئیں، پوریاں تلی جانے لگیں۔ نواب چھٹن صاحب برساتی پہن کے شکار کو نکل گئے۔ گوہر مرزا آموں کی کھانچیاں چکلائے اتنی دیر میں نوکروں نے سڑک کے کنارے باغ میں چھولداریاں گاڑ دیں۔ گاؤں سے چار پائیاں آگئیں۔ یہاں اور ہی لطف تھا۔ آم ٹپک رہے ہیں۔ ایک ایک آم پر چار چار آدمی ٹوٹے پڑتے ہیں پانی میں چھپکے لگا رہے ہیں۔

کوئی ادھر دوڑا جا رہا ہے، کوئی ادھر۔ آپس میں دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ اب اس میں اگر کوئی گر پڑا تو کیچڑ میں لت پت۔ تھوڑی دیر پانی میں جا کے کھڑے ہو گئے۔ پھر ویسے ہی صاف۔ جن کے مزاج میں کسی قدر احتیاط تھی، جیسے باجی بیگا جان، وہ چھولداری میں بیٹھی رہیں۔

بسم اللہ نے پیچھے سے جا کے منہ پر آم کا رس مل دیا پھر ان کی چیخیں اور

سب کا قہقہہ لگانا، دیکھنے کا تماشہ تھا۔

نہیں معلوم کہاں سے بہتی بہاتی تین نٹنیاں آنکلیں۔ ان کو گانا شروع شروع کیا۔ ان کے ساتھ کا ڈھولکی والا غضب کی ڈھولکی بجاتا تھا۔ بھلا ان کا ناچ گانا ہم لوگوں کو کیا اچھا معلوم ہوتا۔ مگر اس موسم میں اور ویسی جگہ کچھ نامناسب نہ تھا۔ دو گھڑی دن رہے ہماری قسمت سے آسمان کھل گیا۔ دھوپ نکل آئی، ہم لوگ احتیاطاً ایک ایک جوڑا گھر سے لیتے آئے تھے۔ سب نے کپڑے بدلے، جنگل کی سیر کو نکلے۔

میں بھی اکیلی ایک طرف کو روانہ ہوئی۔ سامنے گنجان درخت تھے سورج انہی گنجان درختوں کی آڑ میں ڈوب رہا تھا۔ سبزے پر سنہری کرنوں کے پڑنے سے عجیب کیفیت تھی۔ جا بجا جنگلی پھول کھلے تھے۔ چڑیاں سبزے کی تلاش میں ادھر ادھر اڑ رہی تھیں۔ سامنے جھیل کے پانی پر آفتاب کی شعاع سے وہ عالم نظر آتا تھا، جیسے پگھلا ہوا سونا تھلک رہا ہے۔ درختوں کے پتوں کی آڑ میں سورج کی کرنیں اور ہی عالم دکھا رہی ہیں۔ آسمان پر سرخ شفق پھولی ہوئی تھی۔ اس وقت کا سماں ایسا نہ تھا کہ ایک خفقانی مزاج کی عورت، جیسی کہ میں ہوں، جلدی سے چھولداری میں چلی آتی۔ یہ تماشہ دیکھتی ہوئی۔ خدا جانے کتنی دور نکل گئی۔ آگے جا کر ایک کچی سڑک ملی۔ اس پر کچھ گنوار راستہ چل رہے تھے۔ کسی کے کندھے پر ہل تھا، کوئی بیلوں کو ہانکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی گائے بھینس لئے جاتی تھی۔ ایک لڑکا بہت سی بھیڑیں اور بکریوں کو لئے پیچھے تھا۔ یہ سب آنکھوں کے سامنے آئے اور پھر نظروں سے غائب ہو گئے۔ میں پھر اکیلی رہ گئی، نہیں معلوم کس دھن میں تھی۔ مگر اب میں سڑک پر چلنے لگی۔ اپنے نزدیک میں اب گویا تالاب کی طرف چل رہی ہوں

اب اندھیرا ہوتا جاتا ہے۔ سورج ڈوبنے ہی کو ہے۔ اب میرا قدم جلد جلد اٹھ رہا ہے۔ آگے چل کر ایک فقیر کا تکیہ ملا۔ یہاں۔ یہاں کچھ لوگ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ میں نے "تالاب" کا راستہ پوچھا۔ معلوم ہوا کہ میں لکھنؤ کی سڑک پر جا رہی ہوں" تالاب" دہنے کو چھوٹ گیا ہے۔ یہاں سڑک چھوڑنا پڑی ایک جھبڑ میں سے ہو کے راستہ تھا۔ تھوڑی دور ایک نالہ ملا۔ نالے کے اُس پار تھوڑے فاصلے پر دو تین درخت تھے میں نے دیکھا کہ ان درختوں کی جڑ سے اک ذرا ہٹ کے کوئی شخص میلی سی دھوتی باندھے، مرزئی پہنے، ایک میلا سا چادرہ کمر سے لپیٹا ہوا۔ کھرپی ہاتھ میں لئے کچھ کھود رہا ہے۔ میرے اس شخص کے چار آنکھیں ہوئیں۔ پہلے تو کچھ شبہ سا ہوا۔ پھر ایک مرتبہ غور سے دیکھا۔ اب قریب سے دیکھا۔ اب قریب یقین کے ہو گیا کہ وہی ہے۔ چاہتی تھی کہ نظر پھیر لوں مگر نگاہ کمبخت اسی طرف لڑی رہی اب تو بالکل یقین ہو گیا۔ قریب تھا کہ غش کھا کے گر پڑوں اور ضرور ہی گر پڑتی۔ اتنے میں دور سے اکبر علی خاں کے نوکر سلار بخش کی آواز کان میں آئی۔ مجھے ڈھونڈنے نکلا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر دلاور خاں نے کھرپی ہاتھ سے رکھ دی تھی۔ جس طرح میں اسے دیکھ رہی تھی وہ بھی مجھ کو دیکھ رہا تھا۔ مگر یقیناً مجھے اس نے نہ پہچانا ہو۔ میں نے اس کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔

سلار بخش کی آواز سن کر وہ نالے کی طرف بھاگا۔ اتنے میں سلار بخش میرے پاس پہنچ گیا۔ میں مارے خوف کے تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آواز منہ سے نہیں نکلتی تھی۔ گھگی بندھی ہوئی تھی۔ سلار بخش نے میرا یہ حال دیکھ کے کہا "ہائیں ڈر گئیں ؟" میں نے درخت کی طرف اشارہ کیا۔ سلار بخش اس طرف دیکھنے لگا

سلار بخش :۔ وہاں کیا دھرا ہوا ہے۔ ایک کھرپا پڑی ہوئی ہے۔ واہ! اس

سے ڈر گئیں۔ آپ سمجھیں کوئی قبر کھود رہا ہے اور وہ گیا کہاں جو کھود رہا تھا؟

منہ سے تو بولا نہ گیا، ہاتھ سے نالے کی طرف اشارہ کیا۔

سلار بخش :۔ چلم پینے گیا ہوگا تکیہ پر۔ اچھا تو چلئے نواب چھبن صاحب بہت سی مرغابیاں شکار کر کے لائے ہیں آپ کا کہیں پتہ نہیں۔ میاں ادھر ڈھونڈنے گئے ہیں، میں ادھر آیا۔ کہئے آپ مل گئیں، نہیں تو آپ کو راستہ نہ ملتا۔ میں لے ہاں نا کسی بات کا جواب نہیں دیا۔ آخر سلار بخش بھی چپ ہو رہا تھوڑی دیر میں کھیتوں میں سے ہو کے تالاب پر پہنچ گئی۔

رات کو یہیں رہنے کی ٹھہری۔ جب کھانے والے سے فراغت ہو گئی۔ میں نے اکبر علی خاں سے کل واقعہ بیان کیا۔

اکبر علی خاں :۔ تم نے اچھی طرح سے دیکھا؟ یہ وہی دلاور علی خاں تھا؟ فیض آباد کا رہنے والا؟ اس کا تو حلیہ جاری ہے۔ افسوس تم نے پہلے سے نہ کہا۔ بدمعاش کو چل کے گرفتار کرتے، بڑا نام ہوتا۔ سرکار سے انعام ملتا۔ ایک ہزار کا اشتہار ہے۔ اور یہ کھودنا کیا تھا؟

میں :۔ کیا معلوم۔ ہو اپنی قبر کھودتا ہوگا؟

اکبر علی خاں :۔ اس کے نام سے تمہارے منہ پر ہوائیاں چھوٹنے لگتی ہیں۔ اب وہ تمہارا کیا کر سکتا ہے؟

میں :۔ (دل کو ذرا تھام کے) ضرور اس نے غدر کے زمانے میں وہاں کچھ گاڑ دیا ہوگا اسے کھودنے آیا ہے۔

اکبر علی خاں :۔ چلو دیکھیں۔

میں :۔ میں تو نہ جاؤں گی۔

اکبر علی خاں :۔ میں تو جاتا ہوں۔ سلار بخش کو لئے جاتا ہوں۔

میں :- کہاں جاؤ گے ؟ اب وہاں کیا دھرا ہوگا وہ کھود کے لئے بھی گیا ہوگا۔

اکبر علی :- میں تو ضرور جاؤں گا۔

یہ ذرا زور سے کہا۔ پاس نواب چھبن صاحب کی چھولداری تھی، اور بسم اللہ دونوں جاگ رہے تھے۔

نواب :- خاں صاحب کہاں جایئے گا

اکبر علی خاں :- نواب صاحب ! ابھی آپ نے آرام نہیں کیا ؟

نواب :- جی نہیں۔

اکبر علی خاں :- میں حاضر ہوں۔

نواب :- آیئے۔

اکبر علی خاں اور میں دونوں نواب کی چھولداری میں گئے۔ کل واقعہ بیان کیا۔

نواب :- (مجھ سے) اور تم اس بدمعاش کو کیا جانو۔

میں :- (اپنی سرگذشت تو ان سے کیا کہتی) میں جانتی ہوں اور اچھی طرح جانتی ہوں۔ میں بھی فیض آباد کی رہنے والی ہوں۔

نواب :- اخاہ ! آپ بھی فیض آباد کی رہنے والی ہیں ؟۔

اکبر علی خاں :- مگر اس مردود کا کوئی بندوبست کرنا چاہیئے۔ ایسے میں یہیں کہیں ہے، عجب نہیں گرفتار ہو جائے۔ یہ کہہ کے سالار بخش کو آواز دی۔ قلم دان منگوایا۔ تھانہ قریب تھا۔ تھانے دار کو رقعہ لکھا۔ تھوڑی دیر میں تھانہ دار صاحب مع دس بارہ سپاہیوں کے آموجود ہوئے۔ میں نے جو دیکھا تھا اُن سے کہہ دیا۔ گاؤں سے پاسی بلوائے گئے۔ پہلے اس موقع پر جا کے ڈھونڈھا۔ تکیہ پر فقیر سے کسی قدر سراغ ملا اور ایک سپاہی کو ایک اشرفی شاہی زمانے کی ملی وہ تھانے دار صاحب کے پاس لے آیا۔

تھانہ دار:۔ خدا چاہے تو مع مال گرفتار ہو گا۔

تھانے دار صاحب نے واقعی اچھا بندوبست کیا۔ سپاہیوں نے بھی خوب ہی تگ و دو کی۔ آخر تین بجے رات کو مکا گنج میں گرفتار ہوا۔ صبح ہوتے ہوتے "تالاب" پہنچ گیا۔ تلاشی میں ۴۲ اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ میں شناخت کے لئے بلائی گئی۔ میری شناخت کے علاوہ دو سپاہیوں نے بھی پہچانا۔ دس بجے چالان لکھنؤ کو روانہ ہو گیا۔

رسوا:۔ اچھا تو پھر اس کا حشر ہی کیا ہوا؟ اس قصے کو جلدی ختم کیجئے۔

میں:۔ ہوا کیا؟ کوئی دو مہینے کے بعد معلوم ہوا پھانسی ہو گئی، واصل جہنم ہوا

(۲۵)

نہ پوچھ نامۂ اعمال کی دل آویزی
تمام عمر کا قصّہ لکھا ہُوا پایا

مرزا رسوا صاحب! جب آپ نے میری سوانح عمری کا مسودہ مجھے نظر ثانی کو دے کے لئے دیا تھا۔ مجھے ایسا غصہ آیا کہ جی چاہتا تھا پرزے پرزے کر کے پھینک دوں بار بار خیال آتا کہ زندگی میں کیا کم روسیاہی ہوئی کہ اس کا افسانہ بعد مرنے کے بھی باقی رہے کہ لوگ اس کو پڑھیں اور مجھ کو لعنت ملامت کریں۔ مگر مزاج کی تساہلی اور آپ کی محنت کے لحاظ نے ہاتھ روک لیا۔

اتفاقاً کل شب کو بارہ بجے کے قریب سوتے سوتے آنکھ کھل گئی، میں حسب معمول کمرے میں تنہا تھی۔ مامائیں، خدمت گار۔ سب نیچے مکان میں سو رہے تھے۔ میرے سرہانے لیمپ روشن تھا۔ پہلے تو دیر تک کروٹیں بدلا کی، چاہتی تھی سو جاؤں۔ کسی طرح نیند

نہ آئی آخر اٹھی، پان لگا کر ماما کو پکارا، حقہ بھروایا - پھر پلنگ پر جا لیٹی - حقہ پینے لگی - جی میں آیا کوئی کتاب دیکھوں - بہت سے قصے کہانی کی کتابیں سرہانے الماری میں رکھی تھیں - ایک ایک کو اٹھا کے ورق الٹے پلٹے مگر وہ سب کئی مرتبہ کی دیکھی ہوئی تھیں - جی نہ لگا - بند کر کے رکھ دیں - آخر اسی مسودے پر ہاتھ پڑا - خفقان کی شدت تھی - بیچ بیچ میں نے اس کے چاک کرنے کا مصمم قصد کر لیا - چاک ہی کیا چاہتی تھی کہ یہ معلوم ہوا جیسے کان میں کوئی کہہ رہا ہے "اچھا امراؤ بالفرض اسے تم نے پھاڑ کے پھینک دیا - جلا دیا، تو اس سے کیا ہوتا ہے - تمام عمر کے واقعات جو خدائے عادل و توانا کے حکم سے فرشتوں نے مفصل اور مشرح لکھے ہیں انہیں کون مٹا سکتا ہے"

اس غیبی آواز سے میرے ہاتھ پاؤں لرزنے لگے - قریب تھا کہ مسودہ ہاتھ سے گر پڑے - مگر میں نے اپنے تئیں سنبھالا - چاک کرنے کا خیال تو بالکل دل سے محو ہو گیا - جی چاہا - جہاں سے اٹھایا تھا وہیں رکھ دوں - پھر اکبارگی یوں ہی بلا قصد پڑھنا شروع کیا - پہلا صفحہ جب تمام ہو گیا، ورق الٹا - دو چار سطریں اور پڑھیں - اس وقت مجھے اپنی سرگزشت سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ جس قدر پڑھتی جاتی تھی، جی چاہتا تھا اور پڑھوں - اور قصوں کے پڑھنے میں مجھے ایسا لطف کبھی نہ آیا تھا - کیوں کہ ان کو پڑھتے وقت یہ خیال پیش نظر رہتا تھا کہ یہ سب بنائی ہوئی باتیں ہیں - درحقیقت کوئی اصل نہیں - یہی خیال قصے کو بے مزہ کر دیتا ہے میری سوانح عمری میں جو امور آپ نے قلم بند کئے ہیں وہ سب مجھ پر گذرے ہیں - اس وقت وہ سب گویا میری آنکھوں کے سامنے تھے - ہر واقعہ اصلی حالت میں نظر آتا تھا - اور اس سے طرح طرح کے اثر میرے دل و دماغ پر طاری تھے - جن کا بیان بہت ہی دشوار ہے اگر کوئی مجھے اس حالت میں دیکھتا تو اس کو میری دیوانگی میں کوئی شک نہ رہتا - کبھی تو میں بے اختیار ہنس پڑتی تھی - کبھی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگتے تھے - غرضکہ عجیب

کیفیت تھی۔ آپ نے فرمایا تھا"دجابجا بنائی جاتا"۔ اس کا ہوش کسے تھا۔ پڑھتے پڑھتے صبح ہوگئی۔ اب میں نے وضو کیا، نماز پڑھی، پھر تھوڑی دیر سو رہی۔ صبح کے کوئی آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ ہاتھ منہ دھو کے پڑھنے لگی۔ بارے سر شام سارا مسودہ پڑھ چکی۔

تمام قصے میں وہ تقریر آپ کی مجھے بہت ہی دلچسپ معلوم ہوئی، جہاں آپ نے نیک بختوں اور خراب عورتوں کا مقابلہ کر کے ان کا فرق بتایا ہے۔ نیک بخت عورتوں کو جس قدر فخر ہو، زیبا ہے اور ہم ایسی بازاریوں کو ان کے اس فخر پر بہت ہی رشک کرنا چاہیے، مگر اس کے ساتھ یہ خیال آیا کہ اس باب میں بخت و اتفاق کو بہت کچھ دخل ہے۔ میری خرابی کا سبب وہی دلاور خاں کی شرارت تھی۔ نہ وہ مجھے اٹھا لاتا اور نہ اتفاق سے خانم کے ہاتھ فروخت ہوتی۔ نہ میرا یہ لکھا پورا ہوتا۔ جن امور کی برائی میں اب مجھے کوئی شبہ نہیں رہا اور اسی لئے ایک مدت ہوئی کہ میں ان سے بیزار اور تائب ہوں۔ اس زمانے میں ان کی حقیقت مجھے کسی طرح نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ نہ ایسا کوئی قانون مجھے بتایا گیا تھا کہ میں ان سے اجتناب کرتی، اور ایسا نہ کرتی تو مجھے سزا دی جاتی۔ میں خانم کو اپنا مالک اور حاکم تصور کرتی تھی۔ کوئی کام ایسا نہ کرتی جو ان کی مرضی کے خلاف ہو اور اگر کرتی بھی تو بہت چھپا کے تاکہ ان کی مار اور جھڑکیوں سے بچ سکوں۔ اگرچہ خانم نے مجھے زندگی بھر پھول کی چھڑی بھی نہیں چھوائی۔ مگر خوف غالب تھا۔

جن لوگوں میں، میں نے پرورش پائی تھی، جو ان کا طریقہ تھا وہی میرا بھی تھا۔ میں نے اس زمانے میں کبھی کسی مذہبی عقیدہ پر غور نہیں کیا اور میرا خیال ہے کہ کوئی ایسی حالت میں نہ کرتا۔

ارضی و سماوی حادثے، جن کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے، جب واقع ہوتے ہیں تو دلوں میں ایک خاص قسم کی دہشت سما جاتی ہے۔ مثلاً زور سے بادل گرجنا

بجلی کا چمکنا، آندھیوں کا آنا، اولوں کا گرنا یا زلزلے کا آنا۔ سورج گرہن یا چاند گہن، قحط سالی، وبا وغیرہ۔ ایسے امور اکثر خدا کی غضب کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ لوگوں کے بعض اعمالوں کی وجہ سے وہ رفع دفع ہوگئیں۔ مگر یہ بھی دیکھا کہ بہت سی آفتیں دعا، تعویذ، ٹوٹکے ووٹکے کسی بات سے نہ ٹلیں۔ ایسے امور کو لوگ خدا کی مرضی، تقدیر آسمانی کی طرف منسوب کر دیا کرتے ہیں۔ مذہبی احکام مجھ کو مفصل نہ پہنچے تھے اور نہ ثواب عذاب کا مسئلہ اچھی طرح سمجھایا گیا تھا۔ اس لئے ان باتوں کا اثر میرے دل پر نہ تھا۔ بے شک اس زمانہ میں میرا کوئی مذہب نہ تھا۔ صرف جو اور لوگوں کو کرتے دیکھتی تھی وہی آپ بھی کرنے لگتی تھی۔ اس وقت میرا کوئی مذہب ہی نہ تھا۔ تقدیر پر میں بہت ہی شاکر تھی۔ جو کام میں کاہلی سے نہ کر سکتی تھی یا میری بے وقوفی سے بگڑ جاتا تھا اس کو تقدیر کے حوالے کر دیتی فارسی کتابوں کے پڑھنے سے آسمان کی شکایت کرنے کا مضمون میرے آگیا تھا اور جب میرا کوئی مطلب فوت ہو جاتا تھا یا کسی اور وجہ سے ملال پہنچتا تھا تو جاؤ بے جا فلک کی شکائیتیں کیا کرتی تھیں ؎

ہم بھی ہیں مختار لیکن اس قدر ہے اختیار
جب ہوئے مجبور قسمت کو بُرا کہنے لگے

مولوی صاحب، بوا حسینی اور بڈھے بڑھیاں جب اگلے زمانے کی باتیں کرتے تھے تو اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس زمانہ سے بہت ہی اچھا تھا۔ اس لئے ان کی طرح میں بھی اُس زمانہ کی غائبانہ تعریف اور زمانہ موجودہ کی بلا وجہ مذمت کیا کرتی تھی۔ میں کمبخت اس بات کو نہ سمجھی کہ بڈھے بڑھیاں جو اگلے وقتوں کی تعریف کرتے ہیں اس کا سبب یہ ہے کہ اپنی اپنی جوانی کے دن سب کو بھلے معلوم ہوتے ہیں، اس لئے دنیا بھلی معلوم ہوتی ہے۔ خود زندہ جہاں زندہ، خود مردہ

یہاں مردہ سن رسیدہ لوگوں کی دیکھا دیکھی جوانوں نے بھی انہیں کا وطیرہ اختیار
کر لیا ہے، اور چونکہ یہ غلط فہمی مدت سے چلی آتی ہے اس لئے اب عموماً سب کو اس
کی عادت ہو گئی ہے۔

جوان ہونے کے بعد عیش و آرام میں پڑ گئی تھی اس زمانہ میں گا بجا کے مردوں
کو رجھانا میرا خاص پیشہ تھا۔ اس میں بمقابلہ اور ساتھ والیوں کے جس قدر کامیابی
یا ناکامیابی مجھ کو ہوتی تھی، وہی میری خوشی اور رنج کا اندازہ تھا۔ میری
صورت بہ نسبت اوروں کے، کچھ اچھی نہ تھی مگر فن موسیقی کی مہارت اور شعر و
سخن کی قابلیت کی وجہ سے میں سب سے بڑھی چڑھی رہی۔ اپنی ہم عمروں میں مجھے
ایک خاص قسم کا امتیاز حاصل تھا مگر اس سے کچھ نقصان بھی ہوا۔ وہ یہ کہ جس
قدر میری عزت زیادہ ہوتی گئی اتنا ہی میرا خود داری کا خیال دل میں پیدا ہوتا
گیا۔ جہاں اور رنڈیاں بےحیائیوں سے اپنا مطلب نکال لیتی تھیں میں منہ دیکھتی
رہ جاتی تھی۔ مثلاً ان کا یہ عام قاعدہ تھا کہ ہر کس و ناکس سے کسی نہ کسی قسم
کی فرمائش ضرور کر دینی چاہیئے۔ مجھے اس سے شرم آتی تھی۔ یہ خیال آتا تھا
کہ ایسا نہ ہو انکار کر دے، تو خفت ہو گی۔ اور نہ ہر شخص سے میں بہت جلد بے
تکلف ہو جاتی تھی۔ میری اور ساتھ والیوں کے پاس جب کوئی آ کے بیٹھتا تو ان
کو سب سے زیادہ فکر اس کی ہوتی کہ کہاں تک دے سکتا ہے اور ہم کہاں تک
اس سے لے سکتے ہیں۔ میرا بہت سا وقت اس شخص کی ذاتی لیاقت، حسن اخلاق
کا اندازہ کرنے میں صرف ہو جاتا تھا۔ مانگنے کی عادت کو میں معیوب سمجھنے لگی تھی،
اس کے علاوہ اور باتیں بھی مجھ میں رنڈی پنے کی نہ تھیں۔ اس لئے میری ساتھ
والیوں میں سے کوئی مجھے ناک چوٹی میں گرفتار، کوئی خفقانی، کوئی دیوانی سمجھتی
تھی۔ مگر میں نے اپنی کی، کسی کی نہ سنی۔

پھر وہ زمانہ آیا کہ میں رنڈی کے ذلیل پیشے کو عیب سمجھنے لگی اور اس سے دست بردار ہو گئی۔ ہر کس و ناکس سے ملنا چھوڑ دیا۔ صرف ناچ مجرے پر بسر اوقات رہ گئی۔ کسی رئیس نے نوکر رکھا تو نوکری کر لی۔ رفتہ رفتہ یہ بھی ترک کر دیا۔

جب میں ان افعال سے تائب ہوئی جن کو میں نے اپنے نزدیک برا سمجھ لیا تھا تو اکثر میرے جی میں آیا کہ کسی مرد آدمی کے گھر پڑ جاؤں لیکن پھر یہ خیال آیا کہ لوگ کہیں گے آخر رنڈی تھی نا، کفن کا چونگا کیا۔

مرزا صاحب! شاید اس محاورے کو آپ نہ سمجھیں مطلب اس کا یہ ہے کہ کوئی رنڈی سن سے اتر کر کسی کے گھر بیٹھ جاتی ہے تو تجربہ کار تماشبین اس کی نسبت کہا کرتے ہیں کہ اس رنڈی نے کفن کا چونگا کیا، یا مرتے مرتے کفن لے مری۔ یعنی اپنے دام بچا لئے اور از راہ فریب تماشبیں پر اپنی تجہیز و تکفین کا بار ڈالا۔ اس مثل سے رنڈیوں کی بے حد خود غرضی، لالچ اور فریب کا ثبوت ملتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہم لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ میں سچ مچ تائب ہو گئی اور اب انتہا کی نیک ہوں مگر اس کو سوائے خدا کے اور کون جانتا ہے۔ کسی شخص کو میری نیکی کا یقین نہیں ہو سکتا۔ پھر اگر اس حالت میں کسی سے محبت کروں اور اس محبت کی بنا سراسر خلوص اور نیک نیتی پر ہو، اس پر بھی خاص وہ شخص اور اس کے سوا اور جو لوگ دیکھیں یا سنیں گے۔ کبھی یقین نہ لائیں گے۔ پھر میرا محبت کرنا بھی بے سود ہو گا۔ لوگ مشہور کرتے ہیں کہ میرے پاس دولت ہے۔ اس لئے اکثر لوگ اس سن میں بھی میری خواہش کرتے ہیں اور طرح طرح کے فریب مجھ کو دینا چاہتے ہیں۔ کوئی صاحب میرے حسن و جمال کی تعریف کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کا تعلق میں ایسی رنڈیوں سے ہو چکی ہوں جو بدرجہا مجھ سے بہتر ہیں۔ کوئی صاحب میرے کمال موسیقی پر غش ہیں حالانکہ ان کے کان تال اور سم سے آشنا نہیں۔ کوئی میری علمیت کے قائل ہیں

خود بھی پڑھے لکھے ہیں مگر مجھ کو مولانا بالفضل اولانا سمجھتے ہیں۔ معمولی مسئلے روزہ نماز کے بھی مجھی سے پوچھ لیا کرتے ہیں۔ گویا کہ آپ میرے مرید یا مقلد ہیں۔ ایک میرے عاشق زار، میری دولت وکمال سے کوئی واسطہ نہیں، صرف میری تندرستی کے خواہاں ہیں۔ ہر بات پر اللہ پڑھتے ہیں۔ مجھے چھینک آئی اور ان کے درد سر ہونے لگا مجھے درد سر ہوا اور ان کے دشمنوں کا دم نکلنے لگا۔ ایک بزرگ ناصح مشفق بنے ہیں۔ دنیا کے نشیب و فراز سمجھایا کرتے ہیں۔ مجھ کو بہت ہی بھولا سمجھتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جیسے کوئی دس گیارہ برس کی لڑکی سے باتیں کرتا ہو۔

میں ایک گھماگ عورت ہوں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پئے ہوئے۔ جو جس طرح بناتا ہے بن جاتی ہوں اور درحقیقت ان کو بناتی ہوں۔ خلوص کے ساتھ بھی ملنے والے دو ایک صاحب ہیں، بے غرض ملتے ہیں۔ ان کا مقصود صرف ایک مذاق خاص ہے۔ مثلاً شعر و سخن یا گانا بجانا یا صرف لطف گفتگو، نہ ان کو کوئی غرض مجھ سے ہے نہ مجھے کوئی غرض نہ مجھے ان کے بغیر چین آتا ہے نہیں میرے بغیر مگر ان لوگوں میں سے کوئی میرے گھر میں بٹھانے کا امیدوار نہیں ہے۔ کاش کہ ایسا معلوم ہوتا مگر یہ تمنا ایسی ہے جیسے کوئی کہے کہ جوانی پھر آتی! اس میں کوشک نہیں کہ عورت کی زندگی جوانی تک ہے۔ اگر جوانی کے ساتھ ہی زندگی بھی ختم ہو جایا کرتی تو کیا خوب ہوتا مگر ایسا نہیں ہوتا۔ یوں تو بڑھاپا ہر ایک کے لئے برا ہے خصوصاً عورت کے لئے۔ خصوصاً رنڈی کے لئے بڑھاپا دوزخ کا نمونہ ہے۔ بڑھیا فقیر نیاں جو لکھنؤ کے گلی کوچوں میں پڑی پھرتی ہیں اگر غور کیجئے گا تو ان میں اکثر رنڈیاں ہیں۔ کونسی؟ جو کبھی زمین پر پیر نہ رکھتی تھیں، قیامت بپا کر رکھی تھی، ہزاروں بھرے پرے گھر تباہ کر دئے، سینکڑوں جوانوں کو بے گناہ قتل کیا۔ جہاں جاتی تھیں لوگ آنکھیں بچھاتے تھے اب کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھتا۔ پہلے جہاں بیٹھ جاتی تھیں لوگ باغ باغ ہو جاتے تھے اب کوئی کھڑے ہونے کا بھی روادار نہیں۔ پہلے بن مانگے موتی ملتے تھے اب مانگے بھیک نہیں ملتی۔

ان میں سے اکثر اپنے حافظوں اپنی تباہی کا باعث ہوئیں۔ ایک بڑی بی میرے مکان پر کبھی کبھی آیا کرتی تھیں، کسی زمانے میں بڑی مشہور رنڈیوں میں تھیں جوانی میں ہزاروں روپے کمائے ذرا سرے دار جیوڑا تھا۔ جب سن سے اتریں وہی کمائی یاروں کو کھلانا شروع کی۔ بڑھاپے میں ایک نوجوان کے گھر بیٹھیں۔ ایک تو وہ خوب عورت کم سن، بھلا وہ ان پر کیوں ریجھتا۔ پہلے تو اس کی بیوی ذرا بگڑیں مگر جب میاں نے اصل مطلب سمجھا دیا، خاموش ہو رہیں۔ ان کی خاطریں ہونے لگیں۔ جب تک مال رہا۔ خوب میاں بیوی دونوں نے پھسلا کے کھایا آخر کھکھ ہو گئیں۔ اب کون پوچھتا ہے۔ نکال باہر کیا گلیوں کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔

بعض بے وقوف رنڈیوں نے کسی کی لڑکی کو لے کے پالا۔ اس سے دل لگایا۔ (اس حماقت میں، میں بھی گرفتار ہو چکی ہوں) مگر جب وہ جوان ہوگی، لے دے کے کسی کے ساتھ نکل گئی۔ یا اگر رہی تو کل مال رفتہ رفتہ اپنے قبضہ میں کیا۔ ان کو گھر کا انتظام یا ماما گیری کرنے کو رکھ لیا۔

آبادی نے بھی جل دیا ہوتا۔ مگر وہ تو کہو، اس کے کرتوت پہلے ہی کھل گئے۔ نہیں تو مجھے لوٹ ہی لے جاتی۔ مرد کیا اور عورت کیا، رنڈی کی قوم میں بدکاروں کی زندگی کا اصول ہی ایسا بگڑا ہوا ہے کہ ایک دوسرے میں محبت نہیں ہو سکتی۔ نہ کوئی سمجھدار مرد ہی ان کو دل دے سکتا ہے، کیوں کہ سب جانتے ہیں کہ رنڈی کسی کی نہیں ہوتی اور نہ عورت ہی ایسی محبت کر سکتی ہے۔ نوچیاں اپنے دل میں یہ سمجھتی ہیں کہ کمانے ہم ہیں، پھر ان کو کیوں دیں۔

اگلے قدر دان مرد، زوالِ حسن کے بعد کنارہ کرتے ہیں۔ یہ اس کی عادی ہوتی ہیں کہ لوگ جھوٹی خوشامد کریں۔ بھلا اب کوئی خوشامد کیوں کرنے لگا۔ غرضکہ مرد ان سے کنارہ کش اور یہ مردوں سے شاکی رہتی ہیں۔

پہلے پہل میں بھی اور رنڈیوں کی زبانی مردوں کی بے وفائی کا دکھڑا اس کے وقت ضائع کرتی تھی اور بے سمجھے ان کی ہاں میں ہاں ملاتی تھی۔ مگر باوجود اس کے کہ گوہر مرزا نے میرے ساتھ جو کچھ سلوک کیا وہ سب آپ کو معلوم ہے اور نواب صاحب جنہوں نے مجھ پر نکاح کا الزام لگایا تھا اس کو بھی آپ سن چکے، پھر بھی مردوں کو بے وفا نہیں کہہ سکتی۔ اس معاملہ میں عورتیں، خصوصاً بازار والیاں، ان سے کسی طرح کم نہیں۔ محبت کے باب میں مرد (معاف کیجیے گا) اکثر بے وقوف اور عورتیں بہت ہی چالاک ہوتی ہیں۔ اکثر مرد سچے دل سے اظہار عشق کرتے ہیں اور اکثر عورتیں جھوٹی محبت جتاتی ہیں۔ اس لئے کہ مرد جس حالت میں اظہار تعشق کرتے ہیں وہ حالت ان کی اضطراری ہوتی ہے اور عورتیں بہت جلد متاثر نہیں ہوتیں کیوں کہ مرد بہت ہی جلد عورتوں کے حسن ظاہری پر فریفتہ ہو کر ان پر شیدا ہو جاتا ہے اور عورتیں اس باب میں زیادہ احتیاط کرتی ہیں۔ اسی لئے مردوں کی محبت کسی قدر سریع الزوال اور عورتوں کی محبت عسیر الزوال ہوتی ہے۔ مگر جانبین کے حسن معاشرت سے ان امور میں ایک خاص قسم کا اعتدال پیدا ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ دونوں یا کم از کم ایک کو سمجھ ہو۔

واقعی مرد اس باب میں سریع الاعتقاد ہوتے ہیں اور عورتیں انتہا کی شکی۔ مرد پر عورت کا جادو بہت جلد چل جاتا ہے مگر عورت پر حب عمل مشکل سے کارگر ہوتا ہے۔ اس لئے کہ عورتیں ضعیف القوای ہیں۔ ان کو بعض وصف ایسے دئے گئے ہیں جس سے یہ کمی پوری ہو جائے۔ منجملہ ان اوصاف کے ایک وصف یہ بھی ہے، بلکہ میں کہہ سکتی ہوں شاید یہی ایک وصف ہے۔ اس کی مثال جانوروں میں بھی مل سکتی ہے۔ اکثر ضعیف جانوروں میں بھی یہ حیلہ گری کا مادہ ہے۔

اکثر مرد یہ کہیں گے کہ عورتیں حسین ہوتی ہیں۔ میں اس کی قائل نہیں۔ در

حقیقت نہ مرد ہی بجائے خود حسین ، ورنہ عورت بلکہ جو ایک کو ایسا حسین عنایت ہوا ہے جو دوسرے کو اچھا معلوم ہو یوں تو مرد عورت حسن کا ناک نقشہ سب پسند کرتے ہیں مگر اصل قدر دانوں مرد کے حسن کی عورت اور عورت کے حسن کا، مرد ہے۔ ایک خوب صورت عورت دوسری خوبصورت عورت کے سامنے اس خوش رنگ پھول سے زیادہ نہیں ہے جس میں خوشبو نہ ہو اور ایک بدصورت مرد بھی خوب صورت عورت کی رائے میں خوبصورت پھول کی طرح دل پسند ہے اگرچہ اس کی شکل اور رنگت میں کوئی ندرت نہ ہو۔ محبت کے باب میں غلطی صرف ایک ہی سے نہیں ہوتی بلکہ دونوں اس باریکی کو نہیں سمجھتے۔ ان دونوں محبتوں کی اصلیت میں فرق ہے۔ جس نگاہ سے مرد عورتوں کو دیکھتے ہیں اس نگاہ سے عورت مرد کو دیکھتی ہی نہیں۔ عورتوں کی محبت کرنے کا اندازہ ان مردوں میں ایک حد تک پایا جاتا ہے جو کسی مالدار عورت کے دامن دولت سے وابستہ ہے یا جس کا سن بہت کم ہے۔ مگر کوئی سن رسیدہ عورت ان کو کیوں چاہنے لگی۔

اس میں شک نہیں کہ عورتیں جوان مرد سے بہ نسبت بڈھوں کے زیادہ محبت رکھتی ہیں مگر اس کی وجہ بھی محض حسن و جمال نہیں ہے۔ بلکہ وجہ یہ ہے کہ عورت ضعیف القویٰ ہے۔ اس لئے وہ ہر حالت میں اپنے حمائتی کو بہت دوست رکھتی ہے تاکہ دقت ضرورت اس کو خطرہ سے بچا سکے۔ پس جوان سے بہ نسبت بڈھے کے زیادہ توقع ہے۔ اور حسن و جمال اس خوبی کے ساتھ مل کر اس کے وصف کو رونق دیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مرد کی محبت میں صرف لذت حاصل کرنا مقصود ہے اور عورت کی محبت میں الم سے محفوظ رہنا اور لذت دونوں غرضیں شامل ہیں۔

چونکہ یہ مشہور ہے کہ محبت بے غرض ہونا چاہیئے، اور عورت کی محبت میں اس کا زیادہ لگاؤ ہے۔ لہذا وہ اس کے چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ شاید یہ کوئی کہے کہ جو امور میں نے اس موقع پر بیان کئے ہیں اس میں اکثر باتوں کا امتیاز نہ مردوں

کو ہوتا ہے نہ عورتوں کو، تو میں اسے تسلیم کروں گی اور یہ کہوں گی کہ یہ باتیں اصل فطرت سے مرد عورت کے خمیر میں داخل ہیں۔ کچھ ضرورت نہیں ہے کہ انہیں اس کا شعور بھی ہو۔

میں نے عمر بھر کے تجربہ کے بعد یہ امور دریافت کیے ہیں اور میرے ساتھ جو شخص اس پر غور کرے گا وہ اسے سمجھ سکتا ہے۔

میں دیکھتی ہوں کہ اکثر عورتیں اور ناخواندہ مرد بھی ایسی باتوں پر غور نہیں کرتے۔ اس لئے ان کو اپنے زمانۂ زندگی میں بہت سی بک بک جھک جھک کرنا پڑتی ہے۔

میرے خیال میں مرد و عورت دونوں اپنے اپنے رتبے اور اغراض کو سمجھ لیں تو ان میں ہرگز ملال نہ ہو، بہت سی آفتیں ٹل جائیں اور بہت سی دور ہو جائیں۔

مگر ایک مشکل ہے کہ جب کسی کو کسی بات کی فہمائش کی جائے تو اکثر یہی جواب ملتا ہے: "اوہ جی! جو تقدیر میں ہوگا ہو کے رہے گا۔" اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم جو چاہیں کریں، ہمیں نہ روکو۔ ہمارے کئے کچھ نہیں ہوتا، یعنی ہماری بدکاریوں کا کوئی نتیجہ نہیں ہے جو کچھ ہوگا تقدیر سے ہوگا۔ جو نتیجہ نکلے گا وہ معاذ اللہ خدا کی طرف سے ہوگا۔ یہ لغو گفتگو اگلے زمانے میں کسی قدر بامعنی بھی تھی۔

.... کیونکہ اس زمانے میں اتفاق سے گھڑی بھر میں کچھ کا کچھ ہو جایا کرتا تھا۔ اس پر مجھے شاہی زمانے کی ایک نقل یاد آئی ہے۔

زمانۂ شاہی میں انقلاب کا ثبوت اکثر ملتا رہتا تھا لوگوں کی حالتوں میں دفعتاً تغیر ہو جایا کرتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے ایک سپاہی نہایت ہی شکستہ حال موتی محل کے پھاٹک کے پاس چبوترے پر پڑا سو رہا تھا۔ قضائے کار، نماز صبح کے بعد ٹہلتے ہوئے بادشاہ

ادھر آنکلے۔ اتفاقاً اس وقت کوئی ساتھ نہ تھا۔ معلوم نہیں کیا جی میں آیا۔ آپ نے اسے جگا دیا۔ وہ سپاہی یونہی نیند سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ جہاں پناہ پر نگاہ پڑی۔ پہلے تو گھبرا گیا۔ پھر ایک ہی مرتبہ سنبھل کے اپنی حالت کو دیکھا، فوراً تلوار نذر کی۔ بادشاہ نے نذر قبول کر لی۔ زنگ آلودہ تلوار تھی، میاں سے بدقت نکلی پھر دیکھ بھال کر اس تلوار کی تعریف کی اور میان میں کر کے اپنی کمر میں لگا لی۔ خود جو ولایتی باندھے ہوئے تھے، جس کا طلائی قبضہ تھا، مع کمر مرصع اس کو حوالہ کی۔ اسی موقع پر حضور عالم (خطاب علی نقی خاں وزیر اودھ) آ گئے۔ جہاں پناہ نے اس جوان اور اس کی تلوار کی تعریف کی۔

بادشاہ:۔ دیکھنا بھئی کیا سجیلا جوان ہے اور تلوار بھی اس کے پاس کیا ہی عمدہ تھی (کمرہ سے تلوار نکال کر) یہ دیکھو۔

وزیر:۔ قبلۂ عالم۔ سبحان اللہ! مگر حضور سا جوہر شناس اور قدردان بھی تو ہو جب ایسے لوگ اور ایسی چیزیں دستیاب ہوتی ہیں۔

بادشاہ:۔ مگر دیکھنا بھئی! میری تلوار بھی کچھ ایسی بدزیب نہیں ہے۔

وزیر:۔ ظل سبحانی کی تلوار اور بدزیب۔

بادشاہ:۔ مگر لباس اس کے مناسب نہیں ہے۔

(اس اثنا میں مصاحب، ملازم، شاہی چوب دار، خاص بردار آ گئے۔ اچھا خاصہ مجمع ہو گیا)۔

وزیر:۔ درست ارشاد ہوا۔

بادشاہ:۔ اچھا ہمارے کپڑے تو اسے پہنا کر دیکھے جائیں۔

اس اشارے کے پاتے ہی لوگ دوڑے، لباس کی کشتیاں ہاتھوں ہاتھ آ گئیں۔ بادشاہ نے ملبوس خاص جو اس وقت پہنے ہوئے تھے، مع مالا کے مروارید اور جوڑے۔

نورتن، مرصع کار اسے عنایت کی۔ آپ اور کپڑے زیب تن کئے۔ (جب وہ کپڑے پہن چکا)

بادشاہ:۔ ہاں اب دیکھو۔

وزیر:۔ واقعی صورت ہی اور ہو گئی۔

(مصاحبین اور حضار بھی تعریفیں کرنے لگے)

بادشاہ تھوڑی دیر یہاں ٹھہرے۔ اب سواری آگئی تھی، سوار ہو کے ہوا کھانے چلے گئے تھے۔

سپاہی خوشی خوشی گھر آیا۔ جوہری مہاجن، دلال گویا ساتھ ہی لگے ہوئے تھے اسباب آنکا گیا۔ سب پچیس ساٹھ ہزار روپے کی مالیت تھی۔

سپاہی کا حال سنئے:۔ کسی نجیبوں کی پلٹن میں تین روپیہ کا اسم تھا رات کو گھر میں کھانے پہ بیوی سے تکرار ہوئی۔ آپ خفا ہو کے گھر سے نکل گئے۔ رات بھر خدا جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرے۔ صبح ہوتے موتی محل کے پاس تھک کے بیٹھ گئے، نیند آگئی۔ صبح کو طالع بیدار نے جگایا تو یہ کرشمہ نظر آیا۔ دم بھر میں محتاج سے غنی کر دیا۔

اس طرح کے واقعے شاہی میں اکثر ہوا کرتے تھے اور ایسے ہی زمانے میں ان کا ہونا ممکن ہے جب کہ عنانِ حکومت ایک شخص کے ہاتھ میں ہو اور وہ کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہ ہو۔ ملک کو اپنی ملک اور خزانے کو اپنا مال سمجھے۔

انگریزی عملداری میں ان فضول خرچیوں کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ ایک طرح کی بے انصافی سمجھی جاتی ہے کہ کسی شخص کو بلا وجہ بلا استحقاق ایک رقم خطیر دے دی جائے۔ ایسی سلطنت جس میں بادشاہ سے لے کر ایک فقیر تک قانون کے پابند ہیں، اگر استحقاق کا لحاظ نہ رکھا جائے تو ہرگز کام نہ چلے۔ اس زمانے میں تقدیر کا زور نہیں چلتا جو کچھ ہوتا ہے تدبیر سے ہوتا ہے۔

نواب چھبن صاحب کا حال سنئے:۔ (اثنائے سوانحمری میں ان کا بقیہ ذکر

فروگذاشت ہو گیا تھا۔ درحقیقت آپ دریا ڈوبنے گئے تھے۔ اس ارادے سے غوطہ لگایا کہ اب خدا اُبھریں گے مگر جان بہت پیاری چیز ہوتی ہے۔ جب دیر تک پانی کے نیچے رہے دم گھبرانے لگا۔ جی میں آیا اب کی ابھر کر پھر سانس لے لیں۔ ابھرے۔ پانی کی سطح پر آکر بلاقصد ہاتھ پاؤں چلنے لگے۔ پھر مرنے کو جی چاہا۔ پھر غوطہ مارا۔ پھر وہی حال ہوا اسی طرح کئی غوطے لگائے مگر ڈوبتے نہ بن پڑا۔ آخر اسی کوشش میں بہتے بہاتے چھتر منزل تک پہنچ گئے۔ اتفاقاً اس وقت مرزا ولی عہد بہادر مرحوم، مع اپنے چند مصاحبوں کے، بجرے پر سوار ہو کر سیر کو نکلے تھے۔ ان کی نظر جو پڑی سمجھے کوئی شخص ڈوب رہا ہے۔ ملاحوں کو حکم دیا جلدی نکالو۔ انہوں نے چھڑانے کی بہت کوشش کی۔ وہ لوگ سمجھے تھے گھبرا گئے۔ آخر زبردستی کنارے پر لائے۔ مرزا ولی عہد نے اپنے سامنے طلب کیا۔ احوال پرسی کے بعد معلوم ہوا کہ رئیس زادے ہیں۔ کپڑے مرحمت ہوئے۔ ہمراہ کوٹھی میں لے چلے گئے۔

چھبّن صاحب ایک تو خوش رو جوان، دوسرے ادب قاعدے سے واقف۔ علم مجلس سے آگاہ کسی قدر۔ خواندہ بھی تھے۔ طبیعت میں مذاق بھی تھا۔ غرضکہ ہر طرح شاہزادے کی صحبت کے لائق تھے۔ فوراً مصاحبوں میں اسم ہو گیا۔ بیش قرار مشاہرہ طے ہوا۔ اخراجات ضروری کے لئے کچھ مدد پیشگی میں مل گیا۔ نوکر چاکر۔ سواری۔ سب سرکار سے مرحمت ہوا۔ پیچھے پھر گیا تھا۔ پہلے سے زیادہ ٹھاٹھ ہو گئے۔

اب جو چوک میں نکلے تو جلوس ہی اور تھا۔ ہاتھی پر سوار ہیں۔ پچاس خاصبردار آگے ڈنڈے چلے جاتے ہیں۔

بسم اللہ نے اور میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ پہلے تو یقین نہ آیا۔ کہیں میاں مخدوم بخش بھی پیچھے پیچھے چلے آتے تھے، ان کو اشارے سے بلا لیا۔ مفصل حال معلوم ہوا۔

اس کے بعد چچا نے بھی میل کر دیا۔ شادی بھی ہو گئی۔ شادی میں ہم لوگ بھی بلائے گئے تھے۔ خانم کو بہت عمدہ دوشالہ، رومال دیا مگر اس دن سے نہ کبھی ہمارے مکان پر آئے نہ بسم اللہ سے رسم رکھا۔ خانم اور چال چلی تھیں۔ بن نہ پڑی، الٹی ہو گئی۔

خلاصہ یہ کہ شاہی میں اس قسم کے کرشمے نظر آجاتے تھے۔ بھلا انگریزی حکومت میں یہ کہاں، وہ دن گئے۔ خلیل خاں فاختہ اڑا گئے۔ سنتے چلے آئے ہیں کہ دولت اندھی ہے مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی حکمت سے اس کی آنکھیں کھول دی گئی ہیں۔ اب اسے لائق اور نالائق کا خیال ہو گیا۔

شاہی عملداری میں جاہل، ناخواندہ جو الف کے نام لٹھا نہیں جانتے تھے، بڑے بڑے عہدوں پر نوکر تھے۔ میں کہتی ہوں ان سے کام کیوں کر چلتا ہوگا اور تو اور موئے خواجہ سراؤں کے پاس پلٹنیں اور رسالے تھے۔ بھلا انصاف کیجئے، ہنسنے کی بات ہے یا نہیں۔

تقدیر اور تدبیر کے مسئلے میں، میں بہت دن چکر میں رہی۔ آخر معلوم ہوا کہ جن معنوں میں لوگ اس لفظ کو استعمال کر رہے ہیں وہ بالکل دھوکا ہے۔ اگر اس سے یہ مراد ہے کہ خدا کو ہماری سب باتوں کا علم ازل سے ہے تو اس میں کوئی شک نہیں، وہ کافر ہے جس کو اس کا اعتقاد نہ ہو مگر لوگ تو معاذ اللہ اپنے تمام افعال ناشائستہ کے برے نتائج کو تقدیر کی طرف نسبت دیا کرتے ہیں۔ اس سے خدا کی قدرت پر الزام آتا ہے۔ یہ بالکل کفر ہے۔

افسوس جن باتوں کو میں اب سمجھی۔ اگر پہلے ہی سے سمجھ گئی ہوتی تو بہت ہوتا مگر نہ کوئی سمجھانے والا تھا نہ خود کو اتنا تجربہ تھا کہ آپ ہی سمجھ لیتی۔ مولوی صاحب نے جو دو حرف پڑھا دیئے تھے وہ میرے بہت کام آئے (خدا

ان کے درجات عالی کرے) اس زمانہ میں مجھے اس کی قدر نہ تھی۔ تن آسانی اور آرام طلبی کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ علاوہ اس کے، قدردان اس قدر تھے کہ کسی وقت فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ جب وہ دن آئے کہ قدردان ایک ایک کرکے کھسکنے لگے تو ذرا مجھے مہلت ملی۔ تو اس زمانہ میں کتب بینی کا شوق بڑھا، کیونکہ سوائے اس کے اب کوئی شغل نہ رہا تھا۔

میں سوچ کہتی ہوں کہ اگر یہ شوق نہ ہوتا تو اب تک میں زندہ نہ رہتی۔ جوانی کے ماتم اور اگلے قدردانوں کے غم میں کب کا خاتمہ ہوگیا تھا۔ کچھ دنوں تو میں قصے کہانی کی کتابوں سے دل بہلایا کی، ایک دن پرانی کتابیں دھوپ دینے کے لئے نکالیں۔ ان میں وہ گلستاں بھی نکلی جو مولوی صاحب سے پڑھی تھی۔ ادھر ادھر سے ورق الٹ پلٹ کے پڑھنے لگی۔ پہلے تو مجھے نفرت سی ہوگئی تھی ایک تو اس لئے کہ تعلیم کا ابتدائی زمانہ تھا۔ عبارت مشکل معلوم ہوتی تھی۔ دوسرے تجربہ نہ تھا اس لئے کچھ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اب جو پڑھا تو وہ دقتیں دور ہوچکی تھیں، خوب ہی دل لگا کے میں نے سرے سے آخر تک کئی مرتبہ پڑھا۔ فقرہ فقرہ دل میں اتر جاتا تھا۔ اس کے بعد ایک صاحب سے اخلاق ناصری کی تعریف سن کے اس کے پڑھنے کا شوق ہوا۔ انہیں سے ایک نسخہ منگا کے پڑھا۔ واقعی اس کتاب کے مطالب بھی مشکل ہیں اور عربی لفظیں کثرت سے ہیں اس لئے اس کے سمجھنے میں بہت دقت ہوئی۔ مگر تھوڑا تھوڑا پڑھ کے بہت دنوں میں کتاب کو ختم کیا۔ پھر دانش نامہ غیاث منصور نولکشور کے مطبع میں چھپا، اسے پڑھا۔ پھر ایک مرتبہ صغریٰ و کبریٰ کو بجائے خود مطالعہ کیا اور جو جو سمجھ میں آیا اسے پوچھ لیا۔ ان کتابوں کے پڑھنے سے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے دنیا کے بھید مجھ پر کھلتے جاتے ہیں۔ ہر بات کی سمجھ آگئی اس کے بعد میں نے بہت سی کتابیں اس قسم کی، اردو، فارسی کی بجائے خود پڑھیں

اس سے طبیعت کو جلا ہوتی گئی۔ قصائد انوری و خاقانی جستہ جستہ پڑھے۔ مگر جھوٹی خوشامد کی باتوں میں اب میرا دل نہ لگتا تھا اس لئے ان کو بند کر کے الماری میں رکھ دیا۔ فی الحال کئی اخبار بھی میرے پاس آتے ہیں، انہیں دیکھا کرتی ہوں ان سے دنیا کا حال معلوم ہوتا رہتا ہے۔ کفایت شعاری کی وجہ سے میرے پاس اب بھی اس قدر اندوختہ ہے کہ اپنی زندگی بسر کرلے جاؤں گی وہاں کا اللہ مالک ہے۔ میں بہت دن ہوئے سچے دل سے توبہ کر چکی ہوں۔ اور حتی الوسع روزہ نماز کی پابند ہوں۔ رہتی رنڈی کی طرح ہوں، خدا چاہے مارے چاہے جلائے مجھ سے پردے میں گھٹ کے تو نہ بیٹھا جائے گا۔ مگر پردے والیوں کے لئے دل سے دعا گو ہوں۔ خدا اُن کا راج سہاگ قائم رکھے اور رہتی دنیا تک اُن کا پردہ رہے۔

اس موقع پر میں اپنی ہم پیشہ عورتوں کی طرف مخاطب ہو کے ایک نصیحت کرتی ہوں، وہ اپنے دل پر نقش کریں۔

اے بیوقوف رنڈی! کبھی اس بھلاوے میں نہ آنا کہ کوئی تجھ کو سچے دل سے چاہے گا۔ تیرا آشنا جو تجھ پر جان دیتا ہے چار دن کے بعد چلتا پھرتا نظر آئے گا وہ تجھ سے ہرگز نباہ نہیں کر سکتا اور نہ اس لائق ہے۔ سچی چاہت کا مزا اسی نیک بخت کا حق ہے جو ایک منہ دیکھ کے دوسرے کا منہ کبھی نہیں دیکھتی۔ تجھ جیسی بازاری شفتل کو یہ نعمت خدا نہیں دے سکتا۔

خیر میری تو جیسی گزرنا تھی گزر گئی۔ اب میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں۔ جتنے دن دنیا کی ہوا کھانا ہے، کھاتی ہوں۔ میں نے اپنے دل کو بہر طور سمجھا لیا ہے اور میری کل آرزوئیں پوری ہو چکیں۔ اب کسی کی تمنا نہیں رہی۔ اگرچہ یہ آرزو کمبخت وہ بلا ہے کہ مرتے دم تک دل سے نہیں نکلتی۔ مجھے اُمید ہے کہ میری سوانح عمری سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوگا۔ اب میں اپنی تقریر کو اس شعر پر ختم

کرتی ہوں ۔ اور سب سے امید وار دعا ہوں ۔ ؎

مرنے کے دن قریب ہیں شاید کہ اے حیات
تجھ سے طبیعت اپنی بہت سیر ہو گئی